E:\Bismillah\BESM81.jpg
not found.

تمہید

الحمد للّٰہ الذی جعلنا من المتمسکین بالقرآن العظیم وبنبیہ وصفیہ ونجیہ سیدنا وامامنا وامام الائمۃ الطاہرین ولعنۃ علٰی اعداء اللّٰہ واعدائہم اجمعین۔

حضرت سیدالشہداء حسینؑ بن علیؑ کا عظیم قیام بھی دیگر تاریخی وقائع وحوادث کے مانند تحریف وتغیر کی زد سے محفوظ نہیں ہے۔ خداوند متعال کی طرف سے نازل کردہ کتب تورات، انجیل، زبور، صحف ابراہیمؑ وموسیٰؑ بھی تحریف وترمیم لفظی ومعنوی سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ آج ان کتابوں کے کئی کئی نسخے موجود ہیں اور ہر ایک دوسرے سے مختلف ومتضاد ہے۔ جو نسخہ جس جامعہ کے پاس ہے اسی کو وہ اصلی مانتا ہے یہ اور بات ہے کہ وحدتِ قوم وملت کی خاطر وہ سب کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح فرمودات نبی کریمؐ خاتم الانبیاءؐ میں بھی خوب تحریفات ہوئی ہیں۔ خود آپؐ کی حیات میں بھی مفاد پرست عناصر آپؐ سے جھوٹے اور من گڑھت اقوال کو نسبت دیا کرتے تھے کبھی آپؐ کے فرمودات میں لفظی تحریف کر ڈالتے تو کبھی معانی کے بیان میں اختلاف کرتے، ہر کوئی اپنے زاویۂ نگاہ کے تحت تفسیر وتاویل کیا کرتا تھا چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات کے تاریخی خطبہ میں اپنے کلمات واقوال میں تحریف کے اس رواج پر نظر رکھنے کی طرف امت کو متوجہ اور متنبہ کیا اور شریعت کو باد سموم وخزاں سے محفوظ رکھنے کے لئے موثر نسخہ بیان فرمایا۔ مولا علیؑ نے نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۱۰ میں اس نسخہ کا ذکر فرمایا ہے۔ قرآن کریم کہ جسے تحریف سے محفوظ رکھنے کا خود خالق کلام نے وعدہ دیا ہے، لفظی تحریف سے محفوظ ہے اور رہے گا لیکن اس میں جو معنوی تحریفیں

ہوئی ہیں، آج امت اسلامی اس کے اعتراف سے نہ ہچکچاتی ہے اور نہ جھجکتی ہے بلکہ واضح انداز میں اس کی معترف ہے۔ آج ملت مسلمہ جن اختلافات میں مبتلا ہے وہ آیاتِ الٰہی کے غلط معانی لینے ہی کے سبب سے ہے۔ آیاتِ الٰہی کی غلط تفسیر امت کے گریبان میں وہ پھندا ہے جو اتر نہیں سکتا۔ آج امتِ اسلامی انتہائی شدت کے ساتھ اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے لیکن راہ میں جو رکاوٹ حائل ہے وہ شریعت کی مسلمہ روایات وآیات کی یہ تفاسیر ہی ہیں جنھیں مختلف مسالک نے مختلف انداز میں اپنایا ہوا ہے۔ یہ اختلافات بذاتِ خود ایک تحریف معنوی ہے۔

جب آسمانی کتابیں تحریف سے محفوظ نہ رہ سکیں، قرآن کریم کہ جس کی حفاظت کی ضمانت خود خدا نے دی ہے، وہ بھی تحریف معنوی کی زد میں آ گیا تو پھر قیام مقدس امام حسین ۔ اور واقعہ کربلا کیسے تحریف لفظی اور معنوی سے مصئون ومحفوظ رہ سکتے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ قیام کربلا سے متعلق تحریف کی باتیں سن کر بعض لوگوں کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ہنگامہ آرائی پر اتر آتے ہیں اور تحریفات کی نشاندہی کرنے والوں کو متہم اور ان پر سب وشتم کرنے لگتے ہیں۔ یہ جنونی کیفیت اس لئے نہیں ہوتی کہ واقعہ ان کے نظریہ کے خلاف ہوتا ہے اور نہ اس کے لئے کہ وہ دوسروں کی نسبت امام حسین ۔ سے زیادہ محبت کرتے ہیں یا امامؑ کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں بلکہ یہ جنونی حالت ان پر اس لئے طاری ہو جاتی ہے کہ وہ خود خالقِ تحریف یا موافقِ تحریف ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے اس مذموم عمل سے پردہ ہٹنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ تحریفات خدا اور قیامت پر یقین رکھنے والے اور حسینی مشن پر اعتقاد رکھنے والے نہیں کر سکتے۔

ہم یہاں قارئین کی خدمت میں قیام مقدس ابا عبداللہ الحسین ۔ کو لاحق تحریفات کی نشاندہی کریں گے، ان تحریفات سے بچنے کا علاج ومعالجہ بھی تجویز کریں گے اور اس کے ساتھ ساتھ عزاداری امام حسین ۔ کو صانعین اور خالقینِ تحریفات کے چنگل سے نجات دلانے کی دعوت بھی دیں گے۔ اس سلسلے میں بے دلیل لوگوں کی سیرت کی پیروی کے بجائے ہم ائمہ اطہار ؑ کی سیرت کی پیروی کریں گے کہ جنھوں نے ہمیشہ دلیل وبرہان اور عقل ومنطق کو اہم جانا ہے۔ آیئے! دیکھتے ہیں کہ امام حسین ۔ کے قیام میں کہاں کہاں تحریفِ لفظی ہوئی

ہے اور کہاں کہاں تحریفِ معنوی‘ تحریف کی کتنی اقسام ہیں اور اس واقعہ کو کس قسم کی تحریفات کا سامنا ہوا ہے:

۱۔ امام حسینؑ ‘ جوانانِ بنوہاشم‘ اصحاب و یارانِ امام حسینؑ ‘ اہل بیت اطہارؑ اور اسیرانِ آلِ محمدؐ سے منسوب بہت سے ایسے کلمات ہیں جو یا تو تحریف شدہ ہیں یا پھر ان سے غلط منسوب ہیں۔ ایسے کلمات سینکڑوں میں نہیں‘ ہزاروں میں کتب مقاتل اور تقریروں میں ملیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کلمات امام حسینؑ‘ حضرت زینبؑ‘ امام زین العابدینؑ‘ حضرت عباسؑ‘ حضرت علی اکبرؑ...... جیسی برگزیدہ ہستیوں کی زبان سے جاری نہ ہوئے ہوں کیا انہیں ان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟ آیا رونے اور رُلانے کیلئے ان جھوٹے کلمات کو ان کی طرف نسبت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے؟ کیا روزمرہ کی زندگی میں کسی عام انسان سے، کسی دانشور سے، کسی فقیہ سے کوئی بات اس کو بتائے بغیر منسوب کرنا صحیح ہے؟ اگر نہیں تو‘ پھر خدا کی ان برگزیدہ ہستیوں کیلئے اسی غلط مراعات کے جائز ہونے کا قائل ہونا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟۔

۲۔ کربلا میں امام حسینؑ کے رکاب میں شہید ہونے والے بنوہاشم کے جوانوں کی کم سے کم تعداد اور زیادہ سے زیادہ تعداد کا کتب میں ذکر ہوا ہے۔ کم تعداد پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ جہاں زیادہ تعداد کا ذکر ہوا ہے وہاں اختلاف ہے۔ سب سے زیادہ تعداد کا ذکر ہوا ہے وہاں اختلاف ہے۔ سب سے زیادہ تعداد مرحوم سید محسن امین نے اعیان الشیعہ جلد ا۔ ص ۔۶۱۰ پر نقل کی ہے۔ آپؒ نے بنوہاشم کے شہداء کی تعداد ۳۰ اور انصار کی تعداد ۱۰۶ بتائی ہے۔

حکم شرعی ہے اور عقلی تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان واقعات اور حوادث کے بیان میں حتی الامکان احتیاط سے کام لے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جس پر سب کا اتفاق ہو اس کا ذکر کیا جائے۔ مثلاً اٹھارہ (۱۸) جوانانِ بنوہاشم کا ذکر تمام کتابوں میں ہے۔ اگر ہم اس سے زائد کو چونکہ بزرگ علماء نے ذکر کیا ہے‘ بیان کریں تو یہ خلاف احتیاط ہوگا۔ انہی خلاف احتیاط باتوں کے ذکر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے قدم یہاں نہیں رکے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھے مثلاً جناب حُر کے تین بیٹوں کا ذکر تو ان فہرستوں میں بھی نہیں‘ جہاں زیادہ سے زیادہ شہدائے کربلا کا ذکر ہے۔ اسی طرح اسرائے آلِ محمدؐ کی واضح تعداد کا ذکر کسی

معتبر و مستند مقاتل اور تاریخ میں نہیں آیا ہے۔ تمام مقاتل اور تاریخ میں جو نام آئے ہیں وہ یہ ہیں: امام سجادؑ‘ امام محمد باقرؑ‘ حضرت زینبؑ‘ ام کلثومؑ‘ رباب‘ سکینہؑ اور فاطمہ صغریٰ۔ ان کے علاوہ کسی اور کے نام کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اسکے باوجود جناب فاطمہ صغریٰ سے متعلق مدینہ میں موجودگی کی کہانیاں گھڑی گئی ہیں۔ اسی طرح اسرائے اہل بیتؑ سے متعلق اور بھی کئی واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن کی صحت پر کوئی دلیل نہیں ملتی ہے۔ ایسے واقعات صرف رونے رلانے کے لئے گھڑے گئے ہیں۔ عقل وہاں کام کرتی ہے جہاں واقعہ ثابت ہو لیکن کوئی واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے یا نہیں یا کوئی بات فلاں نے کہی ہے یا نہیں‘ اس میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

۳۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ آیات قرآنی اور روایات مسلمہ رسول اللہؐ کے تحریف معنوی کی زد میں آنے کی وجہ سے فرقے اور مذاہب بنے ہیں۔ چودہ صدی پہلے کے واقعات کا ذکر کیا کریں‘ گزشتہ صدی کے عظیم رہنما امام خمینیؒ کی مثال سامنے کی ہے۔ کلمات امام خمینیؒ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی آڈیو اور ویڈیو دونوں ریکارڈنگ موجود ہیں۔ عرصہ نہیں گزرا ہے لیکن اس کے باوجود محافظان فکر امام اور اصلاح طلب نامی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ دونوں اپنی دانست کے مطابق کلمات امام کی تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ اس ناگزیر حقیقت اور رسوم و باد و باؤ ان کی زد سے امام حسینؑ کا قیام بھی محفوظ نہیں ہے۔ قیام کربلا کے بارے میں بھی تحریفات معنوی کا سلسلہ آئے دن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ بعض نے قیام امام حسینؑ کو جبر تاریخ قرار دیا‘ بعض نے اسے خاندانی کشمکش کا نتیجہ سمجھا‘ بعض نے اسکی غیبی تفسیر کی اور اسے مشیت الٰہی قرار دیا‘ بعض نے اسے ضمیر انسانی کی بیداری کی تحریک جانا اور بعض نے اسے حصول خلافت و حکومت کی جدوجہد سے تعبیر کیا۔ یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے سے متصادم و متضاد اور متناقض ہیں۔ ممکن ہے ایک دو تفسیروں میں نقطۂ اتحاد بھی ہو ورنہ بیشتر میں نقطۂ اختلاف ہے۔

۴۔ قدیم زمانے سے آج تک مجالس عزاء میں خطباء و ذاکرین معجزات و کرامات اور خواب نقل کرتے آئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جس واقعہ کو امام حسینؑ اپنی تمام تر کوششوں کے ذریعہ کھلے میدان میں اور روز روشن

میں (حتیٰ کہ دشمن کے نویں محرم کے عصر کے جنگی ہجوم کو صبح تک کیلئے ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا تا کہ یہ واقعہ روزِ روشن میں ہو نہ کہ تاریک رات میں) وجود میں لائے تھے تا کہ لوگ اس میں تحریف اور اسکی غلط توضیح و تفسیر نہ کرسکیں ہم اس کو عالم بیداری سے نکال کر عالم خواب میں لے گئے۔ ہم نہ معجزات و کرامات کے منکر ہیں اور نہ خواب کے۔ ہمارا کہنا فقط یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ ہم ہر کس و ناکس کے خواب کو ماخذ و مصدر قیام امام حسینؑ قرار دیں۔ بہت سے خواب اور بہت سے معجزات و کرامات تحریفات کا شکار ہیں۔ امام حسینؑ ایک ہیں، شیعہ بھی ایک اور عزاداری بھی ایک، اس کے باوجود معجزات و کرامات میں علاقائی تقسیم نظر آتی ہے، ایران میں زیادہ تر امام زمانؑ خواب میں نظر آتے ہیں اور وہاں ہر آئے دن لوگ آپؑ سے نسبت دے کر خواب بیان کرتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں ہندو پاک میں خوابوں میں پنجہ، علم، تابوت اور ذوالجناح دکھائی دیتے ہیں گویا علاقائی بنیاد پر ہر علاقے میں دوسرے علاقے سے مختلف معجزات تقسیم ہو رہے ہیں۔

۵۔ تحریف کے ایک معنی کسی چیز کو کنارے پر لگانے کے ہیں۔ تحریف مادۂ 'حرف' سے لیا گیا ہے۔ حرف کلام کے کنارے پر ہوتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ لوگ خدا کی بندگی کنارے کے زاویے سے کرتے ہیں، یعنی متن سے نکال کر کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کی عزاداری بھی اس وقت شدت تحریف کی لپیٹ میں ہے۔ کیونکہ امام حسینؑ کے کلمات و خطبات، حضرت زینبؑ کے خطبات، جناب فاطمہ صغریٰ کے خطبات اور ان خطبات کی تفاسیر، سب کنارے لگا دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ غیر مربوط موضوعات نے لے لی ہے۔ مثلاً کوئی گمنام صوفی کی بات کرتا ہے تو کوئی مغرب کی بات، کوئی سائنس اور ٹیکنالوجی کی قصیدہ گوئی کرتا ہے تو کوئی قرآن کریم کو چھوڑ کر باقی کتب آسمانی کو موضوع بناتا ہے۔ غرض یہ کہ عزاداری امام حسینؑ میں حسینؑ موضوع نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ مصائب میں بھی حسینؑ کی اصل مصیبت کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ فرضی عورتوں اور بچوں کے جعل کردہ مصائب ذکر ہوتے ہیں۔ یہ ہیں انحرافات۔ اب اس سے بچنے اور صحیح کو غلط سے جانچنے کا کیا طریقہ کار ہے، ایک بنیادی سوال ہے۔

بندش تحقیق:

قیام مقدس امام حسینؑ میں سب سے زیادہ خطرناک تحریف جو پیش آئی وہ اس سلسلہ میں تحقیق پر بندش ہے تحریفات چاہے لفظی ہوں یا معنوی، کم ہوں یا زیادہ، جب تک تحقیق و اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے گا، حقیقت انسانوں کے لئے واضح ہوتی رہے گی اور عناد رکھنے والوں اور حق پوشی کرنے والوں کے مقاصد پورے نہیں ہونگے۔ لیکن اگر اجتہاد اور تحقیق کا دروازہ بند ہو تو حق کے متلاشیوں حقیقتیں منکشف نہیں ہوں گی پر اور عناد رکھنے والوں اور حقیقت چھپانے والوں کے اہداف پورے ہوتے رہیں گے۔ یہی بندش قیام امام حسینؑ سے متعلق تحقیق میں بھی واقع ہوئی ہے جو بندش قیام حسینی کو اس کے اصلی تظاہر میں سمجھنے میں آجکل ہے، ایسی اس سے قبل کبھی نہیں تھی۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ اس خطہ میں تحریف کا اعتراف کرنے والے بھی تحقیق و جستجو کرنے کے منکر ہیں۔

جس طرح دنیا کے روزمرہ کے امور میں مختلف تحریف آور چیزیں ہیں مثلاً دھاندلی ہے، ملاوٹ ہے، نقصان دہ اشیاء ہیں، ضیان آور چیزیں ہیں، گمراہ کن لٹریچر ہے، غلط پروپیگنڈے کی مشینریاں ہیں، فناپذیر آلات ہیں یہ اور ان جیسی دوسری چیزوں کے نقصانات سے محفوظ رہنے کیلئے انسانی سوچ ہمیشہ متوجہ رہی ہے دنیا کے دانشور اور مفکرین قدیم زمانے سے لے کر آج تک، انسانیت کو ایسی چیزوں کے مہلک اثرات سے بچانے کیلئے مختلف طریقے وضع کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح امام حسین -کے قیام میں بھی غلط اور صحیح کے جانچنے کے لئے اصول و ضوابط موجود ہیں:

۱۔ قیام امام حسینؑ کا ہدف، سمت اور رخ اسلام تھا۔ امامؑ عالی مقام نے اسلام کے لئے قیام کیا تھا لہٰذا اسلام کے مسلمہ اصولوں ہی کو قیام حسینی کی کسوٹی ہونا چاہئے۔ ہر وہ چیز جو اس واقعہ میں اسلام کے مسلمہ اصولوں سے متصادم و متضاد نظر آئے اسے نقل کرنا بھی غلط ہے اور اس کی توضیح و تشریح کرنا بھی۔ غرض قیام حسینی میں صحیح او رغلط کی ایک پہچان، خود اسلام ہے۔

۲۔ پیغمبر اسلام ﷺ سے مروی حدیث کے تحت حسینؑ آیات قرآن کا مجسم عملی ہیں۔ یعنی حسینؑ کا دائرہ

گفتار و کردار چار دیواری قرآن کے اندر ہے لہٰذا ہر وہ کلمہ جو آپؑ سے منسوب ہو اور ہر وہ فعل جسے آپؑ سے نسبت دی گئی ہو اگر آیاتِ قرآنی سے متصادم ہو تو وہ غلط اور جعلی ہوگا۔

۳۔ دنیا کی ہر تاریخ افراط و تفریط کی زد میں رہتی ہے جس کی وجہ سے اسکی ہر بات کو نہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ رد۔ تاریخ کے سقم و صحت کی ایک کسوٹی خود تاریخ ہے۔ جس بات کو سب نے ذکر کیا ہو اور جو سب کے نزدیک مسلمہ ہو وہ صحیح مانی جائے گی اور جس بات کا کتبِ قدیم میں ذکر نہ ہو یا جو بات دیگر تاریخی اسناد سے متصادم ہو وہ غلط سمجھی جائے گی۔

۴۔ علمائے سیر و تاریخ کی لکھی ہوئی وہ مقاتل کہ جن پر اُن بزرگ علماء و فقہاء نے مہرِ صحت ثبت کی ہو جنھیں امین قرار دیا گیا ہے' جیسے شیخ مفیدؒ سید بن طاؤسؒ سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ شیخ صدوقؒ وغیرہ ہیں' اعتماد کرنا صحیح ہوگا۔ یہ ذوات گزاف گو اور باطل ساز نہیں تھیں۔

۵۔ دنیا میں ہر شعبہ کا ایک ماہر ہوتا ہے۔ جہاں اختلافِ نظر ہوتا ہے' جہاں تفسیر و توجیہ میں آراء مختلف ہوتی ہیں' وہاں ماہرین کی طرف رجوع کرنا سنت جاریہ بھی ہے اور عقلی تقاضا بھی۔ اب بتلایئے قیامِ اباعبداللہؑ کی تفسیر کرنے کے لئے کس کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیا اسکے لئے کوئی سیاستدان' کوئی بین الاقوامی تعلقات کا ماہر' کوئی ماہرِ نفسیات' کوئی ریٹائرڈ افسر یا یونیورسٹی کا پروفیسر زیادہ سزاوار ہوگا یا مفسرینِ قرآن' محققینِ علمِ حدیث اور محققینِ تاریخِ اسلام کی طرف کرنا زیادہ مناسب ہوگا؟ قیامِ کربلا کی تفسیر کے لئے شیخ مفیدؒ' مرتضیٰ علم الہدیٰ' کاشف الغطاءؒ' امام خمینیؒ' آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ' حضرت آیت اللہ آقائے خامنہ ای' آیت اللہ مہدی شمس الدین' آیت اللہ محمد حسین فضل اللہ جیسی شخصیتوں کی طرف برگشت ہونی چاہیے یا دیگر شعبہ جات کے ماہرین کی طرف؟۔

۶۔ تحریفات کی شناخت کیلئے ایک کسوٹی خود سیرتِ امام حسین -ہے' آپؑ جب کوئی جملہ حضرت زینب = سے یا حضرت عباسؑ سے یا حضرت علی اکبرؑ سے منسوب سنیں یا پڑھیں اور وہ جملہ سیرتِ حضرت امام حسین -سے متصادم پائیں تو سمجھ لیجئے کہ غلط ہے' تحریف ہے اور اس قیام کو اس کے اصل ہدف سے دور کرنے کی

مذموم کوشش ہے۔ مثال کے طور پر امام حسین -کا یہ جملہ معروف و مشہور ہے: "ھیھات منا الذلة"۔ "ذلت ہم سے دور ہے" آپؑ کا یہ فرمان آپؑ کی شناخت ہے اب اگر کوئی شخص کوئی ایسا جملہ خود امام حسینؑ سے یا آپؑ کے خاندان اور انصار و اعوان میں سے کسی سے منسوب کر کے کہے کہ جس سے ذلت کا پہلو نکلتا ہو تو وہ جھوٹ ہے۔ ہم یہاں پر کچھ ایسی مثالیں نقل کر رہے ہیں:

(۶۔۱) کہا جاتا ہے کہ عمر سعد سے امام حسین -نے فرمایا: "مجھے یا تو چھوڑ دو یا پھر خود یزید کے پاس لے چلو' میں اس کے ہاتھوں پر بیعت کروں گا"۔ ایسے کسی جملہ کو امامؑ سے نسبت دینا خود امامؑ کے مکرر فرمان کے خلاف ہے: "ھیھات منا الذلة"۔ ذلت امامؑ سے دور ہے ایسا کوئی جملہ امامؑ سے منسوب کرنا امامؑ کے حضور میں جسارت ہے۔

(۶۔۲) بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسین -نے جنگ کے آخری وقت میں جب آپؑ پر تشنگی غالب ہوئی تو دبی آواز میں فرمایا: "فرزند مصطفیٰؐ پر منت رکھو اور ایک قطرہ پانی پلا دو"۔ حسینؑ جو ذلت کو "ھیھات منا الذلة" کہہ کر اپنے سے دور فرماتے ہیں' اس کے بعد اس طرح کی بات نہیں کر سکتے۔ اسی طرح وقتِ رخصت حضرت زینب = سے امامؑ نے فرمایا: "بہن آپ سے کوئی ایسا جملہ صادر یا کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہونا چاہیے جو ہماری عزت کے خلاف ہو' کہیں پر بھی ایسے کرب و اضطراب کا مظاہرہ نہ کیجئے گا جس سے آپ کا صبر داؤ پر لگ جائے"۔

لہٰذا حضرت زینب = کے بارے میں بھی اگر کوئی کسی ایسے فعل یا قول کو نقل کرے کہ جس سے ذلت کا پہلو سامنے آتا ہو تو وہ جھوٹ ہے۔

(۶۔۳) اسی طرح کی ایک اور بات جس کا ذکر ہم نے کتاب میں بھی کیا ہے' طفلانِ مسلمؑ سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حارث ملعون نے ان بچوں کو قتل کرنا چاہا تو ان دونوں نے حارث سے کہا کہ "ہمارے بالوں کو منڈوا کر اور ہمیں غلام بنا کر بیچ دو اور اس آمدنی سے تم فائدہ اٹھا لو"۔ اگر ہم اس خاندان کے افعال و کردار اور اقوال پر دقت کریں اور خود امام حسین -کے کلمہ "ھیھات منا الذلة" پر غور کریں تو یہ

سمجھنا قطعاً مشکل نہیں ہے کہ یہ قصہ جعلی اور من گھڑت ہے اور اس سے اہل بیتؑ کی تذلیل مقصود ہے۔ یہ لوگ ایک طرف ان دونوں بچوں کو مسلم بن عقیلؑ جیسے شجاع و بلند حوصلہ شخصیت کا فرزند بتلاتے ہیں کہ جنھوں نے ابن زیاد کے مقابل انتہائی جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور دوسری طرف فرزندانِ مسلم سے ایسا ذلت آمیز جملہ منسوب کرتے ہیں۔ اگر فرض کریں ایسی کوئی بات ان دونوں نے کی تھی تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ یہ راہِ حسینی سے بھٹک گئے تھے اور پھر اس کے بعد یہ اس بات کے لائق و سزاوار نہیں رہتے کہ ہم ان کے نام پر عشرۂ محرم میں ایک دن مخصوص کریں۔

قیام کربلا ایک مسلمہ حقیقت ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہ مسلمات اوّلیہ میں سے بالکل ویسے ہی ہے، جیسے اصول عقائد میں توحید نبوت اور معاد ہیں۔ باصطلاح فقہ معقولات میں اجتماع ضدین محال ہے یا اجتماع نقیضین ممکن نہیں۔ اسی طرح سے یہ سوال کہ قیام امام حسین- وقوع پذیر ہوا ہے یا نہیں؟ اس پر بحث و گفتگو کرنا ایک مسلمہ غلط بات ہے سانحہ کربلا واقع ہوا ہے یا نہیں، اس میں اختلاف کرنے یا تحقیق کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی بھی محقق اس مسئلہ کو نہیں اٹھائے گا۔ البتہ تحقیق کرنے والوں کو اس کی تفصیلات کے بارے میں تحقیق اور جستجو کرنے کا حق ضرور ہے۔ آیا اس واقعہ کے مضمرات میں تحریف ہوئی ہے یا نہیں، اس کو جانچنا اور سمجھنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اس بات سے تحقیق کرنے والے کے عقائد کے خراب ہونے یا اسکا عزاداری کا معتقد نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں بنتی۔ اس کے برعکس اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہاں پر تحقیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس واقعہ میں تحریف ہی نہیں ہوئی ہے، اس میں کوئی کمی بیشی ہوئی ہی نہیں ہے، کوئی خلل واقع ہوا ہی نہیں ہے تو اس صورت میں اس بات کے کہنے والے کو حساب دینے میں جھجک محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ جو شخص سالم ہو، بے نقص و بے عیب ہو اسے دوسروں کا سامنا کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوا کرتی ہے۔

اگر واقعہ کربلا میں تحریف ہوئی ہے تو پھر تحقیق کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگر کوئی کہے کہ تحریف ہوئی ہے لیکن پھر بھی تحقیق کی گنجائش نہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ شخص خائن ہے۔ یہ شخص عزاداری کا دشمن ہے۔ یہ اس شخص کی مانند

ہے جو ایک مریض کو علاج کروانے سے روکتا ہے۔ مریض کو سالم و صحت مند دکھاتا ہے، کہتا ہے کہ آپ ٹھیک ٹھاک ہیں، علاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یا کسی گھر کی بنیاد خراب ہے، گھر گرنے والا ہے، لیکن کہتا ہے کہ نہیں جناب گھر تو ٹھیک ٹھاک ہے اس طرح کی تحریف ایک خطرناک تحریف ہے اور اس خطہ میں عزاداریٔ قیام مقدس امام حسین- کو یہی مرض لاحق ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں مواد جمع کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ تمام ائمہ طاہرینؑ نے تو اپنے اوپر گزرنے والی مصیبتوں کو بھی مصیبت حسینؑ میں ضم کیا ہے اور سب کی توجہ کو امام حسین- پر گزرنے والی مصیبتوں کی طرف مرکوز کیا ہے تا کہ مصیبتِ حسینؑ کی عظمت و بزرگی کے سائے میں عظمتِ اسلامی، شریعتِ اسلامی اور امت اسلامی کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ لیکن بدقسمتی سے بعض لوگوں نے مصائبِ امام حسین- کو اپنے دنیوی، اجتماعی اور ذاتی مقاصد پر قربان کر دیا ہے۔ مصائب امام حسین- کو اس طرح سے پسِ پشت ڈالا ہے کو یا اپنی مجالس کو رونق بخشنے اور گریہ و فغان کی صدا بلند کرنے کی خاطر واقعہ کربلا سے آپ کی اصل مصیبت کو ہی منہا کر دیا ہے۔ اس کی جگہ جعلی اور موہومی قسم کی مصیبتیں کہ جن کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہے، اس واقعہ میں شامل کر ڈالی ہیں اور انہی مصائب کو عزاداری کا مرکز و محور بنا ڈالا ہے۔ اس کتاب میں جھوٹے اور من گھڑت مصائب انتخاب کرنے والوں کو اس مذموم عمل سے روکنے اور ایام عزاء میں خود حسینؑ مظلوم کو مرکز و محور قرار دینے کی تشویق دلانے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ عالمین کی توجہ کو ان عظیم مصائب کی طرف مبذول کیا جا سکے جو واقعاً امام حسینؑ اور ان کی آلؑ پر گزرے تھے۔

زیرِ نظر کتاب امام حسین- کے بارے میں کوئی نئی تحقیقی کاوش نہیں ہے۔ اس کو پیش کرنے کا مقصد عقیدتمندوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا یا مجروح کرنا بھی نہیں ہے اور نہ ہی نعوذ باللہ یہ علماء و دانشوروں کے لئے بطور چیلنج پیش کی جا رہی ہے بلکہ ہم اسے حسرت و یاس اور افسوس کے ساتھ بطور استفسار و سوال پیش کر رہے ہیں۔

دنیا کی سعادتمند قومیں گزر جانے والے زمانہ کی نابغۂ روزگار ہستیوں اور حُریت و آزادی کی علمبردار شخصیتوں کے تاریخی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ ان کے آثار و باقیات پر تحقیق کرنے اور معلومات فراہم

کرنے کے لئے ادارے وجود میں لائے جاتے ہیں اور اس پر کثیر سرمایہ خرچ کیا جاتا ہے چنانچہ ہمارے ملک کے بانی وعظیم قائد محمد علی جناحؒ کے کلمات وخدمات کو حرف بہ حرف ضبط وثبت کرنے اور آرائش وزیبائش کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ادارے قائم ہیں۔ اسی طرح نظریہ پاکستان کے مفکر ومصور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار و نظریات اور اشعار واقوال کو ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کرلیا گیا ہے' ان کے نام سے کالج و یونیورسٹیاں قائم ہیں اور تحقیقی ادارے موجود ہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں بانیٔ انقلاب اسلامی حضرت امام خمینیؒ کے آثار واقوال پر تحقیق کرنے کیلئے ہزاروں انسان مصروف عمل ہیں اور ایک وسیع ادارہ بنام ''آثار نشر امام خمینیؒ'' وجود میں آیا ہے۔ اسی طرح عوامی جمہوریہ چین میں ''ماوزے تنگ'' کے آثار پر کام ہورہا ہے لیکن ہائے افسوس! تاریخ میں حسینؑ جیسی مظلوم ہستی نہیں دیکھی کہ جسکے اسلام ومسلمین پر اتنے احسانات ہیں کہ نہ شمار کئے جاسکتے ہیں اور نہ کوئی ان کی برابری کرسکتا ہے' لیکن اس کے باوجود قیام امام حسینؑ پر قلم اُٹھانا' تحقیق کرنا اور اس میں شامل جھوٹ اور دروغ گوئی کو نکال پھینکنے کیلئے اقدام کرنا جرم وجنایت ٹھہرایا گیا ہے۔ اس مظلومیت پر دل خون کے آنسو روتا ہے اور ہاتھ سامنے دکھائی دینے والے خطرات کو دیکھ کر لرزتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ہمت کر کے اس کتاب کو مختلف عناوین کے ساتھ' قیام امام حسینؑ پر تحقیق کے دروازے پر لگائے گئے قفل کو کھولنے کیلئے' اہل انصاف کی خدمت میں' ایک درخواست نامہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے یہ معروضات کوئی پتھر پر لکیر کے مانند نہیں ہیں۔ تحقیق کا دروازہ سب کیلئے کھلا ہے، یوں بھی انسانی فکر وتخیل ہمیشہ رشد ونمو کے مدارج طے کرتی رہتی ہے۔ اگر ہمارے بیان میں کہیں کوئی اشتباہ رہ گیا ہو یا کہیں کوئی کمی نظر آئے تو ہم قارئین سے گزارش کرینگے کہ ہمیں اس سے ضرور مطلع کریں' تاکہ آئندہ طباعت میں اس کی تلافی کی جاسکے۔

قیام مقدس امام حسینؑ کو انحرافات سے پاک کرنے اور متروک حقائق کو سامنے لانے کی ہماری اس کوشش میں مخالفین سے زیادہ دوستوں کے شیریں مشورے ہمارے لئے زہر قاتل ثابت ہوئے۔ ہم نے اس مشن میں دوسروں کی طرح سے کسی سے تعاون کی درخواست نہ کی ہے اور نہ کریں گے۔ جس دنیا کو حسینؑ نے چھوڑا' ہم کیوں اس سے لو لگائیں۔ البتہ جس تعاون کی ضرورت انبیاء ومرسلین' ائمہ طاہرین' فقہاء ومجتہدین اور صلحاء

مروجین کو تھی' وہ فکری تعاون تھا اور اس تعاون کی آج ہم کو بھی ہمہ وقت ضرورت ہے تاکہ اس فکر کا قارئین خود بغور مطالعہ کریں اور اس کے بعد اسے دوسرے برادران تک انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ' دوستانہ طریقے سے' محبت آمیز لہجے میں پہنچائیں۔ لیکن ہماری یہ توقعات روز افزوں کم ہوتی جارہی ہیں۔ ایسے حالات میں ایک انسان کا دل شکستہ ہونا اور ہمت ہار جانا طبعی اور حتمی نتیجہ ہے۔ مگر ایسی صورت حال تو اس کیلئے ہے جو اپنی زحمتوں کا صلہ اسی دنیا میں لینا چاہتا ہو۔ اگر وہ اس کا صلہ اُس عالم میں لینے کا عہد کرلے تو ایسے لوگوں کیلئے مولا امیر المومنینؑ نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگوں کی ہمکاری میں قلت اور مخالفین کی کثرت پھر اس کی حوصلہ شکنی کا سبب نہیں بنتی۔ یا جیسا کہ ائمہ کی شان میں بیان ہوا ہے کہ کسی کی مذمت اور کسی کی خوشامد ان پر اثر انداز نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہ جملے ہمارے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور اس دنیا سے کہیں بڑی دنیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معصومین ؑ کے یہ فقرے سد سکندری کی طرح ہماری پشت پناہی کرتے ہیں اور اسی امید کے سہارے ہم اس بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوئے ہیں۔ ہم اپنے ان کاوشوں سے نہ دنیا بنا رہے ہیں' نہ مقام اور شہرت۔ ہماری اس کوشش کو نہ تو کوئی تائید وسہارا ملا ہے اور نہ کسی کی حمایت کا آسرا ہے۔ ایسے میں دنیا بنے گی تو کیسے؟ ہم خدا سے وہی دعا کرتے ہیں جو مولا ابا عبداللہؑ نے میدان کربلا میں اپنے آخری لمحات میں کی تھی:

''خداوندا! اس وقت اگر میرے لئے تو نے اپنی نصرت روک دی ہے تو اسے آخرت کیلئے ذخیرہ بنا دے''۔

ہم بھی پروردگار کے حضور اپنی اس سعی کو آخرت میں اپنے لئے ذریعہ نجات بنانے کی درخواست کرتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر مولا ابا عبداللہؑ کا وہ جملہ بھی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

''پروردگارا! ہر مصیبت میرے لئے آسان ہے کیونکہ تو دیکھ رہا ہے''۔

ہم بھی اپنے خدا سے یہی عرض کرتے ہیں کہ پروردگارا اگر ہماری یہ معمولی سی کاوش مولا حسینؑ کی درگاہ میں اور تیرے حضور صحیح ہے تو پھر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور حوصلہ شکن انسان کی حوصلہ شکنی سے ہم مایوس نہیں ہوں گے۔

ہم اس سلسلے میں اُن برادران کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے اس کتاب کی جمع بندی اور ترتیب وتزئین میں

ہماری معاونت کی ۔یہ کتاب ہماری نہیں بلکہ انہی برادران کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، ہمارے برادر محترم محمد نواز فدا علی میرے عزیز بھتیجے فاضل ارجمند سید محمد سعید موسوی جناب رسالت حسین کوثر صاحب جناب ڈاکٹر حسین کنانی صاحب اور جناب حسنین حیدر عابدی صاحب کی طویل زحمتوں کے نتیجہ میں یہ کتاب منظر عام پر آ سکی ہے۔

رب غفور کریم کے حضور اس کے اسمائے حسنٰی و اسمائے وجودی کا واسطہ دیتا ہوں محمدؐ و آل محمدؑ حسینؑ اور ان کے انصار و اعوان کا واسطہ دے کر خداوندا تجھ سے یہ دعا نہیں کرتا ہوں کہ مجھے طول عمر عطا کر بلکہ یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر تو زندگی دے تو مجھے ان توفیقات سے محروم نہ فرما۔میں تجھ سے اس مہم میں شرح صدر اور بلند ہمتی کا طلبگار ہوں خلق سے مایوس اور تیری ذات سے اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے ہوں حسینؑ و عزیزان حسینؑ اور جدِ حسینؑ کی شفاعت مجھے نصیب فرما۔اگر میری یہ قلیل سی خدمت لائق قبولیت ہے تو میرے والدین محترم اور تمام دوسرے برادران جنھوں نے اس سلسلے میں میری معاونت کی ہے اُن کے والدین کی ارواح کو ثواب پہنچے۔

شہدائے اسلام اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعیان کی پاک ارواح کی بلندئ درجات کیلئے دعا گو ہوں۔

وآخر دعوانا عنِ الحمدللہ رب العالمین

سید علی شرف الدین موسوی

۱۷ ربیع الاوّل میلادِ مسعود حضرت ختمی مرتبت منجی بشریت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۴۲۱ھ

ایسی تالیف کی ضرورت...؟

انسان کا اپنے قول وفعل کی تائید وتحسین چاہنا اور اپنی فکر کے مخالفین سے اختلاف کرنا ایک فطری عمل ہے۔ اگر اختلاف کرنے کا یہ حق چھین لیا جائے تو معاشرہ پر جمود وکود طاری ہو جائے گا۔

قرآن وسنت کی عطا کردہ آزادیٔ بیان کے علاوہ الحمدللہ ہمارے وطن عزیز کے آئین میں ہر شہری کو بیان کی آزادی حاصل ہے۔ بعض عناصر نے اس آزادی سے سوءِ استفادہ کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک کے دین وآئین کے خلاف اور خود وطن عزیز کے خلاف جو چاہو بولو آزادی ہے سچ پوچھیں تو اس حد تک آزادی بھی کوئی مستحسن عمل نہیں ہے۔

ایسے ماحول میں کہ جہاں تحریر وتقریر کی اس حد تک آزادی ہو اگر کوئی مذہب میں موجود خلل وخامیوں کی مسلمہ مصادر وماخذ کے ساتھ نشاندہی کرے اور پیار ومحبت سے افہام وتفہیم اور بحث وتمحیص کے دروازے پر دستک دے تو اس پر ہر طرف سے دباؤ ڈالنا، بندشیں عائد کرنا اور اسے موردِ عتاب ٹھہرانا انصاف، مروت اور عدالت کے خلاف ہی سمجھا جائے گا۔ کچھ ایسا ہی رویہ، احباب کا ہماری کتابوں کے سلسلے میں بھی ہے جو ایک عرصہ سے اس پر نقد وانتقاد کر رہے ہیں۔ بعض احباب کا تو یہ خیال ہے کہ اس سلسلہ کو ہی بند کر دینا چاہیے۔ اپنے اس خیال کے حق میں وہ مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں۔ ہم اس مقام پر ان تجاویز او رانتقاد کے کچھ نمونے اور اس سلسلہ میں اپنا نقطۂ نظر، قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

١۔ یہ احباب کہتے ہیں کہ ایسی کتابیں شائع کرنے سے قوم میں انتشار پیدا ہوگا۔ موجودہ حالات میں قوم اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جو باتیں ان کتابوں میں پیش کی جارہی ہیں اگرچہ کہ صحیح ہیں لیکن کیا ان باتوں کو منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ اگر نہ لایا جائے تو کیا نقصان ہوگا؟۔

ان برادران کی خدمت میں ہم بھی وہی عرض کرتے ہیں جو وہ خود فرماتے ہیں یعنی جب یہ باتیں حقیقت پر مبنی ہیں تو ان کو سامنے لانے سے کیا نقصان ہوگا۔ آیا اس سے دین ومذہب کو کوئی ضرر پہنچے گا؟ اگر ایسا ہے تو

یقیناً نہیں لانا چاہیے۔

اگر کچھ ایسی باتیں عوام میں رائج ہوں جن کی خوب پذیرائی ہو رہی ہو وہ غلط بھی ہوں اور ان سے مال ووقت کا زیاں بھی ہو رہا ہو تو کیا اس کا جاری رہنا نقصان دہ نہیں ہوگا؟

جو چیز مذہب میں نہ ہو اُسے مذہب بنا کر پیش کرنا اُسے رواج دینا اور اسے نقد وانتقاد سے بالا اور مقدس تصور کرنا، کیا یہ طرز عمل نقصان دہ نہیں ہے؟ کیا آئندہ آنے والی نسلیں اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتیں کہ مذہب ایک افسانہ ہے جیسا کہ الحادی تنظیمیں انہی باتوں کو بنیاد بنا کر مذہب کو تنقید کا نشانہ بناتی بھی ہیں؟

معاشرے میں رائج سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور ثقافتی نظاموں سے فائدہ اٹھانے والے افراد، خود کو ان نظاموں کا محافظ و پاسدار کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر اس اقدام کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں جس سے ان نظاموں کے زوال پذیر ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے اقدامات کرنے والوں کو بدنام کرنے کے لئے ان پر اتہام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ قوم میں انتشار وافتراق پھیلا رہے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری تہمتیں لگا کر وہ مصلحین کے چہروں کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

یہ طرز عمل کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ قدیم زمانے سے ہی ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ امام حسین ؑ کو بھی اپنے قیام کے دوران اسی قسم کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ امام ؑ کو قیام سے باز رہنے کا مشورہ دینے والا ہر شخص آپ کے قیام کو سببِ انتشار و اختلاف ٹھہرا رہا تھا۔ گویا یہ لوگ امام حسین ؑ کے قیام کو انتشار امت کا سبب قرار دیتے تھے اور یزید جیسے فاسق وفاجر کے ظلم وستم کے زیر سایہ خاموش رہنے کو اپنے لئے سکون واطمینان کا باعث سمجھتے تھے۔

جب کسی قوم وملت سے دین کا تصور محو ہو جاتا ہے تو اس کا واضح نشان یہ ہے کہ اس قوم کے افراد ہر موقع پر امت کی وحدت کی بات کرنے لگتے ہیں، اتفاق واتحاد کو ہی اعلیٰ اقدار سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے بعض مذہبی لبادہ اوڑھنے والے لوگ جو خود کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار سمجھتے ہیں، ان کی زبان پر بھی دین ومذہب کی بجائے ہر وقت ملت کی وحدت کی بات ہوتی ہے۔ دین کا جنازہ نکل جائے انہیں کوئی غم نہیں ہوتا۔

غرض مذہب کے جسم سے کیڑے مکوڑوں اور فاسد جراثیم کو نکالنے کی کسی بھی کوشش کو امت کے انتشار کا سبب گردانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے لغو اعتراضات عائد کرنے والوں نے معصوم ہستیوں کو بھی نہیں بخشا۔ یہاں تک کہ امام حسین -کے قیام مقدس کو بھی انتشار امت کا سبب قرار دینے سے گریز نہیں کیا۔

۲۔ ان احباب کا کہنا ہے کہ وہ باتیں جنہیں عام لوگوں نے اب تک سنا بھی نہیں ہے' کیا ان کو منظر عام پر لانے سے ان غلطیوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملے گا۔

اس سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ کوئی علاقائی یا قومی تہذیب و تمدن کی بات تو ہے نہیں کہ یہ کہا جائے کہ کسی تہذیب میں جو بات نہیں ہے' اسے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو مذہب کی بات ہے اور مذہب جغرافیائی حدود سے مستثنیٰ ہے۔ مذہب زمان و مکان سے بھی بالاتر ہے۔ مذہب صرف زمان حاضر کیلئے نہیں ہے۔ یہاں بسنے والے دانشور حضرات صرف اپنی علاقائی یا قومی زبان کے جاننے والے نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں جو باتیں کہی جاتیں ہیں وہ کئی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر نشر ہوتی ہیں لہٰذا جب ہمارے دانشمند مولفین بغیر توجہ کے باتیں لکھ جاتے ہیں یا غلط روایات نقل کرتے ہیں تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ان تمام باتوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔

حق گوئی میں گونگا پن

جب پہلی دفعہ اسلام فرقوں میں تقسیم ہوا تو اس وقت دو فرقے وجود میں آئے: اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع۔ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو اصلی اسلام کا پیرو' اور دوسرے کو نقلی اور بعد کی پیداوار ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں ایک طویل عرصہ جھگڑا' فساد' مناظرہ و مجادلہ میں گزر گیا۔ بدقسمتی سے گزشتہ چند سالوں سے یہ مناظرہ اور مجادلہ منطق و استدلال کی بجائے طاقت و قدرت اور آہنی اسلحہ کے زور پر شروع ہو گیا ہے جبکہ گذشتہ ادوار میں اور خلفاء اور ائمہ طاہرین ؑ کے زمانے میں یہ جنگ منطق و برہان پر استوار جنگ ہوا کرتی تھی۔

یہ دو فرقے ایک ایسی بدیہی حقیقت ہیں جن کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ جو سوال ان دونوں فرقوں کے

افراد کے ذہن میں یا دوسرے لوگوں کے ذہن میں بھی آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا فرقہ صحیح ہے اس بات کو جاننے کیلئے تحقیق سے کام لینا پڑیگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کسوٹی کیا ہوگی جس پر پرکھ کر ہم معلوم کر سکیں کہ کون سا فرقہ حق سے قریب تر ہے۔ یقیناً وہ کسوٹی خود اسلام کے مسلمہ اصول و فروع ہیں جنھیں صدر اسلام سے اب تک امت مسلمہ تسلیم کرتی آئی ہے......نماز جو دین کا ستون ہے' حج' روزہ' قرآن اور اس پر عمل' یہ سب ضروریات دین میں شمار ہوتے ہیں اور آیاتِ قرآنی اور روایات متواترہ سے ثابت شدہ ہیں۔ نہ اس کے اصل سے انکار ممکن ہے اور نہ ان کی تفسیر و تاویل سزاوار ہے۔ اسلام میں منکرِ صلوۃ کو کافر قرار دیا گیا ہے چنانچہ بعض صوفی جب کشفِ حقائق کا دعویٰ کرنے کے بعد نماز سے دوری اختیار کر گئے یا انکار کر بیٹھے تو شیعہ اور سنی دونوں مکتب فکر کے علماء نے انہیں گمراہ قرار دے دیا کیونکہ نماز' روزہ' حج' قرآن اور اس پر عمل اسلام کے بنیادی اصول شمار ہوتے ہیں۔

چونکہ یہ دونوں ہی فرقے اسلام کی پاسداری کا دعویٰ کرتے ہیں' اس لئے دونوں کو اصول و فروع دین کی بقاء کے لئے اپنی قوت اور قدرت صرف کرنی چاہیے۔ انہیں اعتقادی الجھنوں کے دام میں نہیں پھنسنا چاہیے کیونکہ اس طرح سے دونوں فرقے خود بخود استعمار کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ آج عوام کی اکثریت لادینیت کے جال میں پھنستی جا رہی ہے ہر طرف کھلے عام ٹی وی' وی سی آر' ڈش' انٹرنیٹ' اخبارات اور جرائد کے ذریعے لادینیت کی بلائیں مسلمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں لہٰذا دونوں قوتوں کو چاہیے کہ اپنے معاشرہ کی اصلاح کے لئے کام کریں۔ یہی عین پاسداریٔ اسلام اور دین کی سچی خدمت ہوگی۔

ہمارے ائمہ طاہرین ؑ نے انہی اعمال کی پابندی کے ساتھ بجا آوری کو اپنے ماننے والوں کی پہچان قرار دیا ہے۔ اب اگر کوئی منبر حسینی سے نماز کے خلاف' روزہ کے خلاف' حج کے خلاف بولے تو بتلایئے کہ کیا ایسا شخص حق و انصاف کے ساتھ بات کرنے والا خطیب کہلانے کا مستحق ہوگا؟ اگر ان باتوں کو سننے کے بعد سامعین میں معمولی سی جنبش بھی نہ ہو تو بتلایئے کہ ایسے لوگوں کو کس فرقے سے منسلک سمجھا جائے؟ اپنے آپ کو دین کا محافظ اور پاسدار کہنے والے اگر ان باتوں کو سننے کے بعد' ان کی بندش کیلئے نہ سوچیں تو بتلایئے کہ ان کے

بارے میں کس قسم کا فیصلہ صادر کیا جائے؟ آیا منبرِ حسینی سے ایسی باتیں کھل کر کہنے اور سننے سے خود منبر کا تقدس پامال نہیں ہو رہا ہے؟ اصولِ دین کی پائمالی نہیں ہو رہی ہے؟ کیا یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ان خرافات کے خلاف اقدامات کرنا جائز ہوگا؟ اگر ایسی خرافات کو عزاداری کا نام دیکر اسلام و تشیع کی بقاء کا ضامن قرار دیں گے تو اس اسلام و تشیع پر فاتحہ پڑھنا ہوگا۔

آخر علمائے کرام خاموش کیوں؟

عزاداری کا ہدف بقول معصوم احیائے امرائمہ ہے۔ ہمارے لائق صد احترام علماء کرام اور دانشور حضرات مراسمِ عزاداری میں شامل کی جانے والی نت نئی خرافات کو دیکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان مسائل پر گفتگو کرنے نقد و اعتراض کرنے، تحقیق کرنے اور قلم اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔

کسی معاشرے میں غلط چیزوں کا فروغ ہمیشہ مفاد پرست عناصر کی ایماء پر ہوتا ہے جو کسی نہ کسی صورت اسے تحفظ بھی فراہم کرتے ہیں۔ ہم روزانہ اخبارات میں ان کی جانب سے جرائم کی مذمت و ملامت پر مبنی بیانات پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی جرائم جوں کے توں رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے مراسمِ عزاداریِ امام حسین ـ میں اسقدر توڑ مروڑ اور غلط گوئیاں شامل ہوگئی ہیں کہ ان کی اصلاح کرنے کے بارے میں علماء و مصلحین حیران ہیں۔ کوان تحریفات کے باقی اور جاری رہنے میں ان کا کوئی مفاد بھی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود نہ جانے کس بناء پر وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے کے خلاف ہیں اس سلسلہ میں جو توجیہات وہ پیش کرتے ہیں ہم آئندہ سطور میں انہیں زیرِ بحث لائیں گے۔ ہمارے یہ معاصر علماء ہم سے کئی گنا علم و فضل اور تقویٰ میں مقدم ہیں۔ ان میں بعض ہمارے اساتذہ اور بعض مخلص دوست بھی ہیں ہمیں ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی اختلاف و رنجش بھی نہیں ہے۔ لیکن جو توجیہات اس بابت خاموش رہنے کیلئے وہ پیش کرتے ہیں، وہ ہمیں قانع نہیں کرتیں اور ہمیں ان سے کسی قسم کی اطمینان بخش دلیل نہیں ملتی بلکہ ہمیں یہ توجیہات خود ان کی عملی زندگی میں ان کے دیگر نظریات اور اعمال سے بھی متصادم نظر آتی ہے۔ یعنی وہ خود اپنی زندگی میں ان توجیہات پر عمل نہیں کرتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا رویہ عزاداریِ امام حسین ـ کے ساتھ دردمندانہ نہیں ہے۔ شاید وہ ایسا اپنی شخصیت

کا بھرم قائم رکھنے اور اس کے داغدار ہونے کے خوف سے بچنے کیلئے کرتے ہیں۔

ہم یہاں پر پہلے وہ توجیہات بیان کریں گے جو علمائے اعلام بیان کرتے ہیں اور پھر ان توجیہات پر وارد نقد و نظر قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ موجودہ عزاداری میں رائج غلط گوئیوں اور افسانہ پردازیوں کے بارے میں ان علماء اور صاحبانِ فکر کے جو مختلف اور متضاد نظریات ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) جو کچھ امام ـ کے نام پر ہو رہا ہے اس کو اسی حالت میں جاری رہنے دینا چاہیے اگر آپ اس کو چھیڑیں گے تو اس کی ضد میں برے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کا انجام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ عزاداری ہی سے بدظن ہو جائیں اور اس کو سرے سے چھوڑ دیں لہٰذا آپ جو خدمت کر رہے ہیں، اسے یکسر ترک کر دیں۔

(۲) عزاداری غلط طریقہ سے ہی سہی، کم سے کم امام ـ کا نام اسی بہانہ لے لیا جاتا ہے۔ اگر اس کو چھیڑیں گے تو یہ نام بھی نہ لیا جائے گا۔

(۳) عزاداری جیسی بھی سہی، اس بہانہ سے مومنین جمع ہوتے ہیں یہ بات بذاتِ خود مذہب کے فائدے میں ہے۔

(۴) عزاداری کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے آپ کو کیا زحمت ہو رہی ہے اور کون سا نقصان پہنچ رہا ہے؟

(۵) مروجہ مراسمِ عزاداری میں بہت سی چیزیں، مانتے ہیں کہ غلط ہیں لیکن ہر بات عوام میں نہیں لائی جانی چاہیے۔ ایسی باتیں خواص تک محدود رکھی جاتی ہیں۔

(۶) ان باتوں کی نشر و اشاعت و طباعت سے یہ نکات ہمارے مخالفین کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور انہیں ہمارے خلاف لکھنے اور بولنے کا موقع ہاتھ آتا ہے اور پھر وہ ہم سے کہتے ہیں کہ آپ ہی کے ذمہ دار افراد ان چیزوں کو نہیں مانتے۔

(۷) قدیم عرصہ سے بہت سے علماء ایسی اصلاحات کیلئے کوششیں کرتے رہے ہیں لیکن وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوئے لہٰذا آپ بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

(۸) اگر اس میں موجودہ باتیں اصول و فروعِ دین سے یا دین کی کسی شق سے متصادم نہ ہوں، تو اس کو رائج رکھنے میں شریعت کی رُو سے کوئی اشکال نہیں ہے۔

(۹) یہ لوگ منبر پر جا کر جو کچھ فرماتے ہیں' وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے ہیں بلکہ وہ یہ سب کچھ بڑے بڑے مدارس و حوزہ کے فارغ التحصیل علماء سے سن کر بیان کرتے ہیں یا انکی لکھی ہوئی کتابوں سے نقل کرتے ہیں پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ ان سب علماء اور مؤلفین نے غلط گوئی کی ہے۔

(۱۰) یہ باتیں ایک عرصہ سے مجالس عزاء میں علماء وفقہاء و بزرگ اساتذہ کے حضور پڑھی جاتی رہی ہیں لیکن انہوں نے نہیں روکا۔ اگر یہ عمل باب نہی از منکر کی رُو سے غلط ہوتا تو علماء ضرور اس سے روکتے۔ ان کا نہ روکنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اس میں صحت نہیں ہے تو ضرر بھی نہیں ہے اور اگر ضرر ہے بھی تو خود ضرر سے بچنے کے لئے اس کے خلاف بولنا واجب نہیں ہے۔ شاید اس میں کوئی مصلحت ہو ورنہ یہ لوگ ضرور قدم اٹھاتے۔

ہمارے دردمندانہ عرائض

ان بزرگانِ دین وملت کے محضر شریف میں' ان کے فرمودات کے نقد و رد میں' ہمارے عرائض و گزارشات حسب ذیل ہیں:

(۱) اس وقت جس شکل وصورت میں عزاداری امام حسین -جاری ہے' اگر اس سے بھی بدتر ہو جائے اور اگر اس کا معیار مزید بھی گر جائے' تب بھی ہم ہرگز اس کے بند ہونے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم تو انتہائی خاضعانہ اور دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ اس عزاداری میں موجود غلط گوئی کو نکال دیجئے کیونکہ غلط گوئیوں کی وجہ سے حقائق پسِ پشت ہو رہے ہیں۔

(۲) وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ایسی باتیں کریں گے تو عزاداری ہی سے ہاتھ دھونا پڑے گا' یہ بات درحقیقت عزاداری میں اصلاح چاہنے والوں کو خوف دلانے یا دھمکانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ ہم عزاداری کے مخالف ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان سے زیادہ فروغ عزاداری کے خواہاں ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک ماں کی گود سے اس کا بچہ چھین لیا جائے اور اگر وہ ماں کہے کہ اس بچے کو چھوڑ دو تو اسے دھمکی دی جائے کہ خاموش رہو ورنہ بچے کو مار ڈالیں گے۔ وہ جو مار ڈالنے کی

دھمکی دیتے ہیں' اگر دل سے دیتے ہیں تو یقیناً وہ عزاداری کے بارے میں مخلص نہیں ہیں اور وہ کسی نہ کسی دن اس کو ختم ہی کردیں گے۔

(۳) عزاداری بذات خود ایک مقصود و مطلوب ہے' نہ کہ دین و مذہب کا جزو۔ فروغ عزاداری عقلی دلیل کے تحت ہے' نہ کسی شرعی اصول کے تحت۔ عزاداری ایک اعلیٰ و ارفع مقصد تک پہنچانے کیلئے وسیلہ ہے اور وہ ہدف و مقصد حضرت امام حسین -ہیں۔ عزاداری کے اہداف کو احیائے امر ائمہ بتایا گیا ہے۔ اگر اس کے ذریعہ احیائے امر ائمہ نہیں ہو رہا ہے یا احیائے امر ائمہ اس کی وجہ سے معطل پڑا ہے تو اس کی اصلاح ہونی چاہیے' ورنہ بصورت دیگر اس کی مثال ایسے ہے جیسے آپ کی گاڑی کہ جس کے ذریعہ سے آپ کو منزل تک پہنچنا ہے' اسے کوئی راستے میں روک کر کہے کہ اگر آپ آگے بڑھے تو ہم گاڑی کو جلا دیں گے۔ اگر منزل تک پہنچنے کیلئے گاڑی نہ ملے تو اس گاڑی کا کیا فائدہ؟۔

(۴) جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ آپ کو اس سے کیا تکلیف پہنچ رہی ہے؟' یہ بات انتہائی تعجب خیز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کے رشتہ دار یا عزیز کو کوئی مارے پیٹے اور اس پر وہ خود خاموش رہے کیونکہ تکلیف عزیز کو پہنچ رہی ہے خود اس کو تو کوئی اذیت نہیں ہو رہی ہے۔ کیا عزاداری سے ہمارا رشتہ اس طرح کا ہے کہ جو کوئی چاہے اسے چیرے' پھاڑے' مسخ کرے' اس پر کاری ضرب لگائے اور اس سے ہمیں تکلیف نہ پہنچے۔ یہ بات عزاداری کے مخالف کسی غیر شیعہ سے تو کہی جا سکتی ہے' لیکن دردِ دین و مذہب رکھنے والے سے نہیں۔

(۵) جو حضرات اس فکر کے حامل ہیں کہ ہر بات عوام میں نہیں لائی جاتی یا نہیں لائی جانی چاہیے' گویا ان کی نظر میں دین کا کچھ حصہ عوام کے پاس رہتا ہے اور باقی حصہ خواص کے پاس۔ یہ منطق اس مذہب کی ہرگز نہیں ہے جو الف تا یا دلیل و برہان پر قائم ہے اور جو کھلی کتاب کے مانند ہے۔ یہ بات کسی پیغمبر یا امام برحق نے کبھی نہیں کہی کہ ہر بات عوام کو نہیں بتائی جاتی ہے۔ اس قسم کی باتیں تو ان مذاہب کا خاصہ ہیں جو عقل' نقل' وجدان' فطرت اور سائنس کے خلاف ہیں کہ اس سے ان کے کھوکھلے مذہب کو چیلنج کا سامنا ہوتا

ہے اور اسی لئے وہ اصل مذہب کو چھپا کر اپنے ماننے والوں کو کسی اور دائرے میں محصور رکھتے ہیں۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں ہے۔ یہ تو زرتشیوں اور مسیحیوں کے مذہب کی منطق ہے۔ ہمارا مذہب عقل و برہان پر استوار ہے اس کی منطقی باتوں کے کھلنے سے اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ خطرہ تو ان لوگوں کو ہے جو بغیر دین شناسی کے دین پر قائم رہنے کے خواہاں ہیں۔

(۶) یہ جو بات ہے کہ عزاداری میں موجود باتیں اگر دین کے اصول وفروع سے متصادم نہ ہوں تو ان کے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہمیں اس بات پر تعجب ہے۔ جو چیز خلاف واقعہ ہو، جھوٹ ہو، اس کو مذہب کی طرف نسبت دی جائے اور اس کو مذہب بنا کر پیش کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے! کیسی مضحکہ خیز ہے یہ بات۔ اگر آپ کوئی پانچ دس منٹ گفتگو کریں اور آپ کی گفتگو میں ایک دو کلموں کا اضافہ کر کے آپ کے حضور پیش کیا جائے تو بے ساختہ آواز بلند ہو جائے گی کہ جناب یہ غلط بیانی ہے، ہم آپ کو غلط بیانی کی اجازت نہیں دیں گے ہم نے قطعاً یہ نہیں کہا ہے۔ آپ سے منسوب دو جملے جو آپ نے نہ کہے ہوں، آپ کہنے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر آپ کیسے خاندان عصمت وطہارت سے منسوب، امام حسین۔ ' حضرت ابوالفضل العباسؑ حضرت زینب =و حضرت زہرا = سے منسوب جعل کئے گئے قصوں، کہانیوں اور لمبی داستانوں کو اصول وفروع سے غیر متصادم قرار دیتے ہیں؟ کیا فقہائے کرام نے یہ نہیں لکھا ہے کہ خدا اور رسول یا ائمہ اطہار سے جھوٹ کو نسبت دینا گناہ ہے، اس سے روزہ باطل ہو جاتا ہے؟

بعض قصے کہانیاں محض جھوٹ ہی نہیں، بلکہ ضرر رساں اور نقصان دہ بھی ہیں اور دین ومذہب سے متصادم بھی۔ یہ کہانیاں کہیں حسینؑ کو مسیح کی صورت میں پیش کرنے اور لوگوں کو گناہ کرنے کی جرأت دلانے پر منتج ہوتی ہیں اور کہیں پر ان کے ذریعے سے یزید اور آل یزید کو حسینؑ واہل بیت حسینؑ کے بارے میں حقیقی معنوں میں پشیمان ہونے اور یزید کو ہمدرد دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ قصے مذہب سے متصادم نہیں ہیں؟ آیا کوئی جھوٹی کہانی بھی معصومینؑ سے قریب کا سبب بن سکتی ہے؟۔

(۷) احکام فقہ کے باب اسراف میں اسراف وتبذیر کو نص آیات وروایات کی رُو سے حرام اور عمل شیطان

قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ برتن کی تہہ میں موجود پانی کو بلاوجہ پھینک دینا کسی نہر یا دریا سے چلّو میں پانی لیکر بے سبب پھینکنا بھی اسراف ہے۔ ملک کے طول وعرض میں اس وقت جتنی توانائیاں اور جس قدر سرمایہ عزاداری کے نام پر خرچ ہو رہا ہے، اس سے نہ تو اہل مذہب کو کوئی فائدہ حاصل ہو رہا ہے، نہ خود مذہب کی مؤثر تفسیر وتوضیح ہو رہی ہے اور نہ ہی اہل بیت کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ پھر کیا یہ اسراف نہیں ہے؟ اتنی توانائیاں صرف ہوں اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو، کیا یہ بات فروع دین سے متصادم نہیں ہے؟۔

(۸) جہاں تک اس توجیہ کا تعلق ہے کہ سابقہ فقہاء ومجتہدین کے حضور میں بھی ان باتوں کا بیان ہوتا تھا، لیکن وہ خاموش رہتے تھے، ہمیں بھی خاموشی اختیار کرنا چاہیے، اس سلسلے میں چند تلخ حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

(الف) فقہاء ومجتہدین بمثل ائمہ معصومین ؑ نہیں ہیں کہ ہر علم میں انہیں مکمل احاطہ حاصل ہو۔ ان کے اجتہاد کا دائرہ فقہ ہے، تاریخ نہیں لہٰذا ان کا ان مسائل میں نہ بولنا، ان باتوں کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا اگر فقہاء ومجتہدین جانتے بوجھتے بھی کسی مصلحت کی بنا پر ان مسائل کو نظر انداز کریں، تب بھی یہ کہنا کسی طور درست نہیں کہ ہمیں بھی ان کے عمل کی تاسی کرنا چاہیے کیونکہ کسی بھی مجتہد وفقیہ نے کبھی بھی اپنے قول وفعل و تقریر کو حجت قرار نہیں دیا ہے۔ یہ بات صرف ائمہ معصومین ؑ کے لئے صادق ہے اور انہیں تک محدود ہے۔

(ب) جہاں بہت سے فقہاء ومجتہدین نے ان مسائل میں خاموشی اختیار کر رکھی تھی یا کر رکھی ہے، وہاں انہوں نے معاشرے میں موجود کئی دوسری برائیوں اور غلط رسوم ورواج سے متعلق بھی، اپنی مصلحتوں کی وجہ سے کھلے عام اظہار نہیں کیا ہے۔ اسکا قطعاً یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ان کی نظروں میں ان تمام خرافات کا معاشرے میں رواج پانا صحیح تھا یا صحیح ہے۔

(ج) ہمیں اپنے معاصر علماء ودانشور حضرات سے اس بابت خاموشی اختیار کرنے کی جو شکایت ہے، وہی شکایت سابقہ علمائے کرام سے بھی ہے۔

(د) یہ کہنا کہ عزاداریٔ امام حسین۔ میں شامل خرافات کے سلسلے میں علماء وفقہاء بالکل خاموش رہے ہیں اور کسی

نے کوئی اقدام نہیں کیا ہے' بھی غلط ہے۔ چنانچہ آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ نے آقائے بروجردی سے بعض مراسم کی روک تھام کرنے کے لئے اقدام کرنے کی سفارش کی تھی۔ خود شہید مطہریؒ نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی ہے جو ''حماسۂ حسینی''[1] کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ امام خمینیؒ نے مرحوم آیت اللہ عبدالکریم حائری سے عزاداریٔ امام مظلومؑ میں مروج غلط گوئیوں اور غلط مراسم کو روکنے کیلئے کوشش کرنے کا ذکر کیا ہے۔ مرحوم آیت اللہ محسن امین نے بھی اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ کتاب ''شعائر حسینی'' میں سید محمد باقر الحکیم نے اپنے والد بزرگوار آیت اللہ سید محسن الحکیم سے اس سلسلے میں درد دل بیان کرنے کا ذکر کیا ہے آیت اللہ میرزا حسین نوری طبریؒ ملقب بہ خاتم المحدثین' چودھویں صدی ہجری کے ابتدائی زمانے کے اکابر علمائے امامیہ میں سے تھے' انہوں نے عزاداری میں دروغ گوئی کی روک تھام کی غرض سے ''لؤلؤ مرجان''[2] کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب تالیف فرمائی ہے۔ دورحاضر کے مجتہدین میں امام خمینیؒ اور آیت اللہ خامنہ ای کے عزاداری سے متعلق گراں بہا بیانات وفتاویٰ موجود ہیں۔

(۹) جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان باتوں کو نشر کرنے کی صورت میں مخالفین کے ہاتھ مواد آتا ہے اور انہیں ہمارے خلاف بولنے اور لکھنے کا موقع ملتا ہے' ان سے ہماری عرض یہ ہے کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہمارے مخالفین سوئے ہوئے انسان نہیں ہیں۔ ہمارا ہر عمل ان کی نظروں میں ہے وہ ہماری حرکتوں کے خلاف صفحوں میں نہیں جلدوں میں کتنی ہی کتابیں لکھ اور چھاپ چکے ہیں۔ ہم ہی ہوش میں نہیں آئے ہیں۔ اس وقت ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے' جو فرقہ واریت پھیلی ہوئی ہے' وہ سب کچھ ہمارے اعمال کے انکی نظروں سے گزرنے کے سبب ہوا ہے۔ ہم پر کفر والحاد' شرک وفرقۂ گمراہ کے جو فتاویٰ لگے ہیں' کبھی سوچا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ مذہب کو جاہلوں کے ہاتھ میں بے لگام چھوڑ رکھنے' انہیں ہر قسم کی دخل اندازی کی کھلی چھٹی دینے اور اصلاح کے طالبوں کو بلا جواز وہمی حصار میں رکھنے سے ہوا ہے۔

---

[1] [اس کتاب کا اردو ترجمہ دارالثقافۃ الاسلامیہ نے ''حماسۂ حسینی'' کے نام ہی سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔
[2] یہ کتاب بھی اردو داں حضرات کے استفادہ کیلئے دارالثقافۃ الاسلامیہ نے ''آداب اہل منبر'' کے نام سے شائع کیا ہے]

ہمیں اپنے بھائیوں کی اس بے توجہی اور بے حسی پر انتہائی تعجب ہے' خصوصاً اپنے مکتب کے علماء اور دانشوروں پر تو حیرت ہے۔ کیا ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے؟ کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ان چند سالوں میں ہمارے خلاف سینکڑوں کتابیں' ہماری سرگرمیوں کے علاوہ خصوصی طور پر عزاداری کے طور طریق کی رد میں لکھی گئی ہیں۔ ہم ان کتابوں کا نام اس لئے نہیں لینا چاہتے کہ اس سے امت اسلامی میں تفرقہ وانتشار پھیلتا اور ان کتابوں کو فروغ ملتا ہے۔ اس لئے ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ عزاداری میں اصلاح کی غرض سے لکھی جانے والی ان منطقی باتوں سے ان کو موقع ملے گا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے غلط طور طریقوں اور ہماری غلط گوئیوں نے کب سے انہیں موقع دے رکھا ہے اور انھوں نے ان مواقع سے استفادہ کرکے ہمارے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے۔

جتنی کتابیں ہمارے خلاف لکھی گئی ہیں ان کو الف تا ے تہمت وافتراء کہنا بھی غلط ہے۔ کوئی شخص یا گروہ دوسرے شخص یا گروہ کو صاف صاف جھوٹی تہمت سے متہم نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ ہماری حرکتوں کو دیکھ کر اور ہمارے مقررین اور خطباء کی گفتگو کو سن کر ہی کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ سب عمل انہیں محلوں اور گلیوں میں کھلے عام لاؤڈ اسپیکروں پر ہوتا ہے جہاں وہ بھی رہتے ہیں۔ وہ دیکھ بھی رہے ہیں اور سن بھی رہے ہیں پھر ہمارے بولنے سے انہیں کوئی نیا موقع کیسے ملے گا؟ ہماری تحریروں سے ان کی معلومات میں کوئی اضافہ تو کیا ہوگا بلکہ وہ یہ کہیں گے کہ یہ لوگ اس وقت اپنی غلطیوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

(۱۰) قیام امام حسینؑ - یزید کے خلاف تھا۔ امام حسینؑ - دس سال معاویہ کے دور خلافت میں رہے۔ دین و مذہب کی مصلحت پر رکھنے والی دوربین نظروں سے حکمتوں کے درک کرنے والے امامؑ نے' تمام تر غم وغصہ پی کر' معاویہ کے خلاف قیام نہیں کیا اور اس کے خلاف مہم نہیں چلائی۔ مولا امیر المومنینؑ نے خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے دور میں' اقرباء پروری کی بناء پر بنو اُمیہ کے مقدرات کے امت مسلمین پر مسلط کئے جانے کے باوجود ان کے خلاف بدگوئی کیلئے زبان نہیں کھولی۔ اسی طرح پہلے دو خلفاء کے بارے میں بھی کوئی ناشائستہ جملہ کسی اجتماع میں استعمال نہیں کیا' گرچہ بارہا اپنی حقانیت اور حق تلفی کی شکایت کرتے

رہے۔امیرالمومنینؑ کے وہ کلمات نہج البلاغہ میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں جن میں آپؑ نے آیات قرآنی کی روشنی میں سبّ وشتم سے منع فرمایا ہے۔

معاویہ کے خلاف جنگ کو ایک ناگزیر فرض سمجھتے ہوئے امیرالمومنینؑ میدان جنگ میں وارد ہوئے' ایک عرصہ تک نبرد آزمائی کرتے رہے لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف بدزبانی کرنے کو منع فرمایا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اپنے ماننے والوں کے ذریعہ دوسروں پر سبّ وشتم کرنے کی سنت جاری کرنے کا بانی تمام مستند کتابوں کے تحت معاویہ ابن ابی سفیان ہے۔معاویہ نے امیرالمومنینؑ پر سبّ وشتم کو جزءِ دین قرار دیا۔افسوس کہ ہمارے ہاں عزاداری امام حسینؑ میں معاویہ کی اس سنت کو زندہ کیا گیا،نتیجتاً اس ملک میں مکتب تشیع اور اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کیلئے' دشمنان اسلام کو موقع فراہم ہوئے۔ہم مسلکِ اہل سنت کے ان مخلص علماء اور دانشوروں کی قدر کرتے ہیں کہ جنھوں نے وحدتِ اسلام ومسلمین کی خاطر فتنۂ ضد میں اسلام ومسلمین کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیا۔

البتہ ان کے کچھ افراد نے دانستہ یا نادانستہ طور پر' دنیائے حقیر کے مختصر ومعمولی مفاد کی خاطر طاغوت کے منصوبے کو کامیاب بنانے میں مدد دی ہے۔

ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ دنیا میں جب بھی کوئی جنگ چھڑتی ہے' تھوڑے عرصہ بعد دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات کی میز پر جمع ہونے کی رغبت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پھر خون بہانے اور جانیں ضائع کرنے کے بجائے' مسائل کو صلح کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔

مصائب امام حسین - میں ترجیحات

تمام عزادارانِ امام حسینؑ یعنی مخاطِب اور مخاطَب متکلم اور سامع سب کو چاہئے کہ مصائب امام حسینؑ میں بنیادی مصائب اور فروعی مصائب میں اور پھر اضافات اور جعلیات میں حفظ مراتب کا خیال رکھیں۔ اقرب ثم اقرب، تقدیم افضل بر مفضول اور قانونِ حفظِ مراتب، نظام کائنات میں ایک مسلمہ قانون ہے۔ یہ تکوینیات اور تشریعات دونوں میں جاری ہے۔ خداوند عالم نے موجودات میں جمادات پر نباتات کو، نباتات پر حیوانات کو اور حیوانات پر انسان کو ترجیح دی ہے چنانچہ سورۂ مبارکہ اسراء کی آیت ۷۰ میں فرمایا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت ترجیح دی ہے: ﴿ولقد کرّمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر...... ﴾ اسلام نے انسانوں میں اعلیٰ صفات کے حامل افراد کو ان صفات سے محروم افراد پر افضل قرار دیا ہے، مثلاً عالم کو جاہل پر، متقی و پرہیزگار کو عاصی و گناہگار پر اور مجاہدین کو قاعدین پر ترجیح دی ہے۔ اسی طرح سے انبیاء کو امت اور علماء پر اور خود انبیاء میں بعض کو بعض پر مقدم جانا ہے جیسا کہ سورۂ مبارکہ آل عمران میں بیان ہوا ہے۔ پھر خود رسولوں میں اولوالعزم پیغمبروں کو غیر اولوالعزم پیغمبروں پر ترجیح حاصل ہے چنانچہ قرآن مجید میں انبیاء و رسل میں سب سے زیادہ تکرار اولوالعزم پیغمبروں کی ہوئی ہے۔ اولوالعزم پیغمبروں میں بھی خاتم الانبیاء کو سب پر افضلیت حاصل ہے۔ اسی طرح میدان حق و باطل کی جنگ میں لڑنے والے بھی مجاہدین ہیں لیکن گھروں میں بیٹھنے والوں پر مجاہدین کو اور مجاہدین پر شہداء کو فضیلت ہے۔ شہیدوں کے مابین بھی فرق ہے، یہاں تک کہ بعض نے سیدالشہداء کا لقب حاصل کیا ہے جنگ احد میں حضرت حمزہ سیدالشہداء قرار پائے۔

پوری تاریخ انسانیت میں حضرت امام حسین - سیدالشہداء ہیں کربلا میں امام حسینؑ کے بعد سب سے بلند مقام پر حضرت ابوالفضل العباسؑ کا ہے۔ چنانچہ حضرت امام سجاد - نے فرمایا کہ میرے چچا عباسؑ کے مقام و منزلت پر شہدائے اوّلین و آخرین کو غبطہ ہے۔

پس اصل کو فرع پر ترجیح دینا، فرع کو اجنبی پر ترجیح دینا اور اسی طرح اصل حقیقت کو جعلیات پر ترجیح دینا حکم عقلی و شرعی ہے۔ ہمیں عزاداری امام حسینؑ کو بھی اس حکم عقلی و شرعی کے تناظر میں قائم رکھنا چاہئے یعنی مصائب امام حسینؑ میں امام حسینؑ کو آپ کے انصار و اعوان پر ترجیح دینا چاہئے اور اُسراء میں اہل بیت کو دوسروں پر اور اہل بیت میں حضرت زینب = کو باقی سب پر ترجیح دینا چاہئے۔ اسی طرح سے خود کربلا والوں کو کہ جو اس معرکہ میں شامل ہوئے تھے بعد میں قیام کرنے والوں پر ترجیح دینا چاہئے۔ اسی طرح جب فرشِ عزاء پر بیٹھیں تب بھی اسی اصول کا پابند رہنا چاہئے یعنی جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے اس کو جعلیات اور بے سند مصائب پر ترجیح دینا ہی درحقیقت عزاداری و پاسداری عزاداری کا مفہوم ہے۔

بدقسمتی سے عزاداری امام حسین - میں یہ اصول پائمال ہے۔ خطیب و ذاکر اشک آور مصائب چن چن کر پیش کرتے ہیں اور ان کا تکرار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کیلئے تو خاص دن مختص کرتے ہیں اس کے برعکس بعض ایسے شہداء کہ جنہوں نے اس واقعہ میں اہم کردار ادا کیا ہے، ان کا نام تک نہیں لیتے۔ ان کی مصیبت سرے سے بیان ہی نہیں کرتے بطور مثال حضرت مسلم بن عقیل کے میزبان اور ان کے جان کے بدلے اپنی جان قربان کرنے والے جناب ہانی بن عروہ کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا جاتا ہے، لیکن مختار ثقفی کے بارے میں تکرار سے ذکر ہوتا ہے۔ اسی طرح اولادِ عقیل میں سے آٹھ نفوس کربلا میں شہید ہوئے ہیں ان شہداء میں عبداللہ او محمد دو فرزندانِ مسلم بھی ہیں، جنکا ذکر تمام تواریخ اور مقاتل میں ہے کہ یہ دونوں کربلا میں امام حسین - کی رکاب میں شہید ہوئے۔ لیکن ہمارے خطباء و ذاکرین ان کا نام تک نہیں لیتے۔ جبکہ دو اور فرزندانِ مسلم کا ذکر اس قدر تکرار سے ہوتا ہے بلکہ ان کے ذکر کیلئے باقاعدہ ایک دن مختص کیا جاتا ہے، حالانکہ ایسے دو فرزندوں کا کوفہ میں ہونا ایک متنازعہ اور مشکوک مسئلہ ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے مصائب ہیں کہ تاریخ مقاتل میں نقل کرنے والوں نے جن کی خود تردید کی ہے اور انہیں مشکوک قرار دیا ہے لیکن ہمارے یہاں اس کے باوجود انکو خاص اہمیت دی جاتی ہے مثلاً حضرت سکینہ کو ایک چھوٹی سی بچی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے یا جناب لیلیٰ جن کے کربلا میں موجود نہ ہونے کو سب تسلیم کرتے ہیں، ان مصائب میں انتہائی اہتمام کے ساتھ

ذکر کیا جاتا ہے۔

دنیا' دارِ مصائب و ابتلا ہے اس دنیا میں ہر انسان اپنے ایمان او ر معرفت کے لحاظ سے کسی نہ کسی مصیبت و بلا میں گرفتار رہے۔ اسی سے اس کے مقام و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ اس کی قدر و منزلت کو پہچانا جاتا ہے۔ انبیاء و اولیاء دیگر خلائق کی بہ نسبت مصیبت میں زیادہ مبتلا رہے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ مصیبت و ابتلا میں کون مبتلا ہوئے، ایسی مصیبت کہ جسے دوسروں کے مصائب پر تقدیم و ترجیح دی جا سکے؟ اس سوال کے جواب کے لئے جب ہم تاریخ بشریت پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ صاحب مصیبت حضرت امام حسین بن علی -قرار پاتے ہیں۔

بنا برایں آپ کو تمام انبیاء اور اولیاء کے وارث کا لقب ملا ہے۔ کسی عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ترجمہ: "حسینؑ کی مصیبت نے تمام مصیبتوں کو بھلا دیا ہے یہاں تک کہ جو ائمہ اطہار آپ کے بعد تشریف لائے حتٰی امام زمانہ حضرت حجۃ عجل اللہ فرجہ الشریف نے بھی مصیبت و امتحان میں آپ کو سب پر مقدم رکھا ہے اور آپ کی مصیبت کو تمام مصیبتوں پر ترجیح دی ہے"۔

مولائے کائنات امیر المومنین -نے نہج البلاغہ میں پیغمبرؐ سے خطاب کر کے فرمایا:

"ہر مصیبت میں صبر اچھا ہے لیکن آپؐ کی مصیبت پر صبر برا ہے"

لہٰذا مصیبت پر کرب و جزا کا اظہار کرنا برا ہے مگر امام حسین -کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ان کی مصیبت پر کرب و جزا برا نہیں ہے۔ اسی لئے ائمہ اطہارؑ نے ہمیشہ سوگ و مصیبت کے اظہار کیلئے آپ کی مصیبت کا انتخاب کیا' آپؑ کی زیارت اور آپؑ کی مصیبت پر گریہ و زاری کو ہمیشہ ترجیح دی لہٰذا معصومؑ زیارت کے فقرات میں امام حسین -سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آپ کی مصیبت ہمارے اوپر تمام مصیبتوں سے بڑھکر اور تمام اہل سماوات سے بلند اور زیادہ ہے"[۱]

۱[کامل الزیارات باب ۷۱، ۷۶، روایت ۸]

حضرت امیر المومنینؑ نے امام حسینؑ کی شان میں خطاب کر کے فرمایا:

"اے وہ ہستی جسکا نام ہمیشہ ہر مومن کی آنکھ میں باعث اشک ہوگا"[۱]

امام حسن مجتبیٰ -نے فرمایا:

"مجھے جو زہر دیا گیا ہے' میں اس سے قتل ہوں گا لیکن آپ (حسینؑ) کی مصیبت کے دن کے مانند مصیبت کا کوئی دن نہ ہوگا"[۲]

خود ابی عبد اللہ الحسین -نے فرمایا:

"مجھے رونے کیلئے قتل کیا گیا ہے' مومن مجھے یاد نہیں کرتا مگر اپنی آنکھوں سے اشک جاری کئے بغیر"[۲]

حضرت امام سجاد -نے فرمایا:

"میں اس کا فرزند ہوں جس پر آسمان نے آنسو بہایا' میں اس کا فرزند ہوں جس پر جنوں نے زمین پر نوحہ پڑھا ہے اور پرندے ہوا میں نوحہ کناں ہوئے"[۳]

حضرت امام محمد باقر -نے فرمایا:

"آسمان نے حضرت یحییٰ کے بعد کسی اور پر اتنا گریہ نہیں کیا سوائے امام حسینؑ کے۔ امام حسینؑ پر آسمان نے چالیس دن گریہ کیا"[۴]

حضرت امام جعفر صادق -نے فرمایا:

"رونا' گریہ کرنا مکروہ ہے بندے کیلئے مگر حسینؑ پر رونے میں اجر ہے"[۵]

۱[بحار الانوار ج۴۴، ص۲۸۰]

۲[امالی صدوق ص۱۱۶، بحار الانوار ج۴۵، ص۲۱۸، مسیر الاحزان، ص۹، عوالم ج۱۷، ص۱۵۴، لہوف ص۴۵]

۳[امالی صدوق ص۱۳۷، کامل الزیارات ص۱۰۸، بحار ج۴۴، ص۲۸۴، عوالم ص۵۳۶، اثبات الهدیٰ جلد دوم ص۵۸۲]

۴[بحار الانوار ج۴۵، ص۴۷۱، عوالم ص۴۸۵] ۴[کامل الزیارات ص۹۰، بحار ج۴۵، ص۲۱۱، عوالم ص۴۶۹]

۵[کامل الزیارات ص۱۰۰، بحار ج۴۴، ص۲۹۱، عوالم ص۵۳۳]

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں امام رضاؑ نے فرمایا:

"جب محرم کا مہینہ آتا تو میرے والد ہنستے ہوئے نظر آتے تھے نہ خوشی و مسرت میں حزن و ملال ان پر ہر وقت طاری رہتا تھا یہاں تک کہ روز عاشورا آ جاتا۔ وہ دن ان کے لئے روزِ حزن و گریہ ہوتا تھا۔ آپؑ فرماتے تھے:

"آج کا دن وہ دن ہے جس میں حسینؑ شہید ہوئے"۔[۱]

حضرت امام رضاؑ نے فرمایا:

"حسینؑ کا دن ہماری آنکھوں کو خستہ اور زخمی کرتا ہے اور انکی مصیبت نے ہمارے آنسو جاری کئے۔ ہمارے عزیزوں کو اس سرزمین پر خواری و ذلت اٹھانی پڑی۔ اس دن نے ہمیں ہمیشہ کیلئے غمگین رکھا"۔[۲]

امام جوادؑ نے فرمایا:

"شب ۲۳ رمضان المبارک شب قدر ہے۔ خداوند متعال اس رات ہر چیز کا انتظام فرماتا ہے جو شخص اس رات امام حسینؑ کی زیارت کرے گا اس سے چالیس ہزار ملک مصافحہ کریں گے جو زمین پر امام حسینؑ کیلئے نازل ہوتے ہیں"

حضرت امام علی نقیؑ کا فرمان ہے:

"ہر وہ شخص جو اپنے گھر سے بقصد زیارت امام حسینؑ نکلتا ہے اسے چاہئے کہ نہر فرات جائے' وہاں غسل کرے' خداوند عالم ایسے شخص کا نام نجات پانے والوں میں لکھ دیتا ہے۔ جب وہ آپؑ کو سلام کرتا ہے تو نجات پانے والوں میں شمار ہوتا ہے' جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو کوئی ملک کہتا ہے پیغمبرؐ نے تمہیں سلام کہا ہے اور پیغام بھیجا ہے کہ خدا نے تمہارے گناہوں کو بخش دیا ہے' اب اسی عمل کو بجا لاؤ"۔[۳]

امام حسن العسکریؑ ۳ شعبان کے دن بارگاہ خدا میں دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ [امالی صدوق ص ۱۲۸، بحار ج ۴۴ ص ۲۸۴، عوالم ص ۵۳۸]

۲۔ [امالی صدوق ص ۱۲۸، بحار ج ۴۴ ص ۲۸۴، عوالم ص ۵۳۸]

۳۔ [وسائل الشیعہ ج ۱۰، باب ۵۹، حدیث ۱۰، کامل الزیارات ص ۱۸۵، ۱۸۶]

"خداوندا آج کے دن اس مولود کا واسطہ جس کی ولادت سے پہلے اس کی شہادت کی خبر دی گئی' آسمان و اہل آسمان اور زمین و اہل زمین جس کی مصیبت میں روتے ہیں۔ امامت کو تو نے ان کی نسل میں باقی رکھا ہے اور ان کی تربت میں شفا رکھی ہے"۔[۱]

حضرت حجت امام زمان عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف ارواحنالك الفدا فرماتے ہیں:

"اگر زمانے نے میرے ظہور میں تاخیر ڈالی' مجھے آپ کی نصرت سے باز رکھا اور آپ کے دشمنوں سے جنگ نہ کر سکا تو میں ہر صبح و شام آپؑ پر نوحہ پڑھوں گا' آپؑ کے غم میں آنسو جاری رکھوں گا بلکہ آنسوؤں کے بجائے خون جاری بہاؤں گا"۔[۲]

روایات متواترہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انبیاء و ائمہ کے نزدیک دنیا کے تمام صاحبان مصیبت میں سب سے زیادہ صاحب مصیبت امام حسینؑ ہیں لہٰذا آپؑ کی مصیبت کا ذکر بھی دیگر مصیبتوں پر مقدم ہے۔ ان روایات سے امام حسنؑ کے مصائب سے متعلق کچھ اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں:

(۱) زمانی پہلو:

پورے سال میں مصیبت حسینؑ کو منانے کیلئے ماہ محرم کا پہلا عشرہ مختص کیا گیا ہے اور خود اس میں بھی آخری تین دن ہیں اور ان تین دنوں میں یوم عاشورا ہے لہٰذا ماہ محرم کے ابتدائی دس دنوں کے علاوہ دیگر دنوں میں غم حسینؑ کے حوالے سے معمولات زندگی پر پابندیاں عائد کرنا اور شمسی مہینے مثلاً ماہ اسد کو عاشورا کے طور پر منانا ایک لحاظ سے مصیبت امام حسینؑ کے زمان میں تحریف کے مترادف ہے۔

(۲) مکانی پہلو:

تمام روئے زمین پر ائمہ اطہارؑ نے اظہار مصیبت کیلئے جس مکان کا انتخاب کیا ہے وہ کربلا کی زمین ہے اور کربلا میں بھی وہ مقام جو آپؑ کے زیر قبہ ہے۔

اس حوالہ سے دنیا کے گوشہ و کنار میں آپؑ کی ضریح کی تمثیل بنا کر وہاں زیارت کرنا' قبہ حسینؑ میں ضریح

۱۔ [مفاتیح الجنان اعمال سوم شعبان] ۲۔ [بحار الانوار ج ۹۸، ص ۳۲۰]

حسینؑ کی تحریف کے مترادف ہے۔

(۳) ناصران حسینؑ کی مصیبت:

یہ آپ ہی کی مصیبت کی شعاع اور اسی کا کرشمہ ہے کہ انصار کی مصیبت بھی عظیم اور رلائق و سزاوارِ گریہ وزاری قرار پائی ہے۔ایسا اسلئے ہے کہ وہ آپؑ کے انصار و یاور تھے۔

(۴) زینب =کی مصیبت:

جناب سیدہ زینب =کی مصیبت پر گریہ کی وجہ یہ ہے کہ آپ سید الشہداءؑ کی بہن ہیں اور قیامِ امامؑ کی راہ میں اسیر ہوئیں۔جناب سکینہؑ کی مصیبت پر گریہ بھی اسی لئے ہے کہ آپ امامؑ کی عزیز،مصیبت زدہ اور مظلومہ بیٹی ہیں۔

(۵) مصائب کی نوعیت:

کربلا کے تمام شہداء،تمام انصار و جوانان بنی ہاشم اور تمام اسراء ہر ایک پر گزرنے والی مصیبت خود اس فرد کی مصیبت ہے اور اس کے علاوہ امامؑ کی مصیبت بھی ہے۔اب ذرا حسینؑ کی مصیبت کا جائزہ لیجئے۔حسینؑ کی مصیبت وہ سب کچھ بھی ہے جو آپؑ پر گزری اور اس کے علاوہ تمام شہداء و اسراء پر گزرنے والی مصیبتیں بھی آپؑ کی مصیبت ہے۔اگر تعداد کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو آپؑ پر ایک سو سات مصیبتیں ٹوٹی ہیں جبکہ دوسروں میں سے ہر ایک پر دو،تین مصیبتیں گزری ہیں،اپنی مصیبت،اپنے عزیز کی مصیبت اور آپؑ کی مصیبت۔

(۶) زخم کی مصیبت:

زخم زبان و زخم تیر و سنان سب سے زیادہ آپؑ پر پڑے۔چنانچہ دیگر تمام افراد سے زیادہ مصیبت زخم بھی آپ نے اٹھائے۔

(۷) تشنگی کی مصیبت:

کربلا میں سب سے زیادہ تشنگی آپؑ پر غالب تھی تاریخ میں ہے کہ آپؑ اس حد تک پیاسے تھے کہ آپؑ کو آسمان دھندلا نظر آتا تھا اسی لئے تمام ائمہ ؑ نے کربلا کے پیاسوں میں سب سے زیادہ آپؑ کی پیاس کا ذکر کیا اور اپنے ماننے والوں کو بھی یہی تاکید کی کہ حسینؑ کی پیاس کا ذکر کیا کرو لہٰذا امام حسین -کے مقابلے میں کسی اور کو پیاسا قرار دینا امام حسین -کی مصیبت تشنگی میں تحریف ہے۔

(۸) جعلی مصائب کو ترجیح دینا:

واقعہ کربلا میں تمام مصیبتوں کا مرکز حسینؑ ہیں اس لئے عزاداری ابی عبد اللہؑ میں اس بات کا پاس رکھنا ضروری ہے کہ کربلا کے کسی بھی کردار کے مصائب کا بیان خود ابی عبد اللہ الحسین -کو فراموش کر دینے کا سبب نہ بن جائے۔کربلا کے شہداء اور اسراء پر گزرنے والے مصائب یاد کر کے رونا اور ان کے لئے نوحے و مرثیے کہنا ایک مستحسن عمل ہے لیکن ایسے مصائب جعل کرنا جو اُن پر گزرے ہی نہ ہوں،درحقیقت مصیبت میں تحریف ہے اور اصل مصیبت پر پردہ ڈالنے کی سازش ہے۔

اسی طرح شہداء اور اسراء کے علاوہ کسی شخصیت کو عنوان بنا کر یا فرضی نام جعل کر کے مصائب گھڑنا بھی اصل مصیبت حسینؑ کو پس پشت ڈالنے کی بدترین سازش ہے۔امامؑ کی مصیبتوں میں فروعات کو اصل پر ترجیح دینے اور اصل و فرع دونوں سے ہٹ کر مفروضوں اور خود ساختہ مصیبتوں کو جعل کرنے کے عمل پر سے تاریخی اسناد کی روشنی میں پردہ اٹھانا ہماری اس کتاب کا مقصد ہے تا کہ مصائب امام حسین -میں مرکزیت حسینؑ کی مصیبت کو حاصل ہو اور اس کے بعد جہاں جہاں بھی مصیبتِ حسینؑ کی شعاع پہنچتی ہے،ان کا ذکر آئے۔

مصیبت میں جھوٹ

بعض حضرات عزاداری میں خلاف واقعہ جھوٹی کہانیاں بیان کرنے کے جواز میں یہ منطق پیش کرتے ہیں کہ اس سے نہ تو کوئی حلال حرام میں تبدیل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی حرام حلال ہو جاتا ہے۔ یہ منطق تمام مسالک اسلامی کے نزدیک اسلام کے بنیادی نظریات کے خلاف ہے۔ علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ ہمارے تمام گفتار و کردار اور قول و فعل، چاہے وہ شعوری طور پر سرزد ہوں یا لاشعوری طور پر، اضطراری حالت میں انجام پاتے ہوں یا عام حالات میں، ان پانچ حالات سے خارج نہیں جنہیں احکام خمسہ بھی کہا جاتا ہے:

۱۔ وہ افعال جو خدا نے ہم سے طلب کئے ہیں اور جنہیں ترک کرنے کی صورت میں اس نے عتاب و سزا کا وعدہ دیا ہے یہ افعال "واجب" کہلاتے ہیں۔

۲۔ وہ افعال جنہیں خدا نے ہم سے طلب تو کیا ہے لیکن ترک کرنے کی صورت میں کوئی سزا و عقاب نہیں ہے ایسے افعال "مستحب" کہلاتے ہیں۔

۳۔ وہ افعال جن کو انجام دینے سے منع کیا ہے اور انجام دینے کی صورت میں سزا اور عقاب کا وعدہ دیا ہے "حرام" کہلاتے ہیں۔

۴۔ وہ افعال جن کے انجام دینے سے منع تو کیا ہے لیکن انجام دینے پر کوئی سزا معین نہیں ہے نہ تو انجام دینے میں کوئی ثواب ہے اور نہ ترک کرنے میں کوئی گناہ ایسے افعال کو "مکروہ" کہتے ہیں۔

۵۔ وہ افعال جن کے انجام دینے اور ترک کرنے سے متعلق حکم کا پتہ نہ ہو "مباح" کہلاتے ہیں۔

(الف) نص آیات قرآن و روایات معصومینؑ کے تحت جھوٹ بولنا حرام ہے۔ خصوصاً اگر جھوٹ کی نسبت خدا، رسول اور آئمہ کی طرف ہو تو اس کی حرمت میں اور شدت آ جاتی ہے لہٰذا اگر انسان روزہ کی حالت میں ایسا جھوٹ بولے تو نہ صرف یہ کہ اسے روزہ باطل ہو جاتا ہے بلکہ یہ کفارہ کا بھی موجب بنتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ امام حسینؑ، امام سجادؑ اور خاندانِ عصمت و طہارت سے طرح طرح کی جھوٹی کہانیاں نسبت دی

جائیں اور وہ جھوٹ کے زمرے میں نہ آئیں۔ جھوٹ کو جھوٹ سمجھتے ہوئے جائز قرار دینا، آیا حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینے کے مترادف نہیں ہے؟۔

(ب) بعض حضرات کا خیال ہے کہ ذکر مصائب میں کسی کتاب کا حوالہ دے کر مصیبت بیان کر دینا، صحیح اور کافی ہے اور اس میں کسی قسم کی تحقیق کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ منطق بھی پہلے کی طرح واہیات ہے اگر اس منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایسی بہت سی روایات جو دشمنان اہل بیت کی فضیلت کے بارے میں ہماری کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، یا وہ روایات جو آئمہ کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں، سب جائز قرار پائیں گی اور ان کو بھی "دروغ بر گردن راوی" کہہ کر بغیر کسی تحقیق اور سند کے بیان کر دینا، صحیح اور جائز ماننا پڑے گا۔

(ت) بعض مؤرخین و محققین غیر مستند تاریخی اسناد کو غیر مستند قرار دینے کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اپنے مدعا کیلئے یہ منطق پیش کرتے ہیں کہ ثبت تاریخ میں تعصب، سیاست، سہو و نسیان، تساہل اور ضیاع و کشیدگی کی وجہ سے بہت سی روایات ہم تک نہیں پہنچی ہیں لہٰذا کسی بھی تاریخی سند کو یہ کہہ کر کہ وہ مستند نہیں ہے، مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اس منطق کا بھی بے بنیاد ہونا اظہر من الشمس ہے کیونکہ تاریخ کے سمندر میں بہت سے حقائق کے ضائع ہونے یا ثبت نہ ہونے کو جواز بنا کر ہر قیل و قال کو یہ احتمال دینا کہ ممکن ہے کہ یہ بھی ان ضائع شدہ روایات میں سے ہو، عقلاً صحیح نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی روایت ان غیر مستند تاریخی نصوص سے پہلے کی ہو یا اسی دور کی کسی کتاب، کتابخانہ یا شخصیت سے اس کے بارے میں سند فراہم ہو جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ مستند ہے۔

کربلا میں اہل البیت یا آلِ البیت

کربلا میں برپا ہونے والے معرکۂ حق و باطل کے مقدس اہداف و مقاصد سے لوگوں کو غافل رکھنے کیلئے مختلف حربے بروئے کار لائے گئے ہیں۔ کبھی اس جنگ کے محرکات و مضمرات کی علت اقتصادیات کو قرار دینے کی کوشش کی گئی تو کبھی اسے دیرینہ خاندانی عداوت و دشمنی کا نتیجہ قرار دیا گیا اور کبھی اعتقادی حوالہ سے فلسفہ گرائی کرتے ہوئے اس عظیم سانحہ کو جبرِ الٰہی کہہ کر فریقین کو مسلوب الارادہ قرار دینے کی کوشش کی گئی۔

اس عظیم واقعہ کے حقیقی اہداف سے لوگوں کو بے توجہ رکھنے کی خاطر ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ بعض گمنام اور مجہول انسانوں سے منسوب کر کے غیر واقع مصائب گڑھ لئے گئے حالانکہ ان کرداروں کا نام و نشان بھی کسی مستند تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان افسانوی کرداروں کے نام پر کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے، بڑی بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، اُن کے ذکر کے لئے مخصوص دنوں کا تعین ہوتا ہے، ان کے نام پر آنسو بہائے جاتے ہیں، فریاد و فغان بلند کی جاتی ہے اور سینہ کوبی کی جاتی ہیں۔ لیکن جن گھرانوں نے اپنی حیات و جوانی، غرض اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر خود کو اس دشت و بیابان میں پہنچا کر مثل پروانہ جلا دیا اور اس طوفان بلا خیز میں اپنے آپ کو ڈبو دیا، انکا نام تک نہیں لیا جاتا۔ یہ کیسی احسان فراموشی اور کیسی حق شناسی ہے؟۔

قیامِ امام حسین ۔ ظالم کے خلاف اور مظلوم کی حمایت میں تھا عزاداران حسینؑ خود کو محافظ عزاداری گردانتے ہیں لہٰذا انکا فرض بنتا ہے کہ عزاداری میں شامل کئے گئے مجہول، گمنام اور جعلی مظلوموں کے ناموں کو اس سے نکال کر حقیقی مظلوموں اور مصیبت زدوں کو سامنے لائیں تاکہ صحیح معنوں میں مظلوم کے حامی کہلانے کے حقدار بن سکیں اور حق شناس کہلائے جا سکیں۔

اس مقدس ہدف کے حصول کو آسان بنانے کی خاطر ہم اس کتاب میں پہلے ان گمنام و مجہول النسب ناموں کی ایک فہرست پیش کریں گے جن کو آل الحسینؑ سے باہر نکالنا ہے کیونکہ حقیقت میں انکا امام حسین ۔ کی آل پاک سے کوئی ربط نہیں۔ اپنے موقف کی تائید میں ہم مبین و محکم دلائل پیش کریں گے۔ اس کے بعد ہم حقیقی آل الحسین

یا بالفاظ دیگر ان گھرانوں کا ذکر کریں گے جنھیں حسینؑ کا پروانہ بننے کا افتخار حاصل ہے۔ یہ پاک و پاکیزہ اسماء تمام مستند کتبِ تواریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں عزادارانِ حسینؑ کے حضور جو باتیں بیان نہیں کی جاتی ہیں ہم انہیں سامنے لائیں گے۔ اس موضوع کے بیان کے لئے ہم نے جو سرنامہ کلام منتخب کیا ہے وہ ہے "کربلا میں اہل البیت اور آل البیت" یعنی وہ گھرانے اور ہستیاں جو اس معرکۂ حق و باطل میں آل الحسینؑ کہلانے کی مستحق ہیں ہم اس مقام پر انہیں ایک تسلسل ترتیبی کے ساتھ پیش کرینگے، لیکن اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "اہل البیت اور آل البیت" کے معنی اور مفہوم و مصداق اور ان کے فرق کو سمجھ لیا جائے۔

اہل البیت

اہلبیت یعنی گھر والے یا گھر کے لوگ۔ کتاب "جامع الرموز" اور کتاب "وصیت" سے استفادہ کرتے ہوئے صاحب "کشف اصطلاحات" نے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اہل الرجل ہیں کسی شخص کے قریب ترین اور مخصوص ترین فرد یا افراد۔

انسان کی سب سے قریب ترین ہستی اس کی بیوی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ افراد آتے ہیں جو اس کے واجب النفقہ ہوں یعنی جنکی سرپرستی اور کفالت اس کے ذمہ ہو۔ ان اشخاص میں اس کے ماں باپ، اولاد، بھائی، چچا، غلام، نوکر وغیرہ سب شامل ہیں چنانچہ جو بھی افراد انسان کے دائرۂ سرپرستی میں آتے ہیں وہ سب اس کے اہل ہیں، چاہے وہ اس سے نسبی تعلق رکھتے ہوں یا سببی۔

دائرۂ اہل میں تیسرے مرحلہ پر اہل مکان آتے ہیں جیسے: اہل پاکستان، اہل پنجاب، اہل سندھ، اہل محلّہ وغیرہ، وغیرہ...... اس کے علاوہ لفظ اہل کے کچھ اور مصادیق بھی ہیں مثلاً

زمانہ کی طرف نسبت ہوتی ہے جیسے: اہل قرون وسطیٰ، اہل قرون بادیہ۔

دین و مذہب کی نسبت سے جیسے: اہل اسلام، اہل نصاریٰ، اہل دین۔

کتاب کے حوالے سے مثلاً: اہل قرآن، اہل کتاب۔

علم و فکر کی نسبت سے جیسے: اہل علم، اہل فکر۔

غرض اہل کے زمرے میں ہر وہ شخص آئے گا جو کسی نہ کسی نسبت' سبب اور بہانے سے کسی سے مربوط ہو۔

اہل لغت کہتے ہیں کہ یوں "آل" کے مقابلہ میں "اہل" زیادہ عام ہے۔ لیکن بعض اہل لغت نے دونوں کا مادہ ایک ہی بتایا ہے۔ انکا کہنا ہے کہ آل اور اہل دونوں کی اصل "اہل" ہے کہتے ہیں اہل کی "ہ" الف سے تبدیل ہوئی تو وہ "الف" ہو گئے۔ چونکہ وہ الف ملا کر پڑھنا دشوار گراں تھا اس لئے یہ لفظ مقلب بہ "آ" ہو گیا اور اس طرح "آل" بن گیا۔ اس نظریہ کے حق میں دلیل دیتے ہوئے علمائے لغت فرماتے ہیں کہ اگر کسی کلمہ کی تصغیر بنائی جائے تو اس کا اصل مادہ سامنے آجاتا ہے اگر اہل کی تصغیر بنائی جائے تو "اوہیل" یا "اویل" بنتا ہے اسی طرح صاحب قاموس قرآن نے مفردات راغب سے نقل کیا ہے کہ آل اہل کا مقلوب ہے۔

صاحب قاموس و مفردات کے مطابق آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ اہل عمومی لفظ ہے اور آل مخصوص۔ ہر وہ شخص جو کسی سے مختصری بھی نسبت رکھتا ہو اس کا اہل کہلائے گا' چاہے وہ کتنا ہی کم حیثیت کیوں نہ ہو۔ زمان و مکان سے منسوب افراد کے لئے بھی لفظِ اہل استعمال ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ لفظ اپنے اندر عمومیت رکھتا ہے لیکن "اہل بیت نبوت" میں صرف معصومین شامل ہیں' کوئی غیر معصوم اہل بیت نبوت میں نہیں آسکتا۔ مخصوص آیات کریمہ اور روایات متواترہ نے اس سلسلے میں حصر بندی کر دی ہے۔

آل البیت

"آل" صبح کے نمودار ہونے والے سراب کو کہتے ہیں۔ بعض علماء نے خیمہ نسب کرنے کے لئے کھڑے کئے جانے والے ستون کو آل کہا ہے۔ آل کی جمع اوال ہے۔ عرف عام میں اہل و عیال کو آل کہتے ہیں۔ فارسی زبان میں آل سے مراد وابستگان یا متعلقین ہیں۔

لفظِ "آل" کا اصل "اہل" ہے اس سلسلہ میں دلیل پیش کرتے ہوئے علماء لغت فرماتے ہیں کہ "اہل" کی تصغیر "اوہیل" ہے اور کلمۂ تصغیری برگشت ہمیشہ اپنے مادہ کی طرف ہوتی ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ "آل" اہل کا مقلوب ہے چنانچہ صاحب عقرب الموردکہتے ہیں کہ آل تصغیر "اوہیل" بھی ہے اور "اویل" بھی۔ صاحب کشاف اصطلاحات کے مطابق آل کی اصل "اویل" ہے۔

آل کا لفظ اشراف' بزرگان' صاحب حیثیت و اقتدار' انبیاء' اوصیاء' ائمہ' علماء اور بادشاہوں سے یا ان کے افکار سے وابستہ انسانوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اجتماعی حیثیت نہ رکھنے والے مجہول انسانوں کیلئے یا زمان و مکان سے منسوب لوگوں کے لئے لفظِ آل استعمال نہیں ہوتا۔

دائرۂ فرہنگ قرآن جلد دوم میں حرف الف کے باب میں صفحہ ۳۶۵ پر نقل ہے کہ قرآن کریم میں چھبیس مقامات پر' چودہ سوروں اور تیئس آیتوں میں اس کلمہ کا ذکر ہوا ہے۔

قرآن کریم میں چھ انبیاء کی اسمائے گرامی کے ساتھ لفظِ آل استعمال ہوا ہے: آل ابراہیمؑ' آل لوطؑ' آل یعقوبؑ' آل موسیٰؑ' آل ہارونؑ اور آل داؤدؑ۔ یہ کلمہ اولیاء اللہ اور نبی اللہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ فقرات زیارات میں "آل اللہ" کہا گیا ہے۔ بادشاہان' سلاطین' ان کے فرزندوں اور ان کی پیروی کرنے والے وابستگان کو بھی آل کہہ کر خطاب کیا گیا ہے جیسے آل فرعون۔ وہ آیات کہ جن میں انبیاء کے ناموں کے ساتھ لفظ "آل" استعمال ہوا ہے یہ ہیں:

سورۂ آل عمران آیت ۳۳' سورۂ حجر آیات ۵۹' ۶۰' ۶۱' ۶۲' سورۂ نساء آیت ۵۴' سورۂ نحل آیت ۵۶' سورۂ قمر آیت ۳۴' سورۂ مریم آیت ۶' سورۂ بقرہ آیت ۲۴۸' سورۂ سبا آیت ۱۳۔

فرعون کے نام کے ساتھ لفظِ آل قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں آیا ہے:

سورۂ بقرہ آیت ۴۹' ص آیت ۱۴۱' ابراہیم آیت ۶' بقرہ آیت ۵۰' انفال آیات ۵۲' ۵۴' آل عمران آیت ۱۱' اعراف آیت ۱۳۰' القصص آیت ۸' غافر آیت ۲۸' مومن آیات ۴۵' ۴۶۔

تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۲۹۰ پر راغب اصفہانی سے نقل ہے کہ لفظ آل "اہل" سے لیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "آل" بزرگ' شریف اور عظیم ہستیوں سے نزدیک یا وابستہ افراد کو کہتے ہیں جبکہ "اہل" اس سے وسیع تر معنی میں آتا ہے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ "آل" صرف انسانی وابستگی کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے جبکہ "اہل" زمان و مکان وغیرہ کیلئے بھی مستعمل ہے۔

گھرانے کو "اہل" اور جو نسب سے مربوط ہو' اسے "آل" کہتے ہیں چنانچہ آبا و اجداد اور ذوی القربیٰ کیلئے

”آل“ استعمال ہوتا ہے۔صاحب مفردات کہتے ہیں کہ آل کیلئے اسم کا ہونا ضروری ہے یعنی آل ہمیشہ اس سے منسوب ہوتا ہے۔

صاحب جامعہ رموز کہتے ہیں کہ ”آل“ کا استعمال مختص بہ انبیاء واولیاء ہے ۔اس کے علاوہ یہ لفظ بادشاہوں سے منسوب کر کے استعمال ہوتا ہے جبکہ ناشناس زمان ومکان کی طرف اسکا اضافہ نہیں ہوتا جیسے آل محمدؐ آل ابراہیمؑ آل عمران‘ آل فرعون‘ وغیرہ ۔یہاں پر برتر کی طرف اضافہ ہے‘ کمتر کی طرف نہیں ۔اس کے برعکس آل الرجل‘ آل مصر وغیرہ کبھی نہیں کہا جاتا ۔برخلاف اس کے لفظ اہل عمومیت رکھتا ہے جیسے اہل زبان‘ اہل مکان‘ اہل اللہ وغیرہ۔

صاحب مجمع البیان کا کہنا ہے کہ آل واہل دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اہل عام ہے جیسے ”اہل بصرہ“ کہا جاتا ہے ”آل بصرہ“ نہیں ۔”آل خیمہ“ خیمے کے ستون کو کہتے ہیں ”آل الجبل“ کا مطلب ہے کسی پہاڑ کے اطراف کی پہاڑیاں ۔کسی انسان کے نزدیک ترین فرد یا افراد کو آل کہتے ہیں خواہ یہ قربت نسبی ہو یا دوستی کی بنا پر ہو لہٰذا ”آل النبی“ سے مراد امت پیغمبر نہیں بلکہ اس سے مراد نبی کی شریعت کا اقامہ کرنے والے ہیں ۔اسی طرح صاحبان علم ومعرفت کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بھی ان کی آل کہا جاتا ہے۔

اہل وآل کے معنی وفرق واضح ہونے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ کربلا کی جنگ آل اللہ‘ آل الرسول اور آل النبی کی آل سلاطین وحکمران باطل کے مقابلے میں تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ نے لشکر عمر سعد کو ”یا آل ابی سفیان“ کہہ کر مخاطب کیا ۔اسی طرح فقرات زیارت میں بھی ان ظالمین کو ”آل ابی سفیان‘ آل ابن زیاد اور آل مروان“ کہا گیا ہے۔

لفظ آل کے استعمال کے مواقع واضح وروشن ہو جانے کے بعد اب ہم یہ بیان کرینگے کہ معرکۂ کربلا میں شامل افراد میں کون کون آل البیت میں شامل تھے اور کون شامل نہیں تھے ۔یہ تمام باتیں تاریخی استناد کے ساتھ پیش کی جائینگی ۔آل الحسینؑ میں آل عبدالمطلب‘ آل ابی طالب‘ آل محمدؐ اور وہ صاحبان عزت وافتخار شامل ہیں جنکا سلسلۂ نسب دیگر خاندانوں سے ملتا ہے ان سب کا تذکرہ ترتیب وار کیا جائے گا۔

found.

آلِ ابراہیم %

کلمۂ ابراہیم سریانی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کے معنی پدرِ مہربان کے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ کلمہ ۲۵ سوروں میں ۶۹ بار آیا ہے۔ دنیا میں اسلام، مسیحیت اور یہودیت، تین مشہور و معروف اور رائج ادیان ہیں۔ ان تینوں کا نقطۂ التقا اور بر گشت حضرت ابراہیمؑ کی طرف ہے آپ کے القاب میں ابوالانبیاء، ابوالضعیف، شیخ الانبیاء، خلیل اللہ اور خلیل الرحمن بہت مشہور رہیں۔

بچپن سے لیکر بڑھاپے تک آپ کی زندگی کے مختلف ادوار کا ۲۵ سورتوں میں ۱۹۵ بار ذکر ہوا ہے۔ ایک مکمل سورہ آپ کے نام سے منسوب ہے جو ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا چودھواں سورہ ہے۔ آپ نے تقریباً دو سال قبل مسیح اس دنیا میں زندگی بسر کی ہے۔ آپ کی جائے ولادت شہر بابل ہے جو دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان واقع تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کا شمار اولوالعزم انبیاء میں ہوتا ہے آپ تاجِ اصفیاء ہیں آپ پر بیس صحیفے نازل ہوئے۔ مہمان نوازی، ختنہ کرنا، استنجاء کرنا، مسواک کرنا، استنشاق کرنا، موانقہ کرنا اور مصافحہ کرنا سب آپ کی سنت ہیں۔ سب سے پہلے ہجرت بھی آپ ہی نے کی تھی۔ اس دارِ فانی میں دو سو (۲۰۰) سال زندگی گزارنے کے بعد آپ نے مزرعہ حمرون میں وفات پائی۔

ایک وقت ایسا آیا جب آپ اور آپ کی زوجہ جناب سارہ کو اولاد کی امید نہ رہی جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۰ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس موقع پر جناب سارہ نے آپ سے عرض کی کہ اب مجھ سے اولاد کا ہونا ممکن نہیں ہے اگر آپ اولاد کی خواہش رکھتے ہیں تو میں اپنی کنیز ہاجرہ کو ہبہ کرتی ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

اپنی رحمت سے جناب ہاجرہ سے حضرت اسماعیلؑ جیسا فرزند عطا فرمایا۔ لیکن ہوا یہ کہ جناب سارہ کو یہ بات پسند نہ آئی اور وہ ہاجرہ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کو اپنے سامنے دیکھنا نہیں چاہتی تھیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ جناب ہاجرہ کو ایک نامعلوم مقام کی طرف لے کر چل پڑے اور موجودہ خانہ کعبہ جس مقام پر ہے، وہاں پہنچ کر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت تک خانہ کعبہ کی بنیاد نہیں رکھی گئی تھی۔ قرآن مجید میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں اس واقعہ کا ذکر ہوا ہے۔

سورۂ انعام کی آیت ۸۴ میں ذکر ہے کہ خداوند عالم نے جناب اسماعیلؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو آپ کی زوجہ جناب سارہ سے بھی ایک فرزند عطا فرمایا جنکا نام اسحاقؑ ہے نسل بنی اسرائیل حضرت اسحاقؑ سے پھیلی ہے اور حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ پیدا ہوئے۔

found.

آلِ عبدالمطلب

جناب عبدالمطلب حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہیں آپ کا اصلی نام شیبۃ الحمد ہے جس کے معنی ہیں لائق تعریف بوڑھا۔ کہتے ہیں کہ آپ کے بال ولادت کے وقت سے ہی سفید تھے۔

آپ کی کنیت ابوالحارث ہے لیکن عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے مؤرخین لکھتے ہیں کہ آپ اپنے والد جناب ہاشم کی وفات کے موقعہ پر یثرب میں تھے۔ جناب ہاشم نے اپنی وفات کے وقت اپنے بھائی مُطلب کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ انکا بھتیجا یثرب میں ہے' اسے مکہ لے آئیں۔ جب مُطلب اپنے بھتیجے کو کہ جو مدینہ کے قبیلہ بنونجار سے تعلق رکھتے تھے' اپنی سواری پر پیچھے بٹھا کر لا رہے تھے تو راستہ میں جو کوئی بھی پوچھتا اس سے کہتے کہ یہ میرا عبد (غلام) ہے۔ مکہ پہنچنے کے بعد آپ نے بتایا کہ میرے بھائی کا بیٹا ہے اس وجہ سے آپ عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔

خضاب کو سب سے پہلے رواج دینے والے عبدالمطلب ہیں۔ آپ نے ۱۴۰ سال عمر پائی آپ کو اللہ تعالیٰ نے بارہ (۱۲) فرزند عطا فرمائے جنکے نام یہ ہیں:

(۱)۔عبداللہ: پدرگرامی رسولِ خداؐ۔

(۲)۔ابوطالب۔

(۳)۔زبیر۔

(۴)عبدالکعبہ۔

ان چاروں کی ماں فاطمہ بنت عمرو بن عابد بن عمران بن مخزوم ہیں۔

(۵)۔عباس

(۶)۔ضرار

ان دونوں کی ماں نتیلہ بنت جناب ہیں جو نمر بن قاسط کی نسل سے تھیں۔

(۷)۔حمزہ

(۸)۔مقوم

(۹)حجل

ان تینوں کی ماں ہالہ بنتِ اہیب تھیں۔

(۱۰)۔ابولہب

(۱۱)قثم

(۱۲)۔غیدق

found.

آلِ ابی طالبؑ

آپکا اصل نام عبد مناف ہے اور ابی طالب کنیت ہے ۔ آپ کے فرزند عبد المطلب اور برادر جناب عبداللہ' والد گرامی خاتم النبیینؐ ہیں ۔ بعض نے آپ کا نام عمران بتایا ہے لیکن اس روایت کو علمائے انساب نے ضعیف قرار دیا ہے بعض نے ابی طالب کو آپکا اسم قرار دیا ہے بہر حال ابی طالب کنیت ہو یا اسم' عالم انساب میں یہی نام معروف ہے اور اسی نام سے آپ پہچانے جاتے ہیں ۔

حضرت ابو طالب صاحب شرافت اور کثیر فضائل و مناقب کے حامل ہیں لیکن آپ کی سب سے بڑی فضیلت کفالت رسول اللہؐ ہے یہ فضیلت صرف بچپن میں کفالت کرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک متفقہ حقیقت ہے کہ منصب نبوت و رسالت کی کفالت کا افتخار بھی آپ ہی کو حاصل ہے ۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اس راہ میں آپ کو بہت سی مصیبتیں جھیلنا پڑیں' جس میں شعب ابی طالب میں تین سال کے طویل محاصرے اور بائیکاٹ کا دور بھی شامل ہے ۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام اہل قریش نے ملکر آپ سے مطالبہ کیا کہ حضرت محمدؐ کو ان کے سپرد کر دیں ۔ آپ نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا: کسی بھی حالت میں محمدؐ کو نہ تمہارے حوالے کروں گا اور نہ ہی انہیں تنہا چھوڑوں گا ۔

حضرت ابو طالب کے چار فرزند تھے: طالب، عقیل، جعفر اور علیؑ ۔ ان سب کے مابین دس دس سال کا فرق تھا ۔ طالب سب سے بڑے اور علیؑ سب سے چھوٹے تھے اس طرح طالب اور علیؑ کی عمر میں تیس سال کا فرق تھا بڑے فرزند کے نام کی مناسبت سے ہی آپ کی کنیت ابو طالب مشہور ہوئی ۔

آپ کے چاروں بیٹے فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف بن ہاشم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ابو طالب کے فرزندوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی ہیں ۔ ان سے پہلے یہ اعزاز کسی اور کو حاصل نہیں تھا ۔ حضرت فاطمہ بنت اسد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پیغمبر اکرمؐ انہیں ماں کہتے تھے جب انہوں نے وفات پائی تو پیغمبر اسلامؐ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی ۔[1]

[1] [نقل از کتاب انساب ابی طالب واقد حسینی متوفی سنہ ۴۴۸ ہجری]

found.

آلِ عقیلؑ

عقیلؑ بن ابی طالب بن عبدالمطلب حضرت ابوطالب کے دوسرے فرزند ہیں آپ جناب طالب سے دس سال چھوٹے اور جناب جعفرؑ سے دس سال بڑے ہیں آپ کی کنیت ابایزید ہے۔ آپ حاضر جوابی اور فہم و فراست کے ساتھ ساتھ قبائل عرب کے انساب سے بھی آشنا اور آگاہ ہونے میں معروف تھے۔ پیغمبرؐ کی ہجرت کے بعد آپ مکہ ہی میں رہے اور مکہ کے حالات سے پیغمبرؐ کو باخبر رکھا کرتے تھے۔ قریش آپ کو جنگ بدر کے موقعہ پر اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں لشکر اسلام کے ہاتھوں آپ اسیر ہوئے جس کے بعد آپ کے چچا عباس نے فدیہ دیکر آپ کو آزاد کرایا۔ پیغمبرؐ کے ساتھ جنگوں میں آپ برابر کے شریک تھے۔ پیغمبرؐ آپ کو مخاطب کر کے فرماتے تھے کہ ''میں آپ سے دو بنیادوں پر محبت کرتا ہوں:

(۱) آپ کی فہم و فراست کی بنیاد پر۔ (۲) اپنے چچا کی محبت کی بنیاد پر''

آپ نے سنہ ۶۰ ہجری میں معاویہ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔ آپ کی حاضر جوابی اکثر دشمن کو شرمندہ کر دیتی تھی جس کی وجہ سے آپ کے بارے میں دشمنانِ اہلِ بیتؑ نے بہت سی باتیں گھڑ لی ہیں۔ آپ کثیر الاولاد تھے اور آپ کی اولاد نے معرکۂ کربلا میں عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں۔

کتاب ''وسیلۃ الدارین فی انصار الحسینؑ'' تالیف سید ابراہیم زنجانی صفحہ ۲۲۹' کتاب ''انصار الحسین'' تالیف محمد مھدی شمس الدین صفحہ ۱۱۵' کتاب ''سالار شہیدان'' تالیف شیخ الاسلامی صفحہ ۱۹۴' کتاب ''ابصار العین فی انصار الحسینؑ'' تالیف مھدی سماوی صفحہ ۱۴۸' کتاب ''حیات امام حسینؑ'' تالیف باقر قرشی جلد سوم صفحہ ۲۴۹ پر لکھا ہے کہ میدان کربلا میں خاندان بنو ہاشم سے شہید ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد اولادِ عقیلؑ کی ہے۔ امام حسینؑ کی اس کاروانِ عشق و شہادت میں علی ابن ابی طالبؑ کے برادرِ بزرگ اور ناصر و

مدافع حضرت عقیلؑ کی نسل سے جن ذوات پاک نے شہادت پائی ان کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ احمد بن عقیلؑ۔

۲۔ عبدالرحمن بن عقیلؑ۔

۳۔ جعفر بن عقیلؑ۔

۴۔ عبداللہ بن عبداللہ اکبر بن عقیلؑ

۵۔ علی بن عقیلؑ

۶۔ عون بن عقیلؑ

۷۔ محمد ابن سعید بن عقیلؑ

۸۔ موسیٰ بن عقیلؑ

۹۔ مسلم بن عقیلؑ

۱۰۔ محمد بن مسلم بن عقیلؑ

۱۱۔ عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ

یہی وجہ ہے کہ امام سجاد -جب بھی آل عقیلؑ کو دیکھتے تھے، انہیں بنو ہاشم کے دیگر خاندانوں پر مقدم رکھتے تھے۔ ہر معاملہ میں انہیں ترجیح دیتے تھے اور ان کے ساتھ زیادہ محبت کا اظہار فرماتے تھے۔ جب آپؑ سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو آپؑ نے فرمایا: ''میں جب بھی ان پر نظر کرتا ہوں تو کربلا میں شہید ہونے والے یاد آ جاتے ہیں''۔ لکھا ہے کہ جب صبح عاشور جنگ شروع ہوئی تو اولادِ عقیلؑ موت کی اہانت کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ امام حسینؑ نے ان کی شجاعت و غیرت کو دیکھ کر درگاہِ خدا میں اپنے ہاتھوں کو بلند کیا، ان کے قاتلوں کے حق میں نفرین کی اور آل عقیلؑ کیلئے صبر و جنت کی دعا کی۔

حضرت مسلم بن عقیلؑ

جناب مسلم حضرت عقیل کی زوجہ جناب علَیہ سے پیدا ہوئے۔ بعض مؤرخین نے علَیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ کنیز تھیں جبکہ دوسروں نے انہیں آزاد خاتون گردانا ہے۔ علَیہ چاہے آزاد خاتون ہو یا کنیز حضرت مسلم بن عقیل کی عظمت و بزرگی میں اس بات سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کتاب ''شرح نہج البلاغہ'' تالیف ابن ابی الحدید جلد۳ ص۱۲۰، ''سفینۃ البحار'' جلد۲ ص۲۱۵، ''معالی السبطین'' جلد۱ ص۱۳۱، ''منتہی الآمال'' جلد۱ ص۲۳۱ اور ''مراقد و معارف'' جلد۲ ص۲۰۷ میں جناب مسلم کی والدہ کا نام علَیہ بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ ایک کنیز تھیں جنھیں معاویہ نے عقیل کی درخواست پر ان کو بخشا تھا۔ کہتے ہیں یہ اس زمانے کی بات ہے جب عقیل حضرت علیؑ کو چھوڑ کر معاویہ کے پاس گئے تھے۔

یہ بات بھی دراصل بنی اُمیہ کی ان سازشوں کی ایک کڑی ہے جو انہوں نے ہر اس شخصیت کے خلاف کی ہیں جس سے خود انہیں کوئی ضربت پہنچی ہو اور جن سے خاندانِ اہل بیتؑ کے مقام و منزلت کو گرانے میں مدد ملتی ہو یہ مفروضہ صفحات تاریخ پر موجود دوسری حقیقتوں سے چنداں مطابقت نہیں رکھتا۔

حضرت علی - کو سنہ ۳۶ ہجری کے اواخر میں خلافت ظاہری ملی تھی کہا جاتا ہے کہ خلافت ملنے کے کچھ عرصہ بعد جناب عقیل معاویہ کے پاس گئے تھے۔ اگر جلد سے جلد بھی گئے ہونگے تو سنہ ۳۷ ہجری سے پہلے نہیں جا سکتے۔ اگر فرض کرلیں کہ جاتے ہی کنیز مل گئی ہوگی اور فوراً ہی ان سے عقد ہو گیا ہوگا، تب بھی حضرت مسلم کی ولادت سنہ ۳۷ ہجری سے پہلے ممکن نہیں۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ سنہ ۵۰ ہجری میں جناب عقیل کی وفات کے وقت حضرت مسلم کی عمر ۱۲ یا ۱۳ سال ہونا چاہئے جبکہ تواریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی۔

بعض دوسرے مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت مسلم کی ماں کا تعلق قبیلہ نبط کے آل فرزنداں سے تھا۔ بہر حال آپ کی والدہ اگر کنیز بھی تھیں تو اگر عورت مؤمنہ پاک دامن اور پاک رحم ہو تو اس کی کنیزی اس کے فرزند کی حیثیت کو کم نہیں کیا کرتی ہے چنانچہ بعض آئمہ اطہارؑ کی مادران گرامی کو راہ کنیزی سے گزر کر ان ذوات پاک

کی ماں بننے کا شرف و افتخار حاصل ہوا۔ حضرت مسلم بن عقیل بنا بر نقل سیرت نویسان ۳۲ ہجری کو دور خلافت عثمانؓ میں پیدا ہوئے [۱]

حضرت مسلم امام حسین - کے چچا زاد بھائی ہونے کے علاوہ آپؑ کی خواہر محترمہ رقیہ کے شوہر بھی تھے۔ آپ مکتب اہل بیتؑ کے پروردہ اور تربیت کردہ انسان تھے۔ حضرت مسلم کے مقام شامخ اور آپ کی بلندیٔ مرتبت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے کوفہ میں اپنی آمد تک آپ کو اپنا نمائندہ بننے کا افتخار بخشا۔ آپؑ نے حضرت کی شان میں وہ کلمات بیان فرمائے ہیں جن کو اگر سنہری حروف میں بھی لکھا جائے تو ان کلمات کا حق ادا نہیں ہوگا۔ حضرت مسلم بن عقیل امام حسینؑ کے کاروان شہادت کے مقدمۃ الجیش ہیں۔ اس کارِ نمائندگی امام میں آپ نے اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔ دیار غربت اور عالم تنہائی میں کوفہ کی تنگ گلیوں سے گزرنے کے بعد دارالامارہ کی چھت پر جا کر آپؒ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

آپ کا افتخار بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آپ کے دو عزیز فرزندوں نے بھی، جو شجاع و دلیر، جرأت مند اور امامت آشنا تھے آپ کی تاسی کرتے ہوئے میدان کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا۔ بعض روایات کے مطابق اولادِ مسلمؒ نے بنی ہاشم کے دوسرے جوانوں پر شہادت میں سبقت لینے کا افتخار بھی حاصل کیا۔

حسین ابن علیؑ کے اس شجاع، دلیر، مدبر اور سیاست مدار سفیر کی شان میں خود امامؑ نے فرمایا کہ ''یہ میرا بھائی ہے، میرا امین اور معتمد ہے، میں نے انہیں اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہوئے تمہاری طرف بھیجا ہے'' مخالفین بیت امامت نے مسلمؑ کی ایثار و قربانی کو رائیگاں کرنے کی خاطر ان کو اس بلند مقام سے گرانے کی غرض سے اور آخر کار امام حسینؑ کے تدبر و فراست کو داغدار دکھانے کی خاطر ان کے خلاف بھی مختلف اشکالات اور اعتراضات اٹھائے ہیں۔ یہ کوئی ایسا نیا عمل نہیں جو تنہا حضرت مسلمؑ پر گزرا ہو بلکہ ایسا تو ہر اس شخص کے ساتھ ہوا ہے جس سے دشمن نے زیادہ دھچکا کھایا ہو۔

اس عظیم نمائندۂ حسینؑ کی برجستہ شخصیت کے صفحۂ سفارت پر لگائے گئے نقاط سیاہ کو دلیل و برھان اور تاریخی

[۱] [کتاب فرسان الہیجا ص۹۵، کتاب معارف ص۴۸]

اسناد کے ذریعہ محو اور رصاف کرنا ہمارا اوّلین دینی فریضہ بنتا ہے۔ بعض حضرات فقط ان پر آنسو کے چند قطرات بہانے یا ان کی خدمت میں متاعِ قلیل کا نذرانہ پیش کرنے ہی کو اپنا فرض جانتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ ان کے مقام شامخ میں کوئی اضافہ نہیں کرتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ان بزرگوار کی روشن وتابناک تاریخ پر لگائے گئے داغ دھبوں کو مٹا کر اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لئے ان کی حیات کو مشعل راہ اور صحیفۂ نور بنائیں۔

ہم یہاں پر پہلے جناب مسلم بن عقیل کے حالات کو مختصراً قلمبند کریں گے۔ اس کے بعد وہ اعتراضات بیان کریں گے جن کے ذریعہ آپ کے مقام ومنزلت کو گرانے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان اعتراضات پر اپنا نقد وتجزیہ بھی سپرد قلم کریں گے۔

جب اہل کوفہ کی طرف سے یکے بعد دیگرے نمائندوں اور پیغام رسانوں کا تانتا بندھ گیا اور خطوط ومکتوبات کی تعداد جب بارہ ہزار سے بھی زیادہ ہوگئی تو امام حسینؑ نے اپنی دینی اور اخلاقی مسئولیت کے پیش نظر ماہ مبارک رمضان کی پندرہ تاریخ کو کوفہ کے شیعیان اور دعوت کنندگان کے نام ایک خط مرقوم فرمایا اور اپنے ابن عم اور امین معتمد، جناب مسلم بن عقیلؑ کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ کی طرف روانہ فرمایا۔

اس خط میں آپؑ نے مسلم کی شخصیت، ان کی ذمہ داریوں اور مسئولیت کو بطور واضح وروشن بیان فرمایا تھا خط کا مضمون اس طرح ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

حسین ابن علیؑ کی طرف سے مسلمانوں اور مومنوں کی ایک جماعت کے نام، امابعد: ہانی وسعید تمہارے خطوط لیکر میرے پاس پہنچے۔ یہ تمہارے آخری قاصد تھے جو میرے پاس آئے۔ تمہاری تحریر سے میں مطلع ہوا تم نے لکھا ہے کہ ہمارا کوئی امام ورہبر نہیں ہے۔ ہمارے پاس آنے میں جلدی کیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ خداوند متعال آپ کے ذریعہ ہمیں راہ حق کی ہدایت کردے۔ میں اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیلؑ کو جو میرے معتمد ہیں تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ اگر انہوں نے مجھے یہ اطلاع دی کہ اہل فضل وعقل تمہارے خطوط اور تمہارے قاصدوں کے پیغام کی تائید کرتے ہیں تو میں عنقریب تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں انشاءاللہ"۔

خط کے آخر میں تحریر فرمایا: "اپنی جان کی قسم، امام صرف وہ ہے جو کتاب خدا سے حکم کرتا ہے، عدل اختیار کرتا ہے دین کو قبول کرتا ہے اور خود کو رضائے خدا کے لئے وقف کردیتا ہے"[1]

حضرت مسلم پندرہ ماہ مبارک رمضان کو کوفہ کی تین برجستہ شخصیات:

(۱) قیس بن مسہر صیداوی (۲) عمارۃ بن عبید اللہ سلولی (۳) عبدالرحمٰن بن عبداللہ ارحی کی معیت میں جو امام حسینؑ کو دعوت دینے کے لئے آئے تھے، کوفہ کیلئے روانہ ہوگئے۔ پانچ شوال کو آپ کوفہ پہنچ کر آپ نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر قیام فرمایا۔ اسی گھر میں امام حسینؑ کے لئے کوفہ کے ۲۵ ہزار افراد سے زائد افراد سے بیعت لی۔ ان کے شوق وولا کو دیکھ کر اور وعدہ کی وفا پر اعتماد واطمینان حاصل کرنے کے بعد آپ نے امام حسینؑ کو جلد از جلد کوفہ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے خط لکھا اور خط کے ساتھ قیس بن مسہر صیداوی کو دوبارہ مکہ کی طرف روانہ کردیا۔

اُدھر یزید بن معاویہ نے اپنے منصوب کردہ امیر حج، عمر بن اشدق کو حکم دیکر روانہ کیا کہ جیسے ہی موقع ملے امام حسینؑ کو دوران حج شہید کردیا جائے۔ امام حسینؑ کو کسی طرح اس سازش کا علم ہوگیا۔ اسی اثنا میں آپؑ کو مسلم بن عقیل کی طرف سے اہل کوفہ کی تائید کی اطلاع ملی۔ چنانچہ یہ دونوں اطلاعات کے ملنے کے بعد امام حسینؑ ۸ ذی الحجۃ الحرام کو مکہ سے کوفہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ عجب اتفاق ہے کہ جناب مسلم بن عقیل بھی اسی آٹھ تاریخ کو عبیداللہ زیاد کے فوجیوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے اور ان لوگوں نے آپ کو دارالامارہ لے جا کر اسی دن شہید کردیا۔

قیام مقدس امام حسینؑ میں اٹھائے گئے ہر اقدام پر انتقاد ونکتہ چینی کرنے والوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ تاریخ کے اوراق پر موجود نقولات کی بنیاد پر، کسی قسم کی تحقیق وبررسی کئے بغیر آپؑ کے قیام کے خلاف مزید انتقاد، اعتراضات اور شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں تاکہ امام حسینؑ کی شہادت کے عوامل واسباب کو خود امامؑ کی ناقص منصوبہ بندی کا نتیجہ قرار دیا جاسکے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سفارت ونمائندگی حضرت مسلم بن عقیل ہے

[1] [ارشاد مفید ج ۲ ص ۲۸، تاریخ طبری ص ۶ ص ۱۹۸]

آپ کے بارے میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ جناب مسلم امورِ اجتماعی و سیاسی میں تدبر نہ رکھتے تھے اور اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ نعوذباللہ آپ ایک بزدل، سست، خوش باور اور زود باور (جلد اعتماد کر لینے والے) شخص تھے۔ ایسی صفات کے حامل لوگ اس بات کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتے کہ ایک حکومتی قیام کے لئے نمائندگی کا کام انجام دے سکیں اور ایک بڑی طاقت و قوت کے مقابل فہم و فراست اور تدبر و حکمت کے ساتھ مقابلہ و مبارزہ کر سکیں چنانچہ انکے خیال کے مطابق حضرت مسلم کسی بھی طرح امامؑ کی نمائندگی کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنی اس بات کی تائید میں صفحاتِ تاریخ پر موجود واضح و روشن اسناد پیش کرتے ہیں جنکے بارے میں ہم مرحلہ وار گفتگو کریں گے:

۱۔ منصبِ سفارت و نمائندگی سے استعفیٰ دینا۔

کتب مقاتل و سیر اور قیامِ حسینیؑ سے متعلق بعض کتب میں امام حسینؑ کے اعزام نمائندگی مسلم بن عقیل کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:

"جناب مسلم اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ (جن کے اسمائے گرامی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) مکہ سے رات کی تاریکی میں مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد روضۂ رسول اکرمؐ پر حاضری دی اور اپنے عزیز و اقارب سے ملاقات کی۔ اس کے بعد قبیلۂ قیس کے دو آدمی راہنمائی کے لئے اجرت پر ہمراہ لئے، جو انہیں عام راستہ سے ہٹ کر لے کر چلے۔ اثنائے سفر میں یہ دونوں اجیر راستہ بھٹک گئے۔ ان کے پاس جو پانی تھا آخرکار ختم ہو گیا۔ جب حد سے زیادہ پیاس لگنے لگی تو ان دونوں نے مسلم اور ان کے ساتھیوں کو اشارہ کر کے راستہ دکھایا اور کہا یہاں سے سیدھے چلے جاؤ، پانی تک پہنچ جاؤ گے۔ دونوں اجیر خود تو پیاس کی تاب نہ لا کر وفات پا گئے لیکن حضرت مسلم اور ان کے ہمراہی پانی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب حضرت مسلم مضیق نامی جگہ پر پہنچے تو وہاں امام حسینؑ کے نام ایک خط تحریر کیا اور قیس بن مسہر صیداوی کو دے کر امامؑ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ:

"مدینہ سے دو اجیر ہمارے ساتھ تھے وہ دونوں راستہ میں مر گئے۔ ہم بھی پیاس کی حالت میں یہاں پہنچے

ہیں مجھے اس سفر سے فال بد ہوئی ہے لہٰذا اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس منصب سے سبکدوش فرما کر کسی اور کو فائز فرمائیں۔ والسلام"۔

امام حسینؑ نے مسلم کے خط کے جواب میں اس مضمون کا خط لکھا:

"آپ کے خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ استعفیٰ دینا چاہتے ہیں اسکا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اپنے اندر جبن اور بزدلی کو جگہ دی ہے۔ میں نے آپ کو جس کام پر متعین کیا ہے اس طرف اپنے سفر کو جاری رکھئے۔ والسلام"

جب امام حسینؑ کا خط جناب مسلم کو ملا تو انہوں نے کہا "میں اپنے نفس کے لئے تو نہ ڈرتا تھا"۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس کی بناء پر معترضین نے کہہ دیا کہ جناب مسلم بن عقیل اس منصب کے لائق و سزاوار نہیں تھے، بادلِ ناخواستہ امام حسینؑ کی مروت میں اور شرمندگی کے باعث اسے قبول کیا تھا چنانچہ راستہ میں مختصری زحمت اور تکلیف کا مشاہدہ کرنے کے بعد خوف و ہراس ان پر غالب آ گیا۔ ایسا شخص اس عظیم منصب کا لائق و سزاوار نہیں ہو سکتا۔ یہ اعتراض درحقیقت نمائندہ پر نہیں ہے بلکہ جس شخصیت نے نمائندہ کا انتخاب کیا ہے، خود اس پر ہے کہ اس نے انتخاب میں دقت اور فکر و سوچ سے کام نہیں لیا۔

ہم اس انتقاد و اعتراض کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ کتب تاریخ و مقاتل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ تاریخ بے بنیاد چیز ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کتب تاریخ میں جو کچھ لکھا ہوا ملے وہ جس شکل و صورت اور جن جملات و فقرات میں ہو، سب کو من و عن قبول نہیں کرنا چاہئے۔ تاریخ کے اوراق اس استغاثہ اور جواب استغاثہ کے مانند ہوتے ہیں جو مدعی اور مدعا علیہ عدالت میں داخل کرتے ہیں۔ ایک طرف مدعی ہوتا ہے جو الزامات عائد کرتا ہے جبکہ دوسری طرف مدعا علیہ ہوتا ہے جو خود کو ان الزامات سے بری قرار دینے کی کوشش کرتا ہے۔

لہٰذا قاری کا فرض ہے کہ جو کلمات و نقولات کسی شخص کے حوالے سے تاریخ میں ملیں انہیں من و عن قبول کرنے کی بجائے ان کی ابتداء، انتہاء، وسط اور انکے زمان و مکان، سب کو باہم مربوط کر کے دیکھے کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے حقیقت سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے چنانچہ حضرت مسلم کے استعفیٰ کے بارے میں جو کچھ بیان

کیا گیا ہے' جب ہم نے اس اصول کے تحت اسکا کچھ جائزہ لیا تو درج ذیل صورت حال سامنے آئی:

(۱) حضرت امام حسین ۔نے جناب مسلم بن عقیل کو کوفہ کی طرف بھیجا تھا۔کوفہ کے راستے سے کوفہ والے ہی زیادہ آشنا ہو سکتے ہیں چنانچہ امامؑ نے حضرت کو کوفہ ہی سے آئے ہوئے تین برجستہ اشخاص کے ساتھ بھیجا تھا یہ تینوں افراد مکہ سے کوفہ جانے والے راستے سے بخوبی واقف تھے۔ان کے ہوتے ہوئے کسی اور راہنما کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی؟ بالفرض محال اگر ضرورت ہوتی بھی تو مکہ سے خود امامؑ اہتمام فرماتے۔چونکہ ایسی شخصیت کو خصوصاً ایسے نازک حالات میں با اعتماد افراد کی معیت میں ہی بھیجنا قرین عقل ہے لہٰذا کسی راہنما کو اجرت پر ساتھ لے جانے کی یہ بات عقل اور منطق سے مطابقت نہیں رکھتی۔

(۲) جن دو افراد کو رہنمائی کے لئے منتخب کیا گیا تھا' اس بیان سے تو ایسا لگتا ہے کہ گویا ان کی جسمانی ساخت اور حلیہ میں اسقدر مماثلت تھی کہ دونوں کو ایک ساتھ ہی ایسی پیاس لگی کہ پیاس کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک ہی ساتھ مر بھی گئے جبکہ یہ عام مشاہدہ میں ہے کہ ہر شخص میں پیاس سے مقابلہ کرنے کی طاقت مختلف ہوا کرتی ہے لہٰذا ان دونوں افراد کو ایک ساتھ ہی ایسی پیاس لگنا اور ایک ساتھ ہی تاب نہ لا کر مر جانا' سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

(۳) اس سے بھی حیرانی کی بات یہ ہے کہ پانی کی نا فراہمی کے سبب دو افراد تو پیاس کی تاب نہ لا کر مر گئے جبکہ حضرت مسلم اور ان کے دیگر تین ساتھی صحیح وسالم رہے جبکہ سب ایک جیسے حالات سے گزر رہے تھے کیا ایسا تھا کہ ان کے پاس پانی موجود تھا' اس لئے بچے رہے اور ان دونوں کے پاس نہیں تھا' اس وجہ سے جان بحق ہو گئے۔یہ مفروضہ قرین قیاس نہیں کہ حضرت مسلم اور ان کے ہمراہیوں کے پاس پانی موجود ہو اور وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو دینے سے بخل کریں۔

(۴) لکھا ہے کہ جب یہ دونوں راستہ بھٹک گئے تو پیاس کی وجہ سے بیٹھ گئے اور مرنے کے قریب ہو گئے اس وقت انہوں نے حضرت مسلم کو اشارے سے بتایا کہ اس راستہ سے آگے چلے جاؤ گے تو پانی مل جائے گا۔ ایک طرف یہ کہنا کہ یہ لوگ راستہ بھول گئے تھے اور دوسری طرف یہ بیان کہ انہوں نے مرتے مرتے بھی

صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کر دی' دو متضاد باتیں ہیں جو بیک وقت ممکن نہیں ہو سکتیں۔

(۵) کیا حضرت مسلم اور ان کے باصفا ساتھیوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پیاس سے بلکتے ہوئے دو ہمسفر بلکہ راہنما افراد کو موت کے حوالے کر کے خود آگے بڑھ جائیں؟ کیا ان لوگوں کا فرض نہیں تھا کہ ان دونوں کی پیاس بجھانے کا بھی اہتمام کرتے جبکہ پانی کچھ آگے موجود تھا اور آپ اور آپ کے دوسرے ساتھی اس سے سیراب بھی ہوئے؟

(۶) لکھتے ہیں کہ حضرت مسلم نے امام حسینؑ کو خط میں ان نا مساعد حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ انہیں اس منصب سے معاف رکھیں اور کسی دوسرے کو ان کی جگہ متعین فرما دیں۔کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ حضرت مسلم خود امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر کسی اور کو اس منصب پر فائز کرنے کی درخواست کرتے۔

(۷) جس جگہ یہ حادثہ پیش آیا تھا' کہتے ہیں کہ اسکا نام مضیق تھا۔صاحب کتاب "معجم البلدان" لکھتے ہیں کہ مدینہ اور کوفہ کے درمیان اس نام کا کوئی مقام نہیں ہے بلکہ یہ مقام مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔

(۸) حضرت مسلم پندرہ رمضان المبارک کو مکہ سے نکلے اور ۵ شوال کو کوفہ پہنچے یعنی مکہ سے کوفہ تک کا سفر ۲۰ دن میں طے ہوا جو کہ معمول کے مطابق تھا۔اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ دو آدمیوں کے مرنے کے بعد آپ نے کسی کو خط دیکر امامؑ کے پاس مکہ بھیجا اور ان کی واپسی تک وہیں انتظار فرمایا تو اس رفت و آمد میں جو دن صرف ہوئے اس کی وجہ سے کوفہ پہنچنے میں تاخیر ہونی چاہیے تھی لیکن تاریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

(۹) مسلم نے امامؑ کا خط پڑھنے کے بعد فرمایا کہ مجھے اپنے نفس کے بارے میں کوئی خوف نہیں تھا۔اگر نفس کے بارے میں خوف نہیں تھا تو پھر کس چیز کے بارے میں خوف تھا؟ اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ملتی ہے۔

(۱۰) امام حسینؑ نے جناب مسلم کے خط کے جواب میں لکھا کہ آپ کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ آپ میں جبن و بزدلی پیدا ہو گئی ہے' آپ کو اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔آیا امامؑ عالی مقام کے لئے یہ مناسب تھا کہ مسلم کے اندر جبن اور بزدلی کا احساس پیدا ہونے کے بعد بھی ان کو ادامۂ سفر کا حکم دیں؟ کیا یہ معلوم ہو جانے کے بعد امامؑ کو انہیں معزول نہیں کر دینا چاہیے تھا؟

(۱۱) مسلم نے خط میں لکھا کہ مجھے اس سفر سے فال بد ہوئی ہے' جب کہ اہل بیت اطہار ؑ اس قسم کے فرسودہ تصورات کے قائل ہی نہیں تھے۔

(۱۲) حضرت مسلم کیلئے اس سفر میں تطیّر یا فال بد ہونے اور آپ کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہونے والی بات، آپ کی اس کیفیت سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی جسکا مظاہرہ آپ نے عبید اللہ بن زیاد جیسے سفاک اور مجرم کے ساتھ گفتگو میں فرمایا تھا۔ آپ نے اس کے روبرو دندان شکن جواب دیا اور کسی بھی صورت میں پشیمانی اور بزدلی کا اظہار نہیں کیا۔ دربار زیاد میں آپ نے امامؑ کے مشن کو واضح الفاظ میں بیان فرمایا اور انتہائی دلیری کیساتھ شہادت کے لئے آمادگی کا اظہار فرمایا۔

ان تمام نکات کے تجزیہ و تحلیل کے بعد بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بعض ارباب تاریخ و سیر نے جس کاہلی اور سستی کو آپ کی ذات پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے' اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

۲۔ تشکیل حکومت میں کاہلی اور سستی

کتب تواریخ میں لکھا ہے کہ حضرت مسلم نے کوفہ پہنچ کر مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں نزول فرمایا۔ اہل کوفہ نے انتہائی گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا۔ لوگ آپ کو دیکھ کر اور آپ کی زبان سے پیغام حسینی کو سن کر فرط مسرت سے بے تاب ہوئے جا رہے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ اس سے پہلے کہ آپ کوئی مطالبہ کرتے لوگوں نے خود اپنی طرف سے حسینؑ کی رکاب میں جہاد کرنے کے لئے بیعت کی پیش کش کر دی۔ چنانچہ ۱۸ ہزار یا بعض مقاتل کے مطابق ۲۵ ہزار افراد نے آپؑ کی بیعت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کوفہ کا حاکم انتہائی سست اور نرم مزاج تھا۔ بنوامیہ کے حامی اس کے اس رویہ سے ناراض تھے۔ انہوں نے یزید سے اس بات کی شکایت بھی کی تھی۔ معترضین کا کہنا ہے کہ وہاں موجود حاکم کی سستی' اس قدر گرمجوشی سے آپ کا استقبال اور ۲۵ ہزار مسلح افراد کا بیعت جہاد' یہ تین ایسے عوامل تھے جس کے بعد آپ کو کوفہ کے نظم و نسق کو فوراً اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے تھا۔ شہر کی اس طرح ناکہ بندی کرتے کہ نہ کوئی یہاں سے نکل سکتا اور نہ داخل ہو سکتا' سوائے امام حسینؑ کے۔ اس کے بعد وہاں پر موجود حاکم کو گرفتار کر لیتے اور امام حسینؑ کی آمد تک

ایک نگران حکومت قائم کرتے۔ اس طرح وہ خود بھی بچ سکتے تھے اور امام حسینؑ کو بھی بلا مزاحم کوفہ کی حکومت ہاتھ آ جاتی۔ چنانچہ وہ تمام مصائب جو آپ پر اور آپ کے اہل بیتؑ پر پڑے' ان سے بچ جاتے۔ لیکن آپ ان تدابیر کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے اور فساد اور سازش کے مراکز کو اپنی جگہ محفوظ رہنے دیا' جس کی وجہ سے تمام خفیہ رپورٹیں اور گزارشات یزید کو کوفہ سے شام پہنچتی رہیں۔ ناکہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے عبید اللہ بن زیاد بھی آسانی سے شہر میں داخل ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ایک اسلامی حکومت قائم کرنے والی شخصیت کی نمائندگی یا نیابت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

ممکن ہے بادی النظر میں بعض افراد کو یہ اعتراضات درست معلوم ہوں لیکن یہ تمام مفروضے اور اشکالات اس وقت کے حقائق کو نظر انداز کرنے' مسلم بن عقیل کی برجستہ شخصیت' ان کے فرائض منصبی اور مقام امامت حسین بن علیؑ سے ناآشنائی کے نتیجہ میں اذہان میں ابھرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت کے معروضی حقائق کو سامنے رکھ کر تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتے تو یہ اشتباہات جنم نہ لیتے۔

حضرت مسلم بن عقیل کے بارے میں جو غلط سلط تصورات پیش کئے گئے ہیں' اسی کے تحت نتیجہ بھی اخذ کر لیا گیا ہے۔ جب تصورات ہی مبنی بر حقیقت نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ ان سے جو نتیجہ اخذ ہوگا' وہ بھی غلط ہی ہوگا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ حضرت مسلم نے کوفہ پہنچ کر جو موقف اختیار کیا تھا وہ انتہائی متین اور اسلامی و عقلی رویہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں درج ذیل شواہد ملتے ہیں:

۱۔ حضرت مسلم بن عقیل کی شخصیت کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ آیا ان سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہے یا نہیں' اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ آپ کوفہ میں ایک خود مختار انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ کسی ہستی کی نمائندگی کرنے آئے تھے اور یہ ہستی کوئی اور نہیں بلکہ خود امام حسینؑ تھے چنانچہ جناب مسلم اس بات کے پابند تھے کہ اپنی ذمہ داریوں اور سرگرمیوں کو اسی دائرہ کے اندر رہ کر انجام دیں جو امامؑ نے ان کے لئے متعین کیا تھا۔ منصب کے محولہ فرائض میں کوتاہی یا متعین کردہ حدود سے تجاوز کرنا' دونوں ہی امانت داری کے تقاضوں کے خلاف اور امامت میں خیانت کے مترادف ہیں۔

امام حسینؑ کے اس خط کے متن کے مطابق جو آپؑ نے اہل کوفہ کے لئے جناب مسلم کے ہاتھ سے روانہ کیا تھا' آپ کی ذمہ داری صرف اسی حد تک تھی کہ آپ کوفہ والوں سے بہ نفس نفیس مل کر یہ معلوم کریں کہ آیا واقعی یہ لوگ' بالخصوص ان کے صاحبانِ حل وعقد اس مسئلہ میں اسی طرح دلچسپی لے رہے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنے خطوط میں لکھا ہے یا نہیں۔ چنانچہ حضرت مسلم نے لوگوں سے بیعت لینے اوران کی یقین دہانی اور حسن نیت کا بغور جائزہ لینے کے بعد کوفہ کی صورت حال سے متعلق ایک رپورٹ تیار کی اور اسے امام حسینؑ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اس خط میں جناب مسلم نے کوفہ کے خوش آئند حالات سے امامؑ کو آگاہ کیا۔

وہ کمانڈر یا جرنل جس کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ محاذ کا جائزہ لے کر اس کا نقشہ تیار کرے' اس پر یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ جنگ بھی کرے۔ ایسا وظیفہ اسی شخص کے سپرد کیا جاتا ہے جو بہادر ہو' امین ہو اور حالات کا دقیق نظر سے مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب مسلم نے منجملہ دیگر باتوں کے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اہل کوفہ کی نظروں میں آپ کے سوا کوئی اور نہیں۔ جناب مسلم کا جملہ سطحی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھا چنانچہ فرزدق اور کچھ اور لوگوں نے بھی امامؑ سے یہی کہا تھا کہ اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ آپؑ کی بیعت کریں گے۔

۲۔ اگر جناب مسلم کے لئے بغیر مسلح جنگ کے حاکم کوفہ کو وہاں سے نکال کر ایک حکومت تشکیل دینا ممکن ہوتا تو یہ منطق اپنی جگہ صحیح ہو سکتی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بغیر جنگ وجدال کے کوفہ کے اقتدار کا حصول ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

۳۔ گرچہ کوفہ میں بسنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس بات پر مصر تھی کہ امام حسینؑ جلد از جلد ان کے پاس تشریف لا کر انہیں بنواُمیہ کے ظلم وستم سے نجات دلائیں' لیکن بنواُمیہ کے طرفدار' دیگر منافقین اور دشمنان اہل بیتؑ بھی اسی شہر میں رہتے تھے جو وقت پڑنے پر بنواُمیہ کا ساتھ دے سکتے تھے۔ جس طرح یہ لوگ امام علیؑ کی حکومت عدل سے نالاں رہتے تھے' اسی طرح امام حسینؑ کے زیر حکومت ایک مرتبہ پھر عدل قائم

ہونے کے تصور سے خوفزدہ تھے۔

۴۔ یہ سمجھنا کہ نعمان بن بشیر (والی کوفہ) ایک نرم مزاج انسان تھا' حقیقت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ یہ دراصل اس کا تظاہر تھا۔ گو کہ اس نے جناب مسلم کے خلاف مسلح اقدام نہیں کیا لیکن اپنے خطبہ میں درشت لہجے میں خبردار کر چکا تھا کہ اگر کسی نے ہمارے خلاف قیام کیا تو ہم سختی سے اس پر پابندی لگائیں گے۔ البتہ صرف باتیں کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ نعمان کی طرف سے یہ بہر حال ایک اچھی سہولت تھی جس کی وجہ جناب مسلم کو اہل کوفہ کی اتنی بڑی تعداد سے امام حسینؑ کے لئے بیعت لینے میں آزادی ملی۔ یہ کیفیت خود ایک نعمت تھی جس سے حضرت مسلم نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

۵۔ نعمان بن بشیر نے کہا تھا: "جب تک وہ ہمیں نہ چھیڑیں ہماری امان میں رہیں گے"۔ اس جملہ کے بعد حضرت مسلم کے لئے بھی اس کے خلاف کسی اقدام کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو خود مورد تنقید اور مورد ملامت ٹھہرتے، چنانچہ جناب مسلم نے بھی اس کے ساتھ نرم رویہ ہی رکھا۔

۶۔ ان حالات میں جنگ کرنا دشمن کو جواز فراہم کرنے کے مترادف ہوتا۔ شاید اس اعلان جنگ کی وجہ سے موقع ہاتھ سے نکل جاتا اور ایسا کرنا امام حسینؑ کے تشریف لانے میں رکاوٹ کا سبب بن جاتا' کیونکہ اس بات کی کوئی واضح ضمانت نہیں تھی کہ اس جنگ میں آپ ضرور کامیاب ہوتے۔

۷۔ یہ خیال کہ کوفہ کی ناکہ بندی نہ کرنے کی وجہ سے یزید کے نام یہاں سے خط گئے اور عبیداللہ زیاد آسانی سے کوفہ میں داخل ہوگیا' یہ شبہ بھی حالات کا بغور جائزہ نہ لینے اور نتیجہ اخذ کرنے میں دقت نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ کہنا شاید صحیح نہیں ہے کہ سرحدوں پر نظر نہیں رکھی گئی تھی۔ اہل کوفہ کو شام سے خطرہ تھا اور اس لئے انھوں نے شام سے آنے والے راستہ پر نظر رکھی ہوئی تھی جبکہ عبیداللہ زیاد حجاز کی طرف سے آیا تھا۔ دوسری طرف یہ بات ہے کہ وہ اس طرح بھیس بدل کر کوفہ میں داخل ہوا تھا کہ لوگ یہ گمان کریں کہ خود امام حسینؑ آئے ہیں۔

ویسے بھی یہ کوئی دقیق اشکال نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں وسیع سرحدوں کی نگرانی کرنا ممکن نہیں

تھی۔ آج کے دور میں یہ کام اتنا آسان نہیں ہوتا ہے جبکہ جدید ترین سہولتیں میسر ہیں یہ کہنا کہ سرحدوں کی نگرانی نہ ہونے کے سبب یزید کے لئے خط لے جانے والے آسانی سے نکل گئے اور عبید اللہ زیاد آسانی سے کوفہ میں داخل ہوگیا اگر صحیح ہے تو پھر اس کے بارے میں کیا کہیں گے کہ حضرت مسلم اور جناب ہانی کی شہادت کے بعد عبید اللہ زیاد نے شہر کوفہ کی سخت ناکہ بندی کروادی مگر اس کے باوجود اسی شہر سے حبیب بن مظاہر، ہلال بن نافع، مسلم بن عوسجہ وغیرہ امام حسینؑ کی نصرت کے لئے انہی سرحدوں کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئے اور صحت و سلامتی کے ساتھ امامؑ کے رکاب میں شامل ہوگئے۔

قارئین خود فیصلہ کرلیں کہ کیا ان حقائق کے باوجود یہ کہنا کہ اس سلسلے میں مسلم کی طرف سے کوتاہی اور سستی ہوئی ہے، صحیح ہوگا؟۔

۳۔ دوستوں کا ساتھ چھوڑ کر چلے جانا

حدیث نبویؐ ہے کہ ''عاجز انسان وہ ہے جو اپنے لئے دوست نہ بنا سکے اور اس سے بھی زیادہ عاجز وہ ہے جس کا دوست اسے چھوڑ دے''۔

دورِ حاضر کے معاشرے میں بھی یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کے ذریعہ سے کسی شخصیت کی قابلیت اور اس کے تدبر و فراست کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر کسی شخصیت کو اس کے چاہنے والے چھوڑ دیں تو عام طور پر لوگ وجوہات معلوم کئے بغیر کہ غلطی کس کی ہے، اس شخص ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

جناب مسلم بن عقیل اور امام حسینؑ کے مخلص و فادار ساتھیوں کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ وہ مسلم بن عقیل جن کے ہاتھ پر پچیس ہزار لوگوں نے مسلح بیعت کی تھی، آخری لمحات میں سب انھیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اپنے گھر لے جانا تو درکنار، کوئی راستہ دکھانے والا بھی نہیں تھا ایسے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلم بن عقیل کہ جنہیں امام حسینؑ نے اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا، سیاسی بصیرت کے فقدان کے سبب اپنے قریب ترین افراد کو بھی ساتھ نہ رکھ سکے۔ عام لوگوں کا کیا ذکر کریں، انتہائی مخلص و باوفا اصحاب نے بھی اس موقعہ پر جناب مسلم کو تنہا چھوڑ دیا۔ بظاہر صورت حال ہے بھی کچھ ایسی کہ فوراً نتیجہ پر پہنچنا مشکل نظر آتا ہے۔

جس زمانے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، اس وقت اس کی اصل ماہیت کو سمجھنا یقیناً آسان نہیں ہوتا۔ لیکن یہ واقعہ تو ایسا پیچیدہ ہے کہ تقریباً چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ سب کیا ہے؟ جہاں تک سطحی اور سرسری نظر سے دیکھنے والوں کا تعلق ہے، ان کو نہ اس میں کوئی اشکال نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کا جواب ملتا ہے۔ لیکن وہ افراد جنھوں نے مسائل کی تہہ تک پہنچ کر حقائق معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، انکے سامنے اس واقعہ کے کئی زاویے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے چند کے بارے میں ہم یہاں پر گفتگو کریں گے:

(الف) ایک زاویہ شخصیت ہے۔

یہ وہ شخصیات ہیں جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اہل بیتؑ کے معاملہ میں کسی قسم کی کوتاہی کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اہل بیتؑ کی بیعت پر قائم رہنا ان کو اتنا عزیز تھا کہ اپنی جان تو دے دی لیکن بیعت نہیں توڑی۔ ہانی بن عروہ اسی راہ میں شہید ہوئے، حبیب ابن مظاہر، مسلم بن عوسجہ اور ابو ثمامہ صیداوی اور ان کے دیگر کئی ساتھیوں نے ہزار رکاوٹوں کے باوجود خود کو کربلا میں پہنچایا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ان تمام مجاہدین کا تعلق بھی کوفہ سے ہی تھا۔ ان میں اور دوسروں میں بس اتنا فرق ہے کہ یہ اہل غدر نہیں تھے بلکہ اہل بیتؑ کے شیدائی اور پروانے تھے۔

(ب) خود مسلم بن عقیل کی شخصیت کا تاریخ کے آئینہ میں مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے امامؑ کی نمائندگی کرنے میں کبھی کسی قسم کی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ عام مشاہدہ ہے کہ جس وقت انسان اپنے لشکر میں اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان میں ہوتا ہے، بڑے بڑے دعوے کرتا ہے لیکن دشمن کے ہاتھوں اسیر ہوتے ہی اس کا لہجہ، اخلاص، وفاداری سب بدل جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ اپنی جان بچانے، اپنے آپ کو بے قصور دکھانے اور اپنے دشمن کے دل میں نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن مسلم کی ہستی وہ ہے جس نے ایسے وقت میں بھی اپنی ذات کو فراموش کر دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عبید اللہ زیاد جیسے شقی انسان کے سامنے بھی پیغام حسینی کو پہنچانے میں آپ نے کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس

شقی ترین انسان کے ہاتھوں شہید ہونے کو اپنے لئے افتخار سمجھا لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ کی شخصیت یا کردار میں کوئی ایسا نقص یا کمی نہیں تھی جس کی وجہ سے لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔

(ج) اس وقت حالات نے ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا جسکی وجہ سے ساتھ دینے والوں کی تعداد خود بخود گھٹتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ گنتی کے چند افراد رہ گئے رفتہ رفتہ صورتحال کچھ ایسی ہو گئی کہ ان مخلصین کے ساتھ دینے یا نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کے وہاں موجود رہنے سے بھی مسلم کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں تھی۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا مسلم اکیلے شہید ہو جائیں یا اصحاب کے ساتھ شہید ہوں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ایسی صورت میں شرعی اور عقلی تقاضے کیا ہو سکتے تھے؟۔

اگر اصحاب سامنے آتے تو سوائے شہادت کے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا جیسا کہ کچھ دیر بعد ہانی شہید کر دیئے گئے۔ جناب ہانی کی شہادت کے بعد صورت حال اور بھی گھمبیر ہو گئی تھی ان حالات میں درج ذیل اقدامات میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا جا سکتا تھا:

۱۔ مسلم کو شہادت کے لئے تنہا چھوڑ کر اصحاب پیچھے ہٹ جاتے۔ اس صورت میں ان پر بے وفائی کا الزام لگنا بالکل ٹھیک بات ہوتی۔

۲۔ ان کی حفاظت کرتے ہوئے خود بھی شہید ہو جاتے۔ اس صورت میں وہ وفا کے سچے پیکر کہے جاتے۔

۳۔ جب یہ طے پا گئی تھی کہ حضرت مسلم کو ہر حال میں شہید ہونا ہے تو پھر ساتھ دینے یا چھوڑنے سے چونکہ انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا، اسلئے یہ پیچھے ہٹ گئے ہوں یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے خود کو بچانے کیلئے مسلم کو آگے کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ اصحاب خود کو شہادت کیلئے پیش کر دیتے تب بھی مسلم کو بچانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مسلم کو تو ہر صورت میں شہید ہی ہونا تھا البتہ ان باوفا اصحاب کے پاس وہ اعلیٰ وارفع ہدف اب بھی موجود تھا جس کے لئے انھوں نے کمر ہمت باندھی تھی اور امام حسین-کو دعوت دی تھی۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے مواقع کلی طور پر اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھے۔ چنانچہ اس کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں کہ اپنے اصلی ہدف کی طرف بڑھنے کے

لئے یہ لوگ چھپ گئے ہوں۔ ہدف حاصل ہو جاتا تو فبہا ورنہ شہادت کا راستہ تو بہر حال کھلا ہی تھا۔ اس اعلیٰ ہدف نے انہیں حضرت مسلم کے ساتھ جام شہادت نوش کرنے سے باز رکھا۔ پس یہ اصحاب باوفا کسی زاویے سے قابل مذمت قرار نہیں پاتے۔ مذمت تو تب ہوتی جب ان لوگوں نے جناب مسلم کو قصوروار ٹھہرایا ہوتا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کسی نے یہ نہیں کہا کہ مسلم اپنی کوتاہی کی وجہ سے شہید ہوئے۔ حضرت مسلم کے یہ باوفا اصحاب جس راہ پر چلنے کیلئے قدم اٹھا چکے تھے' اس پر چلنے کیلئے ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنے عمل سے ثابت کیا اور شدید ترین خطرات کا سامنا کرتے ہوئے انتہائی تدبر و فراست سے کام لے کر خود کو رکاب حسینؑ میں پہنچایا۔

۴۔ ایک مفروضہ اور ہے جس کے لئے ہمارے پاس کوئی تاریخی سند تو نہیں ہے لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے۔ جناب مسلم نے بھی اسی روش کو اپنایا ہو جسے اپناتے ہوئے امام حسین-نے شب عاشور اپنے اصحاب سے فرمایا تھا کہ یہ لوگ تنہا میرے خون کے پیاسے ہیں، لہٰذا آپ لوگ اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہوئے یہاں سے چلے جائیں۔ اصحاب حسینؑ کو تو کربلا کے بعد کسی اور اعلیٰ ہدف کے حصول کی امید نہ تھی' اسلئے انہوں نے امام حسین-کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس کے برخلاف جناب مسلم کی شہادت کے وقت آپکے اصحاب کو پختہ یقین تھا کہ یہ آخری مرحلہ نہیں ہے، شہادت مسلم کے بعد بھی اہداف حسینی کا حصول ان کی نظروں میں تھا چنانچہ ممکن ہے کہ اسی مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے اپنی جانوں کی حفاظت کی ہو۔

امیر قہرمان بہ مقابل امیر بزدل وسنگدل

دنیا میں رائج عام دستور کے مطابق امیر قہرمان اس کو سمجھا جاتا ہے جو فریق مخالف کو شکست دینے کے بعد اس کو اسیر کرکے ذلیل وخوار کرے' اپنے حضور میں کھڑا کرکے اس کی تحقیر وتذلیل کرے' اسکا تمسخر اڑائے' اسکے سامنے کبر نمائی کرے اور انتہائی اہانت آمیز لہجے میں اس سے گفتگو کرے۔

اس کے مقابل قہرمانی کا ایک اور تصور بھی ہے۔ یہ قہرمان فریق مخالف پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد

انہیں دہشت زدہ نہیں کرتا بلکہ انکے دلوں پر طاری خوف وہراس اور رعب وارعاب کو دور کرنے کے لئے انتہائی محبت وشفقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب پیغمبرؐ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اہل مکہ کے دلوں پر طاری خوف ووحشت کو یہ فرما کر اطمینان میں تبدیل کردیا:

''جاؤ تم سب آزاد ہو' اپنے اسلحہ کو پھینک دو' امن وامان' سکون وراحت اور عزت کی زندگی گزارو''۔

قہرمانی کے اس تصور کا اب ایک اور رُخ دیکھئے۔ پیامبر گرامیؐ فاتحانہ حالت میں مکہ میں داخل ہوچکے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ شکست خوردہ لشکر کے امیر کے ساتھ آپؐ کیا رویہ اپناتے ہیں۔ وہ امیر لشکر جو سالہا سال سے پیغمبر گرامی قدرؐ سے نبرد آزما رہا تھا' آج وہ نہ فقط آزاد ہے بلکہ آپؐ نے اس اسیر کو یہ اعزاز بھی عطا فرمایا کہ جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا' اس کے لئے امان ہے۔ قہرمانی کا یہ وہ تصور ہے جسے پیغمبر گرامیؐ نے دنیا کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا۔

قہرمانی کا ایک تصور اور بھی ہے جو اپنی جگہ بڑا عجیب ہے۔ کبھی کبھی جب ایک شکست خوردہ اور اسیر قائد و امیر کو فاتح امیر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اسیری کے باوجود وہ اس کی طاقت' قوت' غیض وغضب کی پروا کئے بغیر اپنی دعوت کو انتہائی جراُتمندی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ تاریخ میں اس قہرمانی کا ایک بہترین نمونہ فرزند عقیل' داماد علیؑ' نمائندۂ حسینؑ' امیر عدل وحق اہل کوفہ' حضرت مسلمؑ نے پیش کیا ہے۔ اس شہر سے ۲۵ ہزار افراد نے اقامۂ حق اور باطل سے نبرد آزمائی کے لئے' آپ کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیا تھا لیکن ان کی یہ بیعت ایک زبانی دعویٰ سے زیادہ ثابت نہ ہوسکی۔ بالآخر آپ کو گرفتار کرکے اسقدر شدید زخمی حالت میں دارالامارہ میں بزدل وسنگدل امیر کے سامنے پیش کیا گیا کہ آپ کے چہرہ مبارک اور زبان سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسے میں ایک سپاہی نے حضرت مسلمؑ سے کہا ''امیر کو سلام کرو''۔ اس پر آپ نے فرمایا: ''خاموش ہوجا۔ افسوس ہے تیرے لئے' یہ میرا امیر نہیں ہے''۔ عبیداللہ بن زیاد اس امیر قہرمان کے جراُتمندانہ جواب سے اپنے عرش سے فرش پر گر پڑا اور فوراً ہی اپنی خباثت اور غصہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا: ''فرق نہیں پڑتا' سلام کرو یا نہ کرو' تمہیں قتل ہی ہونا ہے''۔ حضرت مسلمؑ نے جواب دیا: ''ایسی خباثتیں تم جیسے ناپاک انسانوں سے غیر

متوقع نہیں ہیں''۔ عبیداللہ زیاد بولا: ''اے سرکش' نمک حرام انسان تونے اپنے وقت کے پیشوا پر خروج کیا' اُمت کی وحدت کو پاش پاش کردیا اور ملک میں فتنہ وفساد برپا کیا''۔ حضرت مسلمؑ نے فرمایا: ''تونے جھوٹ بولا ہے' غلط گوئی سے کام لیا ہے' مسلمانوں کی وحدت کو معاویہ اور اس کے بیٹے نے پاش پاش کیا ہے۔ اس اُمت میں فتنہ تم اور تمہارے باپ نے پیدا کیا ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے شریر ترین افراد کے ہاتھوں شہادت نصیب ہو''۔

ابن زیاد نے کہا: ''تم نے اس شہر میں آکر لوگوں میں افتراق پیدا کیا ہے' لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہوگئے ہیں''۔ اس پر حضرت مسلم نے فرمایا:

''ایسا نہیں ہے' میں اختلاف پھیلانے نہیں آیا ہوں، بلکہ اہل کوفہ کا اعتقاد تھا کہ تمہارے باپ نے ان کے بزرگوں کو قتل کیا' ان کا محترم خون بہایا' کسریٰ وقیصر اور بادشاہان ایران وروم کی طرح ان کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا۔ میں تو یہاں لوگوں کو عزت دینے اور ان کو محترم انداز میں دیکھنے کیلئے آیا ہوں، تا کہ حکم قرآن یہاں نافذ ہو''۔

ملاحظہ کیا آپ نے' اس کو کہتے ہیں امیر قہرمان۔ جب یہ قہرمان تلوار غیض وغضب اور انتقام وکینہ کے سائے میں پہنچتا ہے تو دشمن خدا کے غرور اور جبروت کی پروا کئے بغیر پیغامِ حق کو بلند کرتا ہے۔ مجالسِ عزاداریٔ امام حسین۔ کے بہت سے خطباء ومقررین پر چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہ بات روشن نہیں ہوئی کہ قیام مقدس امام حسین۔ کن مقاصد کے لئے تھا لیکن نمائندۂ حسینؑ نے دارالامارہ میں بزدل وسنگ دل حاکم اور اس کے جلاّدوں کے سامنے اسی وقت واضح کردیا تھا کہ ہم یہاں ظلم وفساد کے خاتمہ اور عدل وانصاف کے اقامہ کے لئے آئے ہیں۔

اپنے پیشوئی ومقتدیٰ اور امام وقت کے پیغام کو مرکز کفر وطاغوت میں بیان کرنے کے جرم میں دارالامارہ کی چھت پر لے جاکر نمائندہ حسینؑ کے سر مقدس کو جسم اطہر سے جدا کردیا گیا۔ سر مقدس عبیداللہ کے سامنے رکھا گیا اور جسم مطہر جو دارالامارہ کی چھت سے نیچے پھینکا گیا تھا' پاؤں میں رسی باندھ کر گھسیٹتے ہوئے بازار کوفہ لے

جایا گیا۔ وہاں اسے آپکے عزیز میزبان جناب ہانی کے بدن کے ساتھ باندھ کر بازار کی گلیوں میں مزید گھسیٹا گیا۔ اس منظر کے بارے میں فرزدق شعر میں کہتے ہیں: "اگر موت کو نہیں پہچانتے ہو تو فرزند عقیل اور ہانی کو بازار کوفہ میں دیکھو"۔

ازدواج واولاد مسلم بن عقیل

حضرت مسلم بن عقیل کاروان شہدائے آل عقیل کے سیدالشہداء اور قیام امام حسین ؑ کے امیر مقدمۃ الجیش ہیں۔ آپ قیام حسینی کے شہداء میں نسل ہاشمی سے پہلے شہید ہیں۔ بعض روایات کے مطابق میدان کربلا میں نسل ہاشمی میں سبقت کرنے والوں میں بھی مسلم بن عقیل کے فرزند عبداللہ بن مسلم او محمد بن مسلم بن عقیل ہی ہیں۔ جناب مسلم کی شہادت اوران پروارد شکوک وشبہات کے ازالے کے سلسلے میں ہم نے گزشتہ صفحات میں اپنی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ حضرت مسلم بن عقیل کی اولاد سے متعلق بھی صفحاتِ تاریخ میں کافی شکوک وشبہات ملتے ہیں بلکہ بعضوں نے تو آپ کی اولاد سے منسوب کچھ ایسے قصے بیان کئے ہیں جن کا حقیقت وواقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ قصے اوّل تو کسی مستند کتاب میں نقل نہیں ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے انہیں نقل کیا ہے' ان میں سے بھی ہر ایک نے مختلف روداد بیان کی ہے۔ ان کو بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر جناب مسلم کی ازواج اور اولاد کا مختصراً تذکرہ کردیا جائے تا کہ آپ کی حقیقی اولاد اور جعل کی گئی اولاد میں قارئین تمیز کرسکیں۔

ازواج مسلم بن عقیل ؑ

حضرت مسلم بن عقیل ؑ کی پہلی شادی جناب رقیہ بنت امیر المومنین ؑ سے ہوئی جن کے انتقال کے بعد ان ہی کی بہن جناب رقیہ صغرا سے آپ کی دوسری شادی ہوئی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ انکا نام رقیہ صغرا نہیں تھا بلکہ کلثوم بنت امیر المومنین ؑ تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ جناب مسلم نے اپنے عم علی ؑ کی دونوں بیٹیوں سے شادی کی تھی

اور دونوں کا اصلی نام رقیہ تھا' البتہ ان میں سے ایک کی کنیت ام کلثوم تھی۔ لیکن بعض دوسرے مؤرخین کا خیال ہے کہ دو سے نہیں بلکہ امیر المومنین ؑ کی تین بیٹیوں سے آپ کی شادی ہوئی تھی۔ ایک کا نام رقیہ' دوسری کا نام رقیہ صغرا اور تیسری کا نام ام کلثوم صغرا تھا۔

محمد بن حبیب نسابہ بصری' امیر المومنین ؑ کے دامادوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ ؑ کی دختر جناب رقیہ حضرت مسلم بن عقیل کے عقد میں تھیں۔ یہ رقیہ صغرا کربلا میں بھی موجود تھیں [1]

اولاد مسلم بن عقیل

اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مسلم کے چار بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ آپ کے فرزندوں کے ناموں کے سلسلہ میں تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہیں لکھا ہے کہ ایک کا نام جعفر بن مسلم تھا' دوسرے کا علی بن مسلم' تیسرے کا مسلم بن مسلم اور چوتھے کا عبدالعزیز بن مسلم۔ بعض کا کہنا ہے کہ ایک بیٹے کا نام عبداللہ بن مسلم یا محمد بن مسلم تھا۔ آپکی بیٹی کا نام حمیدہ بنت مسلم تھا۔

کتاب "مقاتل الطالبین" میں کربلا میں شہید ہونے والوں میں جناب مسلم کے ایک بیٹے عبداللہ کا ذکر ملتا ہے جو حضرت مسلم کی شجاع ترین اولاد میں سے تھے۔ بعض مؤرخین نے شیخ تریحی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ محمد بن مسلم اور جعفر ابن مسلم بھی کربلا میں شہید ہوئے ہیں۔ حضرت مسلم کے دو شہید بیٹوں سے منسوب ایک ضریح مسیّب میں بھی واقع ہے جسکی تفصیل کتاب 'امالی صدوق' "منتخب طریحی" "مقاتل الطالبین" وغیرہ میں نقل ہے۔ مؤرخین میں اس بات کا اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں عبداللہ بن جعفر کے فرزند ہیں یا بقول طبری مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں۔ شیخ صدوق ؒ نقل کرتے ہیں کہ وہ حضرت مسلم کی اولاد ہیں۔

ان دو مقتولین میں سے ایک کا نام ابراہیم بتایا جاتا ہے اور دوسرے کا عبدالرحمن یا محمد یا جعفر کہتے ہیں یہ دونوں نہر فرات پر قتل کئے گئے جبکہ جس جگہ ضریح موجود ہے وہ فرات سے خاصی دور ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں وہاں پہنچے کیسے؟ اس سلسلہ میں کتب مقاتل میں مختلف ومتضاد روایتیں ملتی

[1] [نقل از کتاب سفیر الحسین ؑ تالیف: علامہ عبدالوحید شیخ احمد مظفر ص ۱۴]

ہیں جن کا تفصیلی ذکر ہم نے افسانۂ طفلان مسلم کے ذیل میں کیا ہے۔

حضرت مسلم بن عقیلؑ کے ہم رکاب شہداء

سفیر امام حسینؑ فرزند عقیلؑ امین ومعتمدِ آلِ محمدؐ جناب مسلم نے کوفہ کی گلیوں میں باطل کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے کے بعد جام شہادت نوش فرمایا آپ کی معیت میں اہل کوفہ کے کچھ اور برجستہ رؤساء نے بھی راہ حسینی میں اپنی جانیں بطور نذرانہ پیش کیں۔

۱۔ ہانی بن عروہ مذحجی مرادی:

آپ کے حالات کی تفصیل آلِ مرادی کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ عبدالاعلیٰ بن یزید کلبی علیمی:

یہ بھی کوفہ کی برجستہ شخصیات میں شامل تھے۔ایک مرد مجاہد تھے امام حسینؑ کو کوفہ بلانے والوں میں سے ایک تھے۔کثیر بن شہاب نے آپ کو اسیر کیا تھا اور حضرت مسلم کی شہادت کے بعد زندان سے نکال کر شہید کر دیا۔

۳۔ عمارہ صلخب ازدی:

یہ تابعی ہیں شیعوں کے درخشاں چہروں میں سے ایک ہیں۔امام حسینؑ کو کوفہ کی طرف دعوت دینے والوں میں شامل ہیں محمد بن اشعث نے جب آپ کو گرفتار کر کے دربار میں پیش کیا تو ابن زیاد نے زندان بھیج دیا۔حضرت مسلم کی شہادت کے بعد آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔

۴۔ عباس بن جعدہ الجدلی:

یہ بھی کوفہ کی نامور شخصیات اور مردان شجاع میں شامل تھے۔حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔

۵۔ عبداللہ بن عمرو بن عزیز الکندی:

یہ بھی تابعی ہیں اور کوفہ کے مردان شجاع میں شامل ہیں۔حضرت مسلمؑ کے لشکر کے رئیس تھے۔دارالامارہ پر حملہ کے دوران شہید ہوئے۔

۶۔ محمد بن کثیر ازدی:

یہ بھی کوفہ کی برجستہ شخصیت تھے۔دارالامارہ کا محاصرہ کرتے وقت شہید ہوئے تھے۔

کتاب ''مبعوث الحسینؑ'' کے صفحہ ۲۳۷ پر حضرت مسلمؑ کے رکاب میں شہید ہونے والوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے:

۱۔ عبداللہ بن عمرو بن عزیز الکندی

۲۔ عباس بن جعدہ جدلی

۳۔ عبدالاعلیٰ بن یزید کلبی

۴۔ عمارۃ بن صلخب ازدی

۵۔ میثم بن یحییٰ تمار

۶۔ محمد بن کثیر ازدی

۷۔ حنظلہ بن مرۃ ہمدانی

۸۔ ہانی بن عروہ

دیگر شہدائے آلِ عقیل

اولادِ عقیل میں، جناب مسلم بن عقیل کے علاوہ جن ہستیوں نے میدان کربلا میں شہادت پائی، ہم یہاں پر ان کا مختصراً تذکرہ کر رہے ہیں:

۱۔ عبداللہ بن مسلم بن عقیل

عبداللہ بن مسلم کی والدہ جناب رقیہؑ دختر امیر المومنینؑ ہیں۔کتاب ''ریاحین الشریعۃ'' جلد سوم میں لکھا ہے کہ بعض روایات کے مطابق جناب عبداللہ، جناب سکینہ کے شوہر تھے۔کتاب ''فرسان الہیجاء'' جلد اوّل صفحہ ۲۵۴ شمارہ ۱۲۵ میں وارد زیارت ناحیہ اور زیارت رجبیہ میں جناب عبداللہ کے اسم گرامی سے منسوب زیارت کے کلمات موجود ہیں کتاب ''نفس المہموم'' میں لکھا ہے کہ جب امامؑ کے اصحاب ویاران میں سے کوئی

باقی نہیں بچا اور جوانان بنو ہاشم کی باری آئی تو اولاد عقیلؑ اولاد جعفرؑ اور اولاد علیؑ میدان جنگ میں جانے کے لئے تیار ہوئے۔ جوانوں نے ایک دوسرے کو وداع کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے جنگ کی اجازت لینے کیلئے جناب عبداللہ بن مسلمؑ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امامؑ ان سے بہت محبت کرتے تھے کیونکہ یہ امامؑ کے بھانجے بھی تھے۔

جناب عبداللہ لشکر اعداء کے مقابل میں تشریف لائے تو آپ نے یہ رجز پڑھا:

"الیوم القی مسلما وھو ابی وفتیہ بادوا علی دین النبی

لیسوا کقوم عرفوا بالکذب لکن خیار و کرام النسب

"میں آج اپنے باپ مسلم سے ملاقات کروں گا' میں ان جوانوں سے ملوں گا جو پیغمبرؐ کے دین پر باقی تھے۔ ہمارا تعلق اس گروہ سے نہیں ہے جو جھوٹ بولنے والے کہے جاتے ہیں' ہم اچھی خو کے مالک اور کریم النسب ہیں"۔

اس رجز کے بعد جب عبداللہ دشمن سے نبرد آزما ہوئے تو مقاتل لکھتے ہیں کہ عمرو بن صبیح صیداوی نامی شخص نے ایک تیر آپ کے چہرے کی طرف پھینکا' آپ نے اپنا ہاتھ چہرے پر رکھا' تیر آپ کے ہاتھ کو چھیدتا ہوا پیشانی میں پیوست ہوگیا۔ جب آپ اپنا ہاتھ چہرے سے الگ نہ کر سکے تو یہ دعا پڑھی:

"اللھم انھم اقتلونا واستذلونا اللھم فاقتلھم کما قتلونا واذلھم کما استذلونا"۔

اسی طرح زیارت ناحیہ میں یہ جملہ ملتا ہے:

"السلام علی القتیل بن القتیل عبداللہ بن مسلم بن عقیل بن ابی طالب 'لعن اللہ قاتلہ عمرو بن صبیح صیداوی"۔

۲۔ جعفر بن عقیل

بنا بر کتاب "ذخیرہ" صفحہ ۳۴ جعفر ابن عقیل بھی اصحاب حسینؑ میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب "انصار الحسینؑ" میں محمد مہدی شمس الدین نے صفحہ نمبر ۱۱۵ پر اور کتاب "ابصار العین فی انصار الحسینؑ" میں محمد بن شیخ طاہر سماوی نے صفحہ ۵۱ پر ان کا ذکر کیا ہے۔ جعفر کی ماں ام الثغر بنت عامر بن الھمان العامری قبیلہ

بنو کلاب سے تھیں جبکہ بعض کہتے ہیں کہ ان کی ماں خوصا بنت عمرو بن عامر بن ہصان بن کعب بن عبد بن ابی بکر بن کلاب عامری ہیں۔

سید بحرانی نے عوالم میں لکھا ہے کہ آپ امامؑ عالی مقام سے اجازت لیکر میدان میں گئے اور یوں رجز پڑھا:

"انا الغلام الابطحی الطالب من معشر من ھاشم من غالب

ونحن حقا سادۃ الدوائب ھذا حسینؑ اطیب الاطائب

من عترۃ البر التقی الثاقب"

"میں طالب اور بطحی کے خاندان میں سے ہوں' میرا تعلق ہاشم اور غالب کی قوم سے ہے' ہم اس دنیا کے سادات اور بزرگ ہیں۔ یہ حسینؑ دنیا کی پاک و پاکیزہ ترین ہستیوں میں سے ہیں اور نیک اور پرہیزگار عترت سے ہیں"۔

جعفر نے پندرہ دشمنوں کو واصل جہنم کیا۔ عبداللہ بن عروۃ خثعمی نے آپ کی طرف ایک تیر پھینکا اور بشر بن خوط ہمدانی نے آپ کو شہید کیا۔ زیارت ناحیہ کا یہ جملہ اس بات پر صادق آتا ہے:

"السلام علی جعفر بن عقیل بن ابی طالب 'لعن اللہ قاتلہ ورامیہ بشر بن حوط الھمدانی"

۳۔ عبدالرحمن بن عقیل بن ابی طالب

آپ کا ذکر کتاب "انصار الحسینؑ" میں محمد مہدی شمس الدین نے صفحہ ۱۱۵ پر کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب "ابصار العین فی انصار الحسینؑ" صفحہ ۵۱ پر بھی آپ کا ذکر آیا ہے ابوالفرج اصفہانی "مقاتل الطالبین" صفحہ ۶۱ پر لکھتے ہیں کہ آپ کی والدہ ام ولد تھیں۔

ابن شہر آشوب نے مناقب میں لکھا ہے کہ اصحاب کے شہید ہو جانے کے بعد آپ میدان میں گئے اور دشمن سے مخاطب ہو کر یوں رجز پڑھا:

ابی عقیل فاعرفوا مکانی من ھاشم وھاشم اخوانی

کھول صدق سادۃ الاقران ھذا حسین شامخ البنیان

وسید الشیب مع الشبان

"اے لشکر والو! مجھے پہچان لو میری قدر و منزلت کو جان لو میں عقیل کا بیٹا ہوں۔ میں ہاشمی ہوں اور میرے برادران ہاشمی ہیں۔ سادات اور بچوں کے رئیس ہم ہیں۔ یہ حسینؑ شاہ عالی مکان ہیں' جوانوں اور بوڑھوں کے سردار ہیں"۔

آپ نے دشمن کے سولہ (۱۶) آدمیوں کو قتل کیا۔ آپ کو عثمان بن خالد ابن اسید جھنی اور بشر بن خوط الہمدانی نے شہید کیا جیسا کہ زیارت ناحیہ میں مذکور ہے:

"السلام علی عبد الرحمٰن بن عقیل بن ابی طالب لعن اللّٰہ قاتلہ و رامیہ عثمان بن خالد بن اسید الجھنی"۔

۴۔ محمد بن ابی سعید بن عقیل بن ابیطالب

ابوالفرج اصفہانی نے اپنی کتاب "مقاتل الطالبین" میں صفحہ ۶۲ پر محمد بن شیخ طاہری سماوی نے کتاب "ابصار العین فی انصار الحسینؑ" میں صفحہ ۱۱۶ پر ان کا ذکر کیا ہے ان کی ماں ام ولد تھی۔ لقیط بن یاسر الجھنی نے آپ کو شہید کیا۔

زیارت ناحیہ میں آیا ہے:

"السلام علی محمد بن ابی سعید بن عقیل بن ابیطالب و لعن اللّٰہ قاتلہ لقیط بن یاسر الجھنی"۔

۵۔ محمد بن مسلم بن عقیل بن ابیطالب

ان کا ذکر محمد بن شیخ طاہر سماوی نے اپنی کتاب "انصار الحسینؑ" کے صفحہ ۱۵۰ اور محمد مہدی شمس الدین نے "انصار الحسینؑ" کے صفحہ ۱۱۸ پر کیا ہے۔ مامقانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ محمد بن مسلم کی عمر تیرہ سال تھی، آپ بھی امام حسینؑ کے ساتھ شریک تھے۔ زیارت ناحیہ میں آپ کا نام بھی آیا ہے: **(السلام علی محمد بن مسلم)**

سفرائے شہداء:

۱۔ سلیمان بن زرین

۲۔ عبداللہ بن یقطر الحمیری

۳۔ قیس بن مسہر صیداوی

افسانۂ طفلانِ مسلمؑ

زیارت امام حسین - کے فقرات جانگداز کے مطابق' اہل زمین و آسمان پر پڑنے والی تمام مصیبتوں میں سب سے عظیم اور نا قابل برداشت مصیبت' مصیبتِ روز عاشورا اور مصیبت امام حسینؑ ہے یوں تو تمام اہل بیت اطہارؑ اور ائمہ طاہرینؑ طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار رہے لیکن خود ائمہ طاہرینؑ کے فرمان کے تحت تاریخ بشریت و تاریخ اسلام میں امام حسینؑ پر پڑنے والی مصیبت کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ واقعہ کربلا میں ہر مصیبت کا مرکز حسینؑ ہیں۔ باقی تمام مصیبتیں اس کی شاخیں اور ریشے ہیں۔ تمام اصحاب و انصار اور جوانان بنی ہاشم نے اپنے اوپر پڑنے والی ہر مصیبت و الم کو حسینؑ کی مصیبت پر قربان کیا۔ ان ہستیوں نے تمام تر ناگوار اور نا قابل برداشت حالات میں بھی اپنی جانوں کو نہایت ہی حقیر گردانتے ہوئے حسینؑ کی بقا کے لئے پروانہ بننے کو اپنے لئے شرف و افتخار سمجھا۔

دشمنان اسلام اور دشمنان اہل بیت کی نظروں میں حسینؑ کانٹا بن کر کھٹک رہے تھے۔ خود حضرت امام حسین - نے شب عاشورا اپنے جان نثاروں سے فرمایا کہ "اس لشکر اعداء کو صرف مجھ سے دشمنی ہے' اگر مجھے قتل کرنے کا موقع مل جائے تو دوسروں سے صرف نظر کریں گے۔ انہیں کسی اور کو قتل کرنے کی خواہش نہیں۔ وہ صرف مجھ سے سروکار رکھتے ہیں۔ بنابراین میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ سب یہاں سے چلے جائیں اور مجھے اس میدان میں تنہا چھوڑ دیں"۔ آپ کے ان خیالات کی تائید مندرجہ ذیل واقعات سے بھی ہوتی ہے:

۱۔ شمر کا حضرت ابوالفضل العباسؑ اور ان کے بھائیوں کے نام امان نامہ لیکر آنا۔

۲۔ روز عاشورا لشکر عمر سعد سے کسی کا حضرت علی اکبرؑ سے کہنا کہ "آپ کا رشتہ بیت خلافت سے ہے' اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو امان دیں گے"۔

۳۔ روز عاشورا سے پہلے جب کچھ اصحاب حسینؑ پانی لینے کے لئے نہر فرات گئے تو نہر پر متعین محافظوں نے کہا کہ "آپ لوگوں کو اجازت ہے جتنا پانی چاہیں پی سکتے ہیں لیکن حسینؑ تک پانی لے جانے کی اجازت

ہرگز نہیں"۔

مندرجہ بالا واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انکی دشمنی صرف حسینؑ سے تھی' صرف آپ کی ذات بابرکات انکی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ جس طرح زندگی میں آپ کی ذات دشمنان اسلام کی نظروں میں کانٹا بنی ہوئی تھی' اسی طرح بعد شہادت بھی ان ظالموں نے قبر حسینؑ کے ساتھ اپنی دشمنی کو جاری رکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ظالم حکمرانوں نے بار بار آپکی قبر مبارک کو مسمار کرنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ بفضل خدا تربت امام حسین - آج بھی ظلم کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔ آج بھی ہر مصیبت کا مرکز حسینؑ ہیں تاہم مصیبت حسینؑ کے ساتھ ان ذوات پاک کی مصیبتوں کا بھی ایک مناسب حد تک تذکرہ ہونا چاہیے جو عشق و ولائے حسینی میں' جذبۂ فداکاری و ایثار سے سرشار ہو کر' علم و معرفت و آگاہی رکھتے ہوئے' جرأت و شہامت کے ساتھ حسینؑ کے رکاب میں شہید ہونے کو اپنے لئے سعادت و افتخار سمجھتے تھے۔

اس حوالے سے ہمیں ایک شہید کی یاد بار بار آتی ہے۔ ایام عزا میں ہم اس شہید کی قربانی اور فداکاری کا صحیح معنوں میں حق ادا نہیں کرتے۔ وہ ہستی حضرت ہانی بن عروہ کی ذات گرامی ہے جس نے عبید اللہ ابن زیاد جیسے طاغی کے سامنے کہا: "میں اپنے مہمان کو تیرے حوالے نہیں کرسکتا' چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔ کیا ہم میں اس وقت کوئی ایسا ہے جو خود کو اس طرح پیش کر سکے؟ غرض یہ کہ حسینؑ کے ان اصحاب باوفا کا بھی مجالس عاشورا میں ذکر ہونا چاہیے' البتہ ایسا ذکر نہیں کہ جس سے خود مرکز مصیبت یعنی حسینؑ ابن علیؑ کا ذکر پسِ پشت چلا جائے۔

المیہ یہ ہے کہ بہت سی بظاہر دلسوز مصیبتیں اور من گھڑت کہانیاں واقعہ کربلا میں داخل کر دی گئی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ امام حسینؑ کے مصائب پسِ پشت چلے جاتے ہیں کیونکہ یہ جعلی قصے کہانیاں زیادہ بیان ہوتے ہیں۔ صورت حال یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اگر ان جعلی واقعات کو مصائب کے بیان سے نکال دیا جائے تو شاید کربلا ہی غلط محسوس ہونے لگے۔ بیان کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ باتیں من گھڑت ہیں' لیکن اسکے باوجود ان کہانیوں' قصوں اور افسانوں کو بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ لوگ ان باتوں سے مستفیض ہوتے ہیں

پھر خود ان ذاکرین کو بھی اس سے مادّی شہرت اور نام و نمود حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ان چیزوں کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم خود کو عند اللہ و عند الرسول جوابدہ تصور کرتے ہیں اور دین و مذہب کے حوالہ سے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کی نشاندہی کریں۔

ان بیان کی جانے والی جعلی کہانیوں میں سے ایک کہانی مسلم بن عقیل کے دو بچوں سے متعلق ہے۔ ہمارے ہاں عشرۂ محرم میں ایک دن ان بچوں کی مصیبت کے بیان کیلئے مختص ہوتا ہے۔ بالغرض صحت و واقعیت ایک دن اس قصہ کیلئے مختص کرنے کی منطق اور توجیہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رونے رلانے کیلئے یہ ایک اشک آور مصیبت ہے۔ جبکہ مسلم کے وہ حقیقی دو فرزند جنکے متعلق مقاتل میں ملتا ہے کہ کربلا میں سب سے پہلے شہید ہونے والوں میں سے ہیں' انکا ذکر کہیں نہیں ہوتا۔ آیئے تاریخ کے صفحات میں تلاش کرتے ہیں کہ آیا اس قصہ کے صحیح ہونے کیلئے مقاتل نگاروں یا سیرت نگاروں نے کوئی مہر صحت ثبت بھی کی ہے؟ یا کم از کم عقل اور وجدان کے موازنہ کے ساتھ اس قصہ کی کوئی صورتحال بنتی بھی ہے؟۔

کتاب امالی السبطین' اسرار الشہادۃ' ریاض القدس وغیرہ میں امالی الشیخ صدوق سے نقل ہے کہ "مسلم کے دو بچے تھے جن میں سے ایک کا نام محمد اور دوسرے کا ابراہیم تھا۔ ان دونوں نے ایک طویل عرصہ عبید اللہ بن زیاد کے زندان میں گزارا۔ اس دوران انہیں دن کو روزہ رکھنا پڑتا تھا کیونکہ انہیں کھانے پینے کی سہولتوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ایک روز اچانک انہیں خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنا تعارف زندان بان سے کرائیں۔ زندان بان کا نام مشکور تھا جو دوستدار اہل بیت تھا۔ ان دونوں نے زندان بان سے پیغمبر اسلامؐ علی مرتضیٰؑ' زہرائے مرضیہؑ' امام حسنؑ و امام حسینؑ کے حوالے سے جب اپنا تعارف کرایا تو اسے ان پر رحم آ گیا۔ اس نے زندان کے دروازے کھول کر انہیں رہا کر دیا۔ زندان سے نکلنے کے بعد وہ ایک فرضی مومنہ کے گھر میں پناہ گزین ہوئے لیکن اس کے شقی بیٹے نے ان دونوں کو نہر فرات پر لے جا کر شہید کر دیا"۔

اس داستان پر اپنا انتقاد پیش کرنے سے پہلے ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ یہ دونوں بچے عبید اللہ ابن زیاد کے زندان میں الگ سے تنہائی میں کیسے اسیر ہوئے؟ کوفہ کے حالات میں اتنے نشیب و فراز آتے رہے حتیٰ واقعہ

کربلا رونما ہو گیا لیکن ان بچوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا' نہ عبید اللہ ابن زیاد کا' نہ زندان بان کا اور نہ ہی کسی اور کا۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ دونوں بچے زندان میں کیسے پہنچے؟ جن کتب مقاتل میں اس قصے کا ذکر آیا ہے' ہر ایک نے مختلف روداد بیان کی ہے مثلاً:

۱۔ پہلی نقل: وہ دونوں بچے نابالغ تھے۔ حضرت مسلم ان کو اپنے ساتھ کوفہ لیکر آئے تھے۔ جس وقت حضرت مسلمؑ ہانی کے گھر سے عبید اللہ بن زیاد کے خلاف قیام کیلئے نکلے تو ان دونوں بچوں کو قاضی شریح کے سپرد کر گئے اس نقل کو بنیاد بنانے والوں کو درج ذیل سوالات کا سامنا ہے:

(الف) مسلم بن عقیل ایک اہم نمائندگی کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوفہ تشریف لے گئے تھے۔ اپنے تمام اہل خانہ حتیٰ بڑے بیٹوں کو بھی چھوڑ کر صرف ان دو چھوٹے نونہالوں کو کوفہ ساتھ لے جانے کی کیا منطق ہو سکتی ہے؟

(ب) جو افراد اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کسی کتاب میں نقل کئے گئے قصوں کو کافی سمجھتے ہیں' ان سے ایک سوال یہ ہے کہ جب مکہ سے کوفہ جاتے ہوئے حضرت مسلم کے دو اجیر راہنما پیاس کی شدت کی تاب نہ لا کر راستہ میں ہی جان بحق ہو گئے تو کم سن بچے کس طرح زندہ بچ سکے؟

(ج) جس وقت مسلم بن عقیل نے ہانی کا گھر چھوڑا اس وقت قاضی شریح تمام کتب تاریخ کے مطابق عبید اللہ بن زیاد کے قصر میں تھا۔ ہانی کو قید سے چھڑوانے کیلئے آنے والوں کو عبید اللہ ابن زیاد کے حکم پر' اسی قاضی شریح نے بام قصر سے یقین دلایا تھا کہ ہانی صحیح و سالم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاضی شریح اس دار الامارہ میں ہی تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں جناب مسلم نے بچوں کو کیسے اس کے پاس چھوڑا؟

(د) قاضی شریح ہر آن اور ہر لحظہ عبید اللہ ابن زیاد کی خوشنودی کی خاطر دروغ گوئی کرتا تھا اور اپنے جھوٹ کو توریہ قرار دیتا تھا۔ ہر لحظہ اپنے ظاہری مذہبی حلیہ کو بچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ان حالات میں کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ عبید اللہ ابن زیاد کی اجازت کے بغیر وہ دو بچوں کو پناہ دینے کی جرأت کر سکتا تھا؟

(ذ) آیا کسی بھی تاریخ میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ مکہ سے نکلتے وقت مسلم ان دو بچوں کو ساتھ لیکر روانہ ہوئے تھے؟

۲۔ دوسری نقل: بعض مقاتل میں یوں بیان ہوا ہے کہ یہ دو بچے روز عاشورا کرب واضطراب کی وجہ سے حواس باختہ ہو کر بے حسی اور بے شعوری کے عالم میں میدان کربلا سے بھاگ نکلے۔انہوں نے قبیلۂ طے کے کسی گھر میں پناہ لی اور وہیں سے اسیر ہو کر عبیداللہ بن زیاد کے سپرد ہوئے ۔اس نقل کے حامیوں کے سامنے یہ چند سوالات ہیں:

(الف) جب تک جوانان بنی ہاشم موجود تھے، وہ خیام امام حسینؑ کی پاسداری کرتے رہے۔وہ ان خیموں میں موجود بچوں اور خواتین کی حفاظت کرتے تھے اور ہمہ وقت دشمن کے خطرات سے چوکنا رہتے تھے ان کے شہید ہو جانے کے بعد جناب زینب = اورام کلثوم = نے بچوں کی نگہداری فرمائی ۔پھر یہ بچے خیمے سے کیسے نکل گئے؟

(ب) امام حسینؑ کی شہادت کے بعد بعض مقاتل کے مطابق زینب وام کلثوم سلام اللہ علیہما نے اسی رات تمام بچوں کو شمار کیا اور جو بچے خیمے میں نہیں ملے، انکی تلاش کیلئے میدان میں نکلیں ۔لیکن گم ہونے والے بچوں میں ان دو بچوں کا ذکر کسی مقتل میں نہیں ملتا۔

(ج) میدان کربلا کا عمر ابن سعد کے تیس ہزار لشکر نے تین طرف سے اس طرح سے محاصرہ کیا ہوا تھا کہ نہ کوئی وہاں سے نکل سکتا تھا، نہ داخل ہو سکتا تھا۔ان حالات میں یہ بچے وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے؟

(د) عام حالات میں کربلا سے کوفہ دو دن کی مسافت پر ہے۔ان نامساعد حالات میں یہ دو بچے کیسے میدان سے نکل کر قبیلۂ طے کے کسی گھر میں پناہ گزین ہوئے؟

(ہ) بنی طے کے جس شخص نے ان کی یتیمی پر رحم کھا کر پناہ دی تھی، اس نے ان کو عبیداللہ بن زیاد کے سپرد کیوں کیا؟

(و) زندان میں پہنچنے کے بعد یہ دونوں بچے بغیر افطار و سحر ایک سال تک مسلسل روزہ رکھتے رہے۔اگر بالغ نہیں تھے تو ایک سال تک مسلسل روزہ رکھنے کی تاب، ایسے حالات میں کہ جہاں افطار و سحر بھی میسر نہ ہو، کیسے ممکن تھی ۔اسکا مطلب یہ ہوا کہ کم سے کم قریب بلوغ ضرور تھے۔

کربلا میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ آٹھ دس سال کے بچے پورے شعور و آگاہی کے ساتھ مقتل میں

جا کر شہید ہوئے۔آخر یہ کیسے حواس باختہ ہو کر وہاں سے نکل گئے؟

(ز) اور اگر یہ دونوں شعور و آگاہی کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگے، محض اس لئے کہ انہیں اپنی جان کے تحفظ کی فکر تھی تو پھر انکی مصیبتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کی کیا منطق ہے؟

۳۔ تیسری نقل: بعض ارباب مقاتل نے اس داستان کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسرائے اہل بیت میں یہ بچے بھی شامل تھے۔بعد میں یہ بچے دیگر اسراء سے بچھڑ کر الگ سے اسیر ہوئے اور زندان میں پہنچے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

(الف) جن اسراء کی تحفظ و نگرانی دو طرف سے تھی، یعنی ایک طرف حضرت زینب وام کلثوم سلام اللہ علیہما تمام بچوں پر نظر رکھے ہوئے تھیں اور دوسری جانب عمر سعد کی طرف سے متعین محافظین کی کڑی نگرانی ہوتی تھی ان دو طرفہ محافظوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر یہ بچے کیسے بچھڑ گئے؟

(ب) اگر بالفرض محال وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے یا قافلہ سے بچھڑ گئے تو کیا کسی کتاب میں ملتا ہے کہ حضرت زینب وام کلثوم سلام اللہ علیہما نے ان بچوں کے گم ہونے کے بارے میں کوئی آواز بلند کی ہو یا اظہار افسوس کیا ہو؟

(ج) ان دونوں کے گم ہونے کے بعد عمر سعد کے اسراء کی نگرانی پر مامور محافظین سے کیا باز پرس نہ ہوئی ہوگی؟ کیا اس سلسلے میں تاریخ میں کہیں کوئی اشارہ ملتا ہے؟

(د) اسیروں کے اس قافلہ میں ان دو بچوں کے کئی عزیز و اقاریب موجود تھے ۔اولاد مسلم میں جناب مسلم کی ایک بیٹی موجود تھیں۔علاوہ ازیں ان بچوں کی ماں یا مائیں بھی ہونگی۔کیا ان میں سے کسی نے بھی بچوں کی گمشدگی پر فریاد بلند نہیں کی؟

(ہ) جب یہ دو بچے گرفتار ہوئے تو کیا انکو اہل بیت کے بچے سمجھ کر زندان میں ڈالا گیا تھا؟ اگر اس مفروضہ کو درست مان لیا جائے تو ان بچوں کو بھی باقی اہل بیت کے ساتھ شامل ہونا چاہئے تھا جو کم از کم دس دن کوفہ میں رہے۔دیگر اہل بیت سے جدا کسی زندان میں رکھنے کی کیا منطق ہو سکتی ہے؟ ایسا یا تو کسی سخت جرم کی

بناپر کوئی سخت سزا دینے کیلئے کیا جاتا ہے' جب کہ ان بچوں کا کوئی جرم نہیں تھا یا پھر امتیازیا رعایت دینے کیلئے قیدی کو الگ رکھا جاتا ہے جبکہ ان کے لئے ایسی کسی رعایت کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

پس ان بچوں کے زندان میں پہنچنے کے بارے میں بعض کتابوں میں موجود یہ تینوں مفروضے بعید از عقل وقیاس ہیں۔

زندان بان کے حوالے سے اشکالات:

(۱) زندان بان کا نام مشکور بتایا جاتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دوستدار اہل بیت تھا۔ اس کی نگرانی میں دو ایسے معصوم و بے قصور مثل چاند بند نونہال تھے جو نماز' روزے' آداب و دعا میں ایک صحیح مسلمان تو یقیناً نظر آئے ہونگے۔ ان سے دشمنیٔ اہل بیت کے آثار تو ظاہر نہیں ہوئے ہونگے پھر کیا وجہ ہے کہ ایک سال تک اسے خیال نہیں آیا کہ ان بچوں سے دریافت کرے کہ وہ کون ہیں، کیسے اور کہاں سے وہاں پہنچے؟ یہ سوال کرنے میں یقیناً اس کے لئے کسی قسم کا خطرہ نظر نہیں آتا۔

(۲) کیا کسی اہل بیت کے ماننے والے کیلئے ممکن ہے کہ دو معصوم' پاکباز و پاکدامن مسلمان بچے وہ بھی بے قصور و نابالغ' آثارِ شکستگی یتیمی جن کے چہروں پر نمایاں ہو' اس کے ہاتھوں ایک سال اسیر رہیں اور وہ اس سلسلے میں نہ تو پوچھ گچھ کرے اور نہ ہی کوئی رعایت برتے۔

خود بچوں کے حوالے سے اشکالات:

۱۔ یہ دو اطفال ایک سال تک زندان میں اسیر رہے لیکن پورے سال انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ زندان بان سے کسی بھی زاویئے سے' اگر اسلامی بھائی چارگی کے نقطۂ نظر سے نہیں تو کم از کم انسانیت کی بنیاد پر ہی سہی' زندان سے باہر کے حالات معلوم کرتے۔ کچھ نہ سہی' زندان کی زندگی کے بارے میں ہی پوچھتے۔ سال گزرنے کے بعد اچانک یہ معلوم کرنے کا خیال انہیں کیوں آیا؟ اسکے کیا محرکات ہیں؟

۲۔ ہمیں پہلے مسلم کے خاندان اور گھرانے سے متعلق معلومات ہونا چاہئے۔ یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ان کی کتنی بیویاں تھیں اور ان بیویوں سے کتنے بچے تھے۔ کتبِ مقاتل سے پتہ چلتا ہے کہ انکی ایک بیٹی تھی اور

ان کے بچے تھے۔ جب امامؑ نے منزل ثعلبیہ پر حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سنی تو آپؑ نے مسلم کی بچی کو پیار کیا اور انکی اولاد کو تسلی دی۔ اسی طرح روز عاشورا جب آپؑ اصحاب کو رخصت فرما رہے تھے تو بنی ہاشم' بالخصوص اولادِ مسلم سے کہا کہ "تمہارے لئے مسلم کی شہادت کافی ہے' اب مزید قربانیوں کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا آپ لوگ چلے جایئے"۔ لیکن آفرین ہے ان حق شناسوں پر کہ اس کے باوجود انھوں نے آپؑ کے رکاب میں شہید ہونے کو زندہ رہنے پر ترجیح دی۔

۳۔ کربلا میں بنی ہاشم کے شہداء میں سب سے زیادہ تعداد اولادِ عقیل کی ہے اور ان ہی میں حضرت مسلم کے دو بیٹوں یعنی عبداللہ بن مسلم بن عقیل او رمحمد بن مسلم بن عقیل کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں تک محمد بن مسلم بن عقیل کا تعلق ہے' یہ بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ آپ کربلا کے شہداء میں شامل ہیں۔ بعض روایات کے مطابق آپ بنی ہاشم میں سب سے پہلے شہید ہونے والوں میں سے ہیں۔ ان کے علاوہ مسلم کے دو بچوں کی شہادت کا ذکر ایک فرضی قصہ' یا افسانہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کا ایک او رثبوت انکے نام سے موسوم وہ ضریح ہے جو مسیّب میں واقع ہے۔ ان بچوں کی شہادت کی بارے میں بیان ہے کہ ملعون حارث نے ان کو نہرِ فرات پر شہید کیا' ان کے سروں کو عبیداللہ ابن زیاد کے پاس لے گیا اور جسد ہائے پاک کو فرات کی موجوں میں پھینک دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہرِ فرات مسیّب سے نہیں گزرتی۔ خود یہ حقیقت اس واقعہ کو فرضی افسانہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اگر کوئی یہ جواز پیش کرے کہ اتنے عرصے سے ان دو بچوں کے نام پر موجود آستانے اور مزار کیا ان کے الگ سے شہید ہونے اور وہاں دفن ہونے کی دلیل نہیں؟ تو اس سلسلے میں ہم عرض کرینگے کہ بارگاہوں اور ضریحوں کا کسی کے نام سے موسوم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوا کرتے کہ انکی شہادت بھی وہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت زینب کبریٰ ☆ کے نام سے منسوب ضریحیں تین مقامات پر موجود ہیں: ایک شام میں دوسری مصر میں اور تیسری اصفہان میں۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں مقامات میں سے کسی ایک جگہ پر ہی آپکا جسد پاک مدفون ہے؟

علاوہ ازیں ہمارے ملک عزیز پاکستان کے طول وارض میں کتنی ہی سونے چاندی سے آراستہ ضریحیں

حضرت ابوالفضل العباسؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک بھی ضریح کے اندر آپ کا جسد پاک ہے؟ جس طرح ذاکرین و خطیب حضرات اپنے ذاتی مفادات و مقاصد کو مقصدِ حسینؑ پر فوقیت دیتے ہیں' اسی طرح ان بارگاہوں سے انکے خدام وغیرہ کے اپنے ذاتی مفادات وابستہ ہیں۔

found.

آلِ طیار

طیار امیر المومنین حضرت علی ؑ کے بڑے بھائی جعفر کا لقب تھا۔علمائے رجال آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ اس وقت آلِ ہاشم میں سب سے زیادہ خَلق و خُلق کے اعتبار سے رسول اللہؐ سے شباہت رکھتے تھے رسول اللہؐ پر ایمان لانے والوں میں حضرت علی ؑ کے بعد آپ دوسرے شخص ہیں۔آپ کو پیغمبر اسلامؐ نے مکہ سے حبش ہجرت کرنے والے وفد کا سربراہ مقرر کیا اور اسلام و پیغمبر اسلامؐ کا ترجمان معین فرمایا۔حبش میں چند سال ہجرت کی زندگی گزارنے کے بعد فتح خیبر کے موقع پر جب آپ کا استقبال کیا اور فرمایا: ''جعفر! میں حیران ہوں کہ کس بات پر زیادہ خوشی و مسرت کا اظہار کروں' آپ کی آمد پر یا آپ کے بھائی علیؑ کے ہاتھوں فتح خیبر پر؟'' پہلے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کرنے کی بنا پر آپ کو ''صاحب ہجرتین'' بھی کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے سرزمین شام میں ''موتہ'' نامی جگہ پر جنگ کے لئے لشکر روانہ کرتے وقت اس کی قیادت و رہبری زید بن حارث کو سونپی اور انکی شہادت کی صورت میں اس قیادت کے لئے آپ کو نامزد فرمایا۔آپ اسی جنگ میں شہید ہوئے۔اس جنگ میں حضرت جعفر کے دونوں ہاتھ شہید ہوئے تھے اور جسم پر ستر سے زیادہ زخم آئے تھے۔پیغمبر اسلامؐ نے آپ کیلئے دعا فرمائی کہ خداوند انہیں پر عطا فرما چنانچہ خداوند عالم نے کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ انہیں دو پر عطا کئے۔اس بنا پر آپ کو ''ذوالجناحین'' کہتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی ؑ نے معاویہ کے نام خط میں جعفر طیار کے بھائی ہونے پر افتخار کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہمارے شہید جنت میں طیار بن جاتے ہیں''۔اسی طرح حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں اپنے ایک

خطبے میں فرمایا کہ ''خدا نے جعفر طیار کو دو پر عنایت کیے ہیں کہ جن سے وہ جنت میں پرواز کرتے ہیں۔کیا وہ ہمارے چچا نہیں؟'' امام سجادؑ نے دمشق میں خطبہ میں فرمایا کہ ''جعفر طیار ہمارے خاندان سے ہیں''۔

ارباب علم الانساب نے آپکی مختلف کنیات بیان کی ہیں ان میں سے ایک ابوالمساکین اور دوسری ابوعبداللہ ہے۔آپ کے بیٹے عبداللہ عقیلۂ قریش حضرت زینب کبریٰ = کے شوہر ہیں۔جناب عبداللہ بن جعفر بعثت کے تیسرے سال پیدا ہوئے جسوقت آنحضرتؐ نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی' آپ کی عمر دس سال تھی۔جناب عبداللہ ہمیشہ حضرت علی ؑ کے ساتھ رہے' جنگ صفین میں آپ کے ہمرکاب تھے' جنگ جمل میں صاحب رائت تھے۔حضرت علی ؑ کی شہادت کے بعد آپ امام حسنؑ و حسینؑ کے ساتھ رہے۔

جب امام حسینؑ مدینہ و مکہ چھوڑ کر عازم سفر ہوئے تو عبداللہ نے اپنے دو بیٹوں عون اور محمد کو ایک خط دے کر امامؑ کی خدمت میں بھیجا اور ان سے کہا کہ جہاں کہیں بھی امامؑ سے ملاقات ہو' کہنا کہ میں بھی پہنچ رہا ہوں' میرا انتظار کریں۔اس طرح گویا جناب عبداللہ نے امام حسینؑ کو اس سفر سے روکنے کی کوشش کی۔لیکن چونکہ امام معصومؑ ارادہ کر چکے تھے' اس لئے کسی صورت میں بھی رکنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔جب عبداللہ نے دیکھا کہ امامؑ رکنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں تو اپنے دونوں فرزندوں کو امامؑ کی رکاب میں چھوڑ کر، خود آنکھوں سے معذور ہونے کی وجہ سے مدینہ چلے آئے۔یہ دونوں فرزند تا دم آخر امامؑ عالی قدر کے ساتھ رہے۔

عون بن عبداللہ محقیلۂ قریش حضرت زینب = کے بطن مبارک سے تھے جبکہ محمد بن عبداللہ کی ماں' جیسا کہ مقاتل الطالبین' طبری' مسعودی اور خوارزمی وغیرہ نے لکھا ہے' خوصہ بنت ثقیف تھیں، جو خاندان بکر بن مائل سے تعلق رکھتی تھیں۔جناب عبداللہ خود تو کربلا نہیں پہنچ سکے لیکن اپنے دونوں فرزندوں کے امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہونے کو اپنے لئے فخر اور اعزاز سمجھتے تھے۔کربلا میں غیر حاضری پر جو افسوس و حسرت تھی' اسکا مداوا یہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ اگرچہ میں خود کربلا نہیں جا سکا لیکن میرے دو بیٹوں نے امام حسینؑ کی رکاب میں شہادت پائی

روز عاشورا جناب عون نے میدان میں یہ رجز پڑھا:

ان تنكروني فانا ابن جعفر شهيد صدق في الجنان ازهر

یطیر فیھا بجناح اخضر   کفی بھذا شرفا فی المحشر

''اگر تم مجھے نہیں پہچانتے ہو تو (جان لو کہ) میں فرزندِ جعفر ہوں، میں صدق و صداقت کے شہید جعفر کا پوتا ہوں وہ جنت میں سبز رنگ کے پروں سے پرواز کرتے ہیں، قیامت میں میرے افتخار کیلئے یہی کافی ہے''۔

محمد بن عبداللہ بن جعفر نے میدان میں آ کر یہ رجز پڑھا:

اشکوا الی اللہ من العدوان   فعال قوم فی الرادی عمیان

قد بدلوا معالم القرآن   ومحکم التنزیل و التبیان

''میں خدا سے دشمنوں کے افعال سے متعلق شکایت کرتا ہوں جو برائی میں گھرے ہوئے ہیں جنہوں نے قرآن کے راستے کو بدل دیا اور تنزیل و تبیان کو چھوڑ دیا''۔

بعض مؤرخین نے آپکے دو اور فرزندوں عبیداللہ بن عبداللہ بن جعفر اور قاسم بن عبداللہ بن جعفر کا ذکر کیا ہے جو کربلا میں شہید ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے نام صحیفۂ کربلا (فارسی) صفحہ ۳۳۹ پر ذکر ہوئے ہیں۔

عبیداللہ بن عبداللہ کا ذکر محمد مہدی شمس الدین نے بھی اپنی کتاب ''انصار الحسینؑ'' میں صفحہ ۱۱۷ پر کیا ہے۔

ابوالفرج اصفہانی بھی عبیداللہ بن عبداللہ کو شہدائے کربلا میں شامل کرتے ہیں۔ آپ کی ماں خوصا بنت حفصہ بن ثقیف بن ثعلبہ بن بکر بن وائل ہیں۔

انکے علاوہ کتاب ''عوالم العلوم امام حسینؑ'' صفحہ ۳۵۹ پر دو اور فرزندوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام ابراہیم بتایا جاتا ہے اور دوسرے کا محمد۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ انہی دونوں کو طفلانِ مسلم کے نام سے بھی مشہور کر دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ کوفہ میں شہید ہوئے ہیں۔ مزید برآں عبداللہ بن جعفر کے ان دو بیٹوں کا ذکر اس کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک فرضی کردار ہیں جنکا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض ان دونوں کو جعفر طیار کی اولاد بتلاتے ہیں۔ یہ بھی روتے کو ہنسا دینے والی بات ہے کیونکہ حضرت جعفر طیار پیغمبرؐ کی حیات میں جنگ موتہ میں شہید ہوئے تھے جبکہ واقعہ کربلا سنہ ۶۱ ہجری میں رونما ہوا۔ غرض یہ کہ

اگر یہ جعفر طیار کے بیٹے تھے تو ان کی عمر پچاس سال سے بھی زائد ہونا چاہئے۔ اگر اس بات کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی پچاس سالہ شخص لشکر سے فرار ہو جائے اور اسے بچہ قرار دیا جائے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ جناب اسماء بنت عمیس جن کا ذکر ہم نے زوجات امیر المومنینؑ میں کیا ہے پہلے حضرت جعفر طیار کے عقد میں تھیں۔ حضرت جعفر طیار نے جب حبشہ ہجرت فرمائی تو جناب اسماء بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ وہیں پر خدا نے آپ کو تین فرزند عطا فرمائے، جن میں ایک کا نام عبداللہ ہے۔ یہ سب سے پہلا مسلمان بچہ تھا جو خَلق و خُلق میں پیغمبر اسلامؐ سے مشابہ تھا۔ دیگر دو فرزند عون اور محمد ہیں۔ محمد کی شان میں حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ میرے چچا ابو طالب سے شباہت رکھتا ہے حضرت جعفر کے کُل آٹھ بیٹے تھے جنکے نام یہ ہیں: عبداللہ، عون، محمد اکبر، محمد اصغر، حمید، حسین، عبداللہ اصغر اور عبداللہ اکبر۔ ان سب کی ماں جناب اسماء بنت عمیس ہیں۔ نسل جعفر آپ کے فرزند محمد اکبر سے پھیلی ہے حضرت جعفر طیار سنہ ۸ ہجری میں جنگ موتہ میں شہید ہوئے آپکی قبر جنت البقیع میں ہے۔

کتاب ''استعیاب'' جلد ۳، صفحہ ۶۱ اور کتاب ''اصابہ'' جلد ۳، صفحہ ۱۲ پر نقل ہے کہ جناب جعفر طیار کے دو فرزند عون اور محمد سنہ ۱۷ ہجری میں جنگ تستر میں شہید ہوئے تھے۔

found.

آلِ علی -

آلِ علی -سے ہماری مراد آپ کی وہ اولادِ ذکور و اناث اور ازواج مطہرات ہیں جن کا ذکر مؤرخین و محققین تاریخ و سیر نے کیا ہے اور اس پر اپنی مہر تصدیق بھی ثبت کی ہے۔

ہمیں اس موضوع پر تحقیق و تدقیق کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض بری نیت کے حامل افراد نے دانستہ طور پر اور بعض نے نادانستہ طور پر اپنے دنیوی مفادات کی خاطر قیام مقدس امام حسینؑ کا ہدف صرف رونے اور رلانے کو قرار دیا ہے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کہانی اور افسانہ سازی کی راہ کو اختیار کیا ہے۔ اس طرح یہ لوگ ائمہؑ کی اولاد و ازواج سے منسوب ایسے ایسے مصائب بیان کرتے ہیں جن کا یا تو سرے سے وجود ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو جیسا یہ لوگ بیان کرتے ہیں ویسا نہیں ہے۔

بعض افراد جو اس سلسلے میں تھوڑے بہت انصاف پسند ہیں' کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ واقعہ غلط ہو لیکن رونے رلانے میں اس کے ذکر سے مدد ملتی ہے۔ انکے خیال کے مطابق اس مقصد کیلئے اس قسم کی داستانیں بیان کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں بلکہ تاریخی اسناد کے حوالے کے ساتھ اس طرح رلانے کی اجازت ہے۔ ان وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کربلا میں موجود ہر آل کے بارے میں طبیعی اور عقلی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر قلم اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

اجمالی بیان

صاحب کتاب "عمدۃ الطالب فی انساب آل ابیطالب" سید جمال الدین بن عنبہ' متوفی سنہ ۸۲۸ ہجری' اپنی کتاب کے صفحہ ۶۳ پر اولادِ علیؑ کا ذکر کرتے ہوئے دو قسم کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ پہلے قول کے مطابق آپ

ؑ کی کل چھتیس (۳۶) اولادیں ہیں یعنی اٹھارہ (۱۸) بیٹے اور اٹھارہ (۱۸) بیٹیاں۔ بعض دوسرے مورخین کے مطابق یہ تعداد پینتیس (۳۵) ہے جس میں بیٹوں کی تعداد انیس (۱۹) بتائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ آپ کی نسل تیرہ (۱۳) اولادوں کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلی ہے ان کی تفصیل کے بیان میں مزید تین' چار اولادوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ان چھتیس (۳۶) یا پینتیس (۳۵) اولادِ ذکور و اناث کی تفصیل پیش کرنے کیلئے ہم نے آپ کی ازواج کو عنوان بنایا ہے تا کہ ازواج کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان سے پیدا ہونے والی اولادوں کا بھی ذکر ہو جائے۔ ازواج سے متعلق تحقیق کے دوران' ان کی ازدواجی ترتیب بھی معلوم ہو جائے گی اور ان سے منسوب اولاد کا تذکرہ بھی آ جائے گا۔ آخر میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان ازواج میں کس کس کی اولادیں کربلا میں شہید یا اسیر ہوئیں۔ چنانچہ حتی المقدر ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کی ازواج کو حسب ترتیب ازواج پیش کیا جائے۔

(الف) حضرت فاطمہ زہرا = دختر گرامی خاتم الانبیاء ﷺ

تمام مؤرخین سیرت و مقتل متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ حضرت زہرا = آپؑ کی سب سے پہلی زوجہ ہیں۔ پیغمبرؐ سے منقول مستند حدیث ہے:

"اگر زہرا نہ ہوتیں تو علیؑ کا کوئی کفو نہ ہوتا اور اگر علیؑ نہ ہوتے تو زہراؑ کیلئے کفو نہ ہوتا"۔

گویا یہ دونوں ہستیاں ایک دوسرے کیلئے ایسے کامل و اتم کفو تھے جس کی مثال ازواج مرد و زن میں نہیں ملتی۔

اس کے برعکس تاریخ میں ایسی صالح ترین عورتیں گزری ہیں جن کے شوہر انتہائی فاسد اور بدترین تھے جیسے مومنہ آل فرعون' جناب آسیہ' زوجۂ فرعون۔ اسی طرح بہت سے ایسے صالح ترین مرد گزرے ہیں جن کی بیویاں فاسد تھیں مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی نافرمان بیویاں۔ ہم یہاں پر صرف انہی دو مثالوں پر اکتفا کرینگے گرچہ کتاریخ میں ایسے بہت سے مصادیق مل جائینگے۔

جن افراد نے ازدواجی زندگی میں اپنے دینی و مذہبی اہداف کو مقدم رکھا ہے ان کیلئے عقد و وفا اور نا روا سلوک پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کیلئے' یہ ذوات بہترین نمونہ ہیں۔

دوسرا نکتہ جو اس حدیث شریف سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ علیؑ کیلئے زہراؑ کے بعد کوئی بھی زوجہ خواہ کتنی ہی صالحہ کیوں نہ ہوں' آپؑ کا کامل کفو نہیں ہو سکتی۔

زہرائے مرضیہؑ سے جو نسلِ علیؑ دنیا میں پھیلی ہے' ان ذوات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ امام حسن مجتبیٰ –

آپؑ ۱۵ رمضان المبارک' سنہ ۳ ہجری کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ۷ یا ۲۸ صفر سنہ ۵۰ ہجری کو مدینہ ہی میں معاویہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سم قاتل سے شہید ہوئے۔ آپؑ کے متعلق مزید تفصیلات آل الحسنؑ کے ذیل میں بیان کی جائیگی۔

۲۔ حضرت امام حسین –

آپؑ ۳ شعبان المعظم سنہ ۴ ہجری کو مدینے میں پیدا ہوئے اور ۱۰ محرم الحرام سنہ ۶۱ ہجری کو کربلا میں شہید ہوئے۔

آپؑ قیام مقدس کربلا کے امام اور رہبر ہیں آپؑ کی ازواج اور اولاد میں سے کون کون اس مصیبت میں آپؑ کے ساتھ شریک تھا' ان سب کا تذکرہ آل الحسینؑ کے ذیل میں خصوصیت کے ساتھ کیا جائے گا۔

۳۔ عقیلہ قریش زینب کبریٰ =

آپ ۵ رجمادی الاولیٰ سنہ ۵ ہجری کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں۔ آپ صحیح معنوں میں قیام امام حسینؑ میں معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ اسی لئے آپ کو "شریکۃ الحسینؑ" کہا جاتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ جس طرح پیغمبر گرامی قدر نے اپنی بیٹی زہراء = کے حق میں فرمایا تھا: "اُم ابیھــا" یعنی باپ کی ماں' اگر کوئی اسی بات کو حضرت زینبؑ کیلئے اسطرح کہے "اُم اخیھا" یعنی اپنے بھائی ماں تو یہ بات غلط نہیں ہوگی کیونکہ "اُم" کے ایک معنی مرکز پناہ و فریاد گاہ بھی ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد و گواہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے بعض مشکل حالات میں حضرت زینبؑ سے پناہ اور مدد حاصل کی ہے۔ چنانچہ ایک لحاظ سے واقعۂ کربلا کے موجد و بانی اگر امام حسینؑ ہیں تو اس کی علت بقیہ اور مقرر و شارح جناب زینب = ہیں۔

قیام امام حسینؑ میں آپ = کا بہت کردار ہے بازار کوفہ میں خطبہ ہو یا مجلس عبید اللہ ابن زیاد میں گفتگو' مجلس یزید میں یزید کو حقیر و ذلیل کرنا ہو یا مدینے میں حکمرانوں کے دارالامارہ کو لوگوں کی نظروں سے گرانا' یہ سب علیؑ کی شیر دل بیٹی کے کردار کی ایک جھلک ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں مجالس عزاء میں مقرر و خطیب حضرات ان مستند و مسلمہ واقعات کو تو طاق نسیان میں رکھ دیتے ہیں اور اُم حبیبہ اور ہند جیسے فرضی کرداروں کے ساتھ مکالمہ آرائی کے تذکرے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں' اصلاً جنکا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اسی طرح مدینہ پہنچنے کے بعد جناب زینبؑ اور ان کے شوہر جناب عبداللہ کے مابین گفتگو کو جس فرسودہ انداز میں بیان کرتے ہیں' وہ نہ عقل سے مطابقت رکھتی ہے' نہ فکر و وجدان سے۔ یہ لوگ اسی قسم کے جعلی اور من گھڑت قصے سنا سنا کر لوگوں کو رُلاتے ہیں۔

ذرا سوچئے! کیا دنیا میں کسی بھی مصیبت زدہ خاتون میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ خود اسکے گھر والے بھی اسے نہ پہچان سکے ہوں۔ اگر مصیبتوں کی زیادتی سے بال سفید بھی ہو گئے ہوں' کمر جھک گئی ہو' چہرے کے خدوخال بدل بھی گئے ہوں' پھر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ انتہائی شناسا افراد کے لئے بالکل ناآشنا ہو جائیں۔ خدا ان کے عزائم کو خاک میں ملائے جو اس طرح سے مصیبت زینبؑ کو مسخ کر رہے ہیں اور اصل گفتارِ زینبؑ کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جناب زینبؑ کی ہستی تو وہ ہے جنھوں نے اپنی جان کو ہدفِ حسینؑ میں محو کر دیا تھا' اپنے لختِ جگر کو میدان کربلا میں خود اپنے ہاتھوں سے درگاہ خدا میں انتہائی اخلاص کے ساتھ پیش کیا۔ آپ کے اس فرزند عزیز کی شہادت کا بیان آل طیار کے ذیل میں ذکر ہو چکا ہے۔

۴۔ اُم کلثومؑ

جناب اُم کلثومؑ حضرت زہرا = کی دوسری بیٹی ہیں آپ سنہ ۶ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئیں۔

جس طرح انسانی معاشرہ میں کسی شخصیت کو مقام دینے یا اس کے مقام کو گرانے کے لئے خواتین کو موثر طور پر استعمال کرنے کی روایت چلی آئی ہے' اسی طرح قوموں کے درمیان لفت و محبت یا افتراق و جدائی اور بغض و عداوت پیدا کرنے کیلئے بھی یہ ایک موثر ہتھیار رہا ہے۔ کوئی بھی قصہ یا واقعہ اس سے خالی نہیں ہے۔

حضرت اُمِ کلثوم دختر رشیدہ فاطمہ زہرا = کی ذات گرامی کو بھی مسلمانوں نے ازدواجی زندگی کے مسائل میں الجھا کر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لوگوں نے اسے آپس میں اختلاف و نفرت اور عداوت پھیلانے یا بغیر کسی مایہ و سرمایہ کے سند بنانے کیلئے استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی جناب اُمِ کلثوم کا حضرت عمر سے عقدِ نکاح کا قصہ ہے۔

شریعت اسلام نے آیات قرآن کی رُو سے کسی کافر اور مسلمان کے مابین زواج کو تو ناممکن قرار دیا ہے لیکن ادنیٰ سے ایمان یعنی اقرار بالسان کا ہونا بھی زواج کے جائز ہونے کیلئے کافی گردانا ہے مرد و زن کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے لئے دوسری شرائط اپنی جگہ لیکن بنیادی شرط کفو ہوتی ہے۔ اس کے باوجود مسئلۂ عقد جناب اُمِ کلثوم میں ایک گروہ کی کوشش ہے کہ جناب اُمِ کلثوم سے حضرت عمرؓ کے عقد زواج کو ثابت کر کے ثانی الذکر کے مقام و منزلت کو بلند کیا جائے جبکہ دوسرے گروہ کا اصرار اس کی نفی میں ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے جناب اُمِ کلثوم کی اہانت اور تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں تاریخی واقعات اور مؤرخین کی نفی و اثبات پر مشتمل ابحاث سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں انہیں ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

شیخ مفید علیہ الرحمۃ اور علامہ بزرگوار بلاغی نے اس زواج کی نفی کی ہے کیونکہ اس کی سند زبیر بن بکار سے ملتی ہے اور زبیر بن بکار کے لئے مشہور ہے کہ وہ حضرت علیؑ سے بغض رکھتا تھا۔ یہ شخص شان بنو ہاشم میں کاٹ چھانٹ کرنے اور مصائب جعل کرنے میں بھی پیش پیش رہا ہے۔ اس نے جناب سکینہ اور فاطمہ صغریٰ کے بارے میں بھی اسی قسم کے جعلی واقعات بیان کئے ہیں۔

آیا جناب اُمِ کلثوم حضرت عمر کے عقد میں تھیں یا نہیں؟ اس بارے میں موجود تاریخی نقول تضاد و تناقض سے بھری ہوئی ہیں۔ اس کے برخلاف یہ بات زیادہ قرین حقیقت ہے کہ جناب اُمِ کلثوم عون بن جعفر کے عقد میں تھیں۔ حضرت عون بن جعفر سنہ ۱۷ ہجری جنگ تستر میں شہید ہو گئے تھے جس کا ذکر کتاب ''استیعاب'' جلد سوم صفحہ ۲۰۱ اور کتاب ''اصابہ'' جلد ۳ صفحہ ۴۴ میں ملتا ہے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جناب اُمِ کلثوم پہلے حضرت عمر کے عقد میں تھیں اور حضرت عمر کے بعد آپ

عون اور اسکے بعد محمد بن جعفر کے عقد میں آئیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ عون بن جعفر حضرت عمر کے دور خلافت میں سنہ ۱۷ ہجری میں جنگ تستر میں شہید ہو گئے تھے لہٰذا حضرت عمر کے بعد آپ کا عون کے عقد میں آنا صریحاً غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب اُمِ کلثوم عون بن جعفر کے عقد میں تھیں اور کبھی بھی حضرت عمر کی زوجیت میں نہیں تھیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر کی ایک زوجہ کا نام بھی اُمِ کلثوم تھا جو جرول خزعی کی دختر تھیں۔

تمام کتب سیر و مقاتل نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ جناب اُمِ کلثوم کربلا میں موجود تھیں۔ اس معرکہ کے سلسلہ میں حیات امام حسینؑ کے واقعات میں یوم عاشورا کے سانحہ کے بیان میں اور اسارت اہل بیتؑ کے مختلف حوادث میں غرض ہر مرحلہ میں بار بار آپ کا ذکر ملتا ہے۔

مصائب و آلام برداشت کرنے میں حضرت زینب = کے بعد آپ کا نام سرفہرست آتا ہے۔

(ب) امامہ بنت ابی العاص بن ربیع

ابی العاص حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی بہن کا بیٹا ہے۔ امامہ کی والدہ زینب بنت خدیجۃ الکبریٰؑ ہیں۔ زینب بعثت پیغمبرؐ سے پہلے ابی العاص کے عقد میں آئی تھیں اور ان سے امامہ پیدا ہوئی تھیں۔ حضرت فاطمہ الزہراؑ نے اپنی رحلت کے موقع پر امیر المومنینؑ سے سفارش کی تھی کہ: میرے بعد امامہ کو اپنے عقد میں لے آیئے گا مجھے امید ہے کہ وہ میرے بچوں کے ساتھ میری ہی طرح شفقت و محبت سے پیش آئیگی''۔

چنانچہ جناب زہراؑ کی وفات کے بعد امیر المومنینؑ نے امامہ کو اپنی عقد میں لے آئے۔ اس طرح امامہ حضرت علیؑ کی دوسری زوجہ شمار ہوتی ہیں۔

کتاب ''فرسان الہیجاء'' جلد ۲ صفحہ ۵۵ اور کتاب ''ریاحین الشریعۃ'' جلد ۳ صفحہ ۳۵۰ کے تحت آپ کے بطن سے محمد اوسط پیدا ہوئے۔

(ج) خولہ بنت جعفر

آپ جعفر بن قیس سلمہ بن عبد اللہ بن ثعلبہ بن یربوع بن ثعلبہ بن الدول بن حنفیہ بن لجیم کی بیٹی ہیں۔

مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر کو اپنے دور میں مسئلہ ارتداد کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مرتدین کو کچلنے کے بعد شکست خوردہ عناصر کو اسیر کر کے مدینہ لایا گیا۔ ان اسیروں میں خولہ بنت جعفر بن قیس نامی ایک خاتون بھی تھیں۔ حضرت علیؑ نے ان کو خرید کر پہلے آزاد کیا' پھر اپنے عقد میں لائے۔

کتاب ''عمدۃ الطالب فی انساب آل ابیطالب'' صفحہ ۳۵۱ پر لکھا ہے کہ حضرت امیرؑ کے عقد میں آنے کے بعد ان سے محمد پیدا ہوئے جو بعد میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

بعض روایات کے مطابق حضرت علیؑ نے پیغمبر اسلامؐ سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اگر ان کے یہاں کوئی بیٹا پیدا ہو تو وہ اس کا نام محمد رکھ سکتے ہیں۔

شیخ جعفر نقدی اپنی کتاب ''زینب کبریٰ'' میں حضرت زینبؑ کے بھائیوں میں محمد حنفیہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن جوزی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ کی کنیت ابوالقاسم اور ابو عبداللہ تھی۔ آپ تابعین کے طبقہ اولیٰ میں شمار ہوتے ہیں۔

امیرالمومنینؑ فرمایا کرتے تھے کہ ''محامد' خدا کے حضور عصیان کرنے سے گریز کرتے ہیں''۔ یہاں محامد سے مراد محمد بن جعفر' محمد بن ابوبکر' محمد بن حذیفہ اور محمد بن حنفیہ ہیں۔

حضرت امام حسنؑ مولا علیؑ سے نقل فرماتے ہیں:

''جو کوئی میری حیات میں میرے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے وہ میرے بعد میرے بیٹے محمد کے ساتھ نیکی کرے''۔

محمد حنفیہ وہ مرد شجاع تھے جو اپنے زمانے میں دلیری' زہد و تقویٰ' عبادت سیاست و فراست اور جرأت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ آپ کی شجاعت کے بارے میں ابن ابی الحدید اور دیگر شارحین نہج البلاغہ لکھتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ جنگوں میں خطرے کے مواقع پر آپ کو آگے کر دیا کرتے تھے کیونکہ حضرت امیرؑ کو آپ کی شجاعت و جرأت پر بہت اعتماد و بھروسہ تھا۔ خطبہ نمبر ۱۱ کے کلمات اس پر شاہد و گواہ ہیں۔

واقعہ کربلا میں کاروان حسینی میں آپ کی عدم شمولیت کے متعلق علامہ بزرگ جلی'' لکھتے ہیں کہ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ معذور تھے۔ دوسری توجیہ جسے اوروں نے بھی لکھا ہے اور خود کلمات امام حسینؑ سے بھی جھلکا

اشارہ ملتا ہے' یہ ہے کہ آپ کو ساتھ اس لئے نہیں لے جایا گیا تھا تا کہ امام حسینؑ کی غیر موجودگی میں آپ مکہ و مدینہ میں امامؑ کی نمائندگی کرتے رہیں اور وہاں کے حالات سے آپ کو باخبر و آگاہ کرتے رہیں۔

صاحب کتاب 'عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب'' کے مطابق آپ نے ۶۷ سال کی عمر میں سنہ ۸۱ ہجری میں شہر طائف میں وفات پائی۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی والدہ جناب خولہ بنت جعفر تقریباً سنہ ۱۳ ہجری میں حضرت امیرالمومنینؑ کے عقد میں آئی ہونگی کیونکہ آپ جنگ ردّہ کے نتیجہ میں اسیر ہو کر آئی تھیں جو حضرت ابوبکر کے دور میں ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکر کی تاریخ وفات ۲۲ جمادی الآخر' سنہ ۱۳ ہجری ہے لہٰذا اس حساب سے ۱۴' ۱۵ ہجری میں آپ کی ولادت کا ہونا صادق آتا ہے۔

جنگ جمل جو کہ سنہ ۳۶ ہجری میں ہوئی تھی' اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۲۲ سال بتائی جاتی ہے لہٰذا آپ کو میدان جنگ میں علمدار بنانا اور سخت حالات میں آگے کرنا' قرین صحت اور موازین عقلی و شرعی کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کے منافات نہیں پائے جاتے۔

(و) اسماء بنت عمیس

اسماء بنت عمیس بن معدان بن حارث بن تیم بن کعب بن مالک بن خثعمی سب سے پہلے جعفر طیار کے عقد میں تھیں۔ آپ کی اولاد کا ذکر آل طیار میں ہوا ہے۔ جعفر طیار رجب سنہ ۸ ہجری کو جنگ موتہ میں شہید ہوئے تو اس کے بعد اسماء خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے عقد میں آئیں اور سنہ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ کے بطن سے محمد پیدا ہوئے۔

جب ۲۲ جمادی الثانی' سنہ ۱۳ ہجری کو ابوبکرؓ نے وفات پائی تو اسماء بنت عمیس امیرالمومنینؑ کے عقد میں آئیں اور اپنی معیت میں اپنے بیٹے محمد بن ابوبکر کو بھی لائیں۔ حضرت علیؑ نے محمد کی تربیت فرمائی۔

محمد بن ابوبکر حضرت عثمانؓ کے والیوں کے خلاف شکایت کرنے والوں اور عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ جب حضرت علیؑ منصب خلافت پہ فائز ہوئے تو محمد بن ابی بکر آپؑ کی طرف سے

مصر کے والی مقرر ہوئے ۔ جنگ صفین کے موقع پر معاویہ کی ایما پر آپ کو شہید کیا گیا ۔

جب آپ کی شہادت کی خبر حضرت علیؑ کو ملی تو آپ نے ان کی شان میں جو جملہ ارشاد فرمایا وہ نہج البلاغہ میں موجود ہے خطبہ نمبر ۶۸ کے مضمون میں آپؑ نے فرمایا:

"محمد میرا پروردہ ہے"۔

محمد بن ابوبکر کی شہادت سنہ ۳۸ ہجری میں ہوئی جبکہ اُن کی عمر کم از کم تیس (۳۰) سال تھی ۔

سنہ ۲۶ ہجری میں جب حضرت عباس کی ولادت ہوئی تو اس وقت محمد بن ابو بکر کی عمر اٹھارہ سال تھی ۔

یہاں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اسماء بنت عمیس حضرت اُم البنین سے پہلے امیر المومنینؑ کے عقد میں آئی تھیں ۔

(ر) فاطمہ بنت حزام

آپ حزام بن خالد بن ربیعہ بن وحید بن کعب بن عامر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ھوازان کی بیٹی ہیں ۔

آپ کی ماں ثمامہ بنت سہیل بن عامل بن مالک بن جعفر بن کلاب ہیں ۔ ماہرین علم الانساب عرب کے مطابق آپ کا خاندانی پس منظر، ماں اور باپ دونوں طرف سے قدیم زمانہ سے اپنی شجاعت و شہامت اور جنگجوئی کے لئے مشہور و معروف رہا ہے ۔

آپ کی کنیت اُمّ البنین ہے جسکے معنی ہیں "بیٹوں کی ماں" یہ کنیت اتنی مشہور ہوئی کہ آپ کے نام پر غالب آ گئی اور اس نے اسم کی جگہ لے لی ۔ آیا یہ کنیت حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب -کے عقد میں آنے کے بعد چار فرزندوں کی ماں ہونے کی وجہ سے ملی تھی یا پہلے ہی سے بطور فال نیک آپ کو اس کنیت سے پکارا جاتا تھا، تاریخ میں اس کے متعلق کوئی وضاحت نہیں ملتی ۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ عرب میں خصوصاً بڑے اور بافضیلت خاندانوں میں اسم کی بجائے کنیت سے پکارنا عام طور پر رائج تھا ۔

جناب اُم البنین حضرت علیؑ کی پانچویں زوجہ تھیں ۔ آپ کے امیر المومنین علی ابن ابیطالبؑ کے بیت امامت میں ایک زوجہ کی حیثیت سے آنے کے بارے میں اکثر مؤلفین اور خطباء عام طور پر دو تصویریں پیش کرتے

ہیں لیکن دیگر مسلمات و حقائق کے ساتھ ان کا موازنہ اور مقابلہ کرنے کے بعد یہ دونوں تصویریں ضعیف اور کمزور نظر آتی ہیں ۔

پہلی تصویر:

مقررین و مؤلفین آپ کی رسم ازدواج کے بیان میں کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کے بعد آپ "پہلی خاتون ہیں جو امیر المومنینؑ کے عقد میں آئی تھیں ۔ جسوقت آپ حضرت علیؑ کے عقد میں آئیں، وہ وقت تھا جب جناب زہراؑ کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے لہذا جب آپ بیت امامت میں داخل ہوئیں تو آپ کی تمام تر توجہ اس بات پر رہی کہ حضرت فاطمہ زہرا = کے بچوں کو ماں کی جدائی کا احساس نہ ہونے پائے ۔ یوں آپ ایک خدمت گزار مہربان اور شفیق و دلسوز خاتون بن کر خانۂ امامت میں داخل ہوئیں ۔

نقد و تحقیق

یہ تصویر دیگر تاریخی اسناد اور نقل کے ساتھ موازنہ و مقابلہ کرنے کے بعد صحت سے بعید اور خلاف موازین نظر آتی ہے ۔ وہ اسناد جو اس تصویر کو صحت سے دور کرتے ہیں اس کے چند شواہد ہیں:

۱۔ حضرت زہرا = کی وہ وصیت جسے تمام سوانح نگاروں نے درج کیا ہے ۔ آپؑ نے حضرت امیر المومنینؑ کو وصیت فرمائی تھی کہ آپ کے بعد جناب امیرؑ امامہ بنت زینب کو اپنے عقد میں لے آئیں کیونکہ آپ کو ان سے امید تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ آپ ہی کی مانند شفقت اور محبت سے پیش آئینگی ۔ چنانچہ اس وصیت کے مطابق امیر المومنینؑ حضرت زہراؑ کے بعد امامہ کو اپنے عقد میں آئے تھے ۔ پس حضرت امیر المومنینؑ کی دوسری زوجہ جناب امامہ بنت ابی العاص ہیں، نہ کہ جناب اُم البنین ۔

۲۔ حضرت محمد حنفیہ کے بارے میں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آپ جنگ جمل میں صاحب پرچمدار لشکر امیر المومنینؑ تھے اور میدان جنگ میں ہمیشہ آگے آگے ہوتے تھے ۔ آپ کی شجاعت و شہامت، جرأت مندی اور سبقت جنگی کو دیکھ کر لوگوں نے امیر المومنینؑ سے عرض کیا کہ اگر حضرات حسنینؑ، فرزندان رسول اللہؐ نہ ہوتے یا انکے حق میں رسول اللہ کی وصیت نہ ہوتی تو ہم محمد حنفیہ کو حسنینؑ پر ترجیح دیتے ۔ جنگ

جمل جو کہ سنہ ۳۶ ہجری میں وقوع پذیر ہوئی' اس وقت محمد حنفیہ کی عمر ۲۰ سال سے کچھ اوپر ہوگی۔

آپ کی والدہ جناب خولہ کو جنگ یمامہ (ردہ) میں اسیر کر کے لایا گیا تھا۔ امیرالمومنینؑ نے آپ کو خرید کر پہلے آزاد کیا اور اس کے بعد اپنے عقد میں لائے۔ یہ واقعہ لگ بھگ گیارہ بارہ ہجری کا ہے اور محمد حنفیہ کی ولادت سنہ ۱۵ یا ۱۶ ہجری میں ہوئی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب خولہ تیسری خاتون ہیں جو امیرالمومنینؑ کے عقد میں آئیں۔

۳۔ محمد بن ابی بکر اسماء بنت عمیس کے فرزند ہیں۔ اسماء بنت عمیس حضرت ابوبکرؓ کے عقد میں آنے سے پہلے حضرت جعفر طیار کی بیوی تھیں۔ حضرت جعفر طیار جنگ موتہ میں سنہ ۸ ہجری میں شہید ہوئے تھے ان کی شہادت کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ کے عقد میں آئی تھیں۔

ابن ابی الحدید اپنی کتاب "شرح نہج البلاغۃ" جلد ۱۷ میں مکتوب نمبر ۳۵ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ محمد بن ابی بکر پیغمبر اسلامؐ کے حجۃ الوداع پر روانہ ہونے کے بعد سنہ ۱۰ ہجری کے آخر یا سنہ ۱۱ ہجری کے شروع میں پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے انکا نام محمد انتخاب کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ۲۷ رجمادی الثانی سنہ ۱۳ ہجری کو وفات پائی۔ اس وقت محمد کی عمر تقریباً ڈھائی سال تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جناب اسماء امیرالمومنینؑ کے عقد میں آئیں۔ اس طرح محمد بن ابی بکر بھی اپنی والدہ کے ساتھ آپکے زیر کفالت آ گئے، چنانچہ آپ نے فرمایا: "محمد میرا بیٹا ہے' صلب ابوبکر سے۔ وہ میرا ربیب یعنی میرا پروردہ ہے"۔

حضرت عثمانؓ کے دور میں عبداللہ سرح مصر کا والی تھا۔ عوام کی شکایت پر حضرت عثمانؓ نے اسکی جگہ محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی بنایا۔ محمد بن ابی بکر حضرت عثمانؓ کے گھر محاصرہ کرنے والوں میں شامل تھے۔ جنگ جمل میں آپ امیرالمومنینؑ کے لشکر میں ایک ممتاز مجاہد کی حیثیت سے شریک تھے۔ امیرالمومنینؑ نے حضرت عائشہ کو آپ ہی کے زیر نظر اور سرپرستی میں مدینہ واپس بھیجا۔ آپ دور خلافت امیرالمومنینؑ میں سنہ ۳۸ ہجری میں شہید ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت شہادت آپ کی عمر تقریباً ۲۷ یا ۲۸ سال تھی۔

۴۔ حضرت امیرالمومنینؑ کو خداوند عالم نے جناب اُم البنین سے چار فرزند عطا کئے تھے' عباس' عثمان' جعفر

اور عبداللہ۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ قمر بنی ہاشم' سب سے بڑے تھے۔ قمر بنی ہاشم کی ولادت باسعادت سنہ ۲۶ ہجری میں ہوئی۔ کربلا میں آپ کی عمر تقریباً ۳۴ سال تھی۔ خلافت امیرالمومنینؑ کا آغاز سنہ ۳۶ ہجری میں ہوا' جسکا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت آپ دس سال کے تھے۔ چنانچہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت زہراؑ کی وفات کے بعد سب سے پہلی خاتون جو امیرالمومنینؑ کے عقد میں آئیں وہ جناب اُم البنین تھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سنہ ۱۱ ہجری سے لیکر سنہ ۲۶ ہجری تک' یعنی زوجیت میں آنے کے بعد ۱۵ سال بعد تک آپؑ یہاں کوئی فرزند پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات طبیعت عادی کے خلاف ہے' محل سوال و استفسار اور محل توضیح ہے۔ مرد اور عورت دونوں مرحلہ تولید مثل کو پہنچنے کے بعد اگر ازدواجی زندگی میں منسلک ہو جائیں لیکن صاحب اولاد نہ ہونے میں غیر مالوف و غیر مانوس تاخیر ہو تو مورد سوال و استفسار قرار پاتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن میں طرح طرح کے شکوک و شبہات جنم لینے لگتے ہیں چنانچہ جب حضرت امام رضا -کے یہاں ولادت میں تاخیر ہوئی تو لوگوں میں آپ کے بعد کی امامت کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حضرت اُم البنین کے یہاں تاخیر ولادت کے بارے میں کوئی توضیح نظر نہیں آتی ہے۔

۵۔ جناب اُم البنین کے سن ولادت اور سن وفات کے بارے میں چنداں دقیق تاریخ نہیں ملتی۔ بعض مؤرخین جیسے محمد رضا عبدالامیر انصاری نے کتاب "ام البنین" صفحہ ۳۴ میں آپ کا سن وفات ۶۴ ہجری لکھا ہے۔ سید مہدی السویج الخطیب نے کتاب "ام البنین" صفحہ ۱۰ پر آپ کا سن ولادت ۵ ہجری بتایا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنہ ۱۱ ہجری میں یعنی وفات جناب زہراؑ کے بعد امیرالمومنینؑ کی پہلی زوجہ ہونا بعید نظر آتا ہے۔

دوسری تصویر۔ عقد اُم البنین:

حضرت اُم البنین کو مولا امیرالمومنین علی ابن ابیطالب -کے عقد میں لانے سے متعلق مقدمات پر آیات قرآنی' روایاتِ معصومینؑ اور مسلمہ تاریخی مصادر کی روشنی میں بحث و تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

مسئلہ خواستگاری اُم البنین

حضرت ابوالفضل العباس کی سیرت پر لکھی گئی کتابوں، مثلاً "بطل العلقمی" جلد اوّل صفحہ ۹۷ "عمدۃ الطالب فی انساب آل ابیطالب" تالیف سید داؤدی صفحہ ۳۲۴ "خصائص العباسیہ" تالیف شیخ ابراہیم کلباسی صفحہ ۱۲۲ "سلسلۃ الذہب العلویہ" اور "مقاتل الطالبین" میں نقل ہے کہ "امیر المومنین علی ابن ابیطالب نے اپنے بھائی عقیل سے جو ماہر انساب عرب تھے، خواہش کی کہ میرے لئے کسی ایسی خاتون کا انتخاب کریں جو عرب کے شجاع خاندان سے ہوتا کہ اس سے جو اولاد ہو وہ شجاع و بہادر ثابت ہو۔ اس پر جناب عقیل نے آپ کو فاطمہ بن حزام ملقب بہ اُم البنین کلابیہ سے عقد کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ عرب میں ان کے آبا و اجداد سے زیادہ کوئی شجاع نہ تھا۔ اس طرح حضرت علیؑ نے اُم البنین سے شادی کی"۔

گرچہ یہ نقل حضرت عباسؑ کی سیرت سے متعلق تمام کتابوں میں موجود ہے لیکن ان سب کی برگشت کتاب "عمدۃ الطالب فی انساب آل ابیطالب" کی طرف ہے لہٰذا اس سلسلے میں مزید مصادر و مآخذ کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امیر المومنین علی ابن ابیطالب نے اس سلسلے میں اپنے بھائی عقیل سے کیوں مدد لی جبکہ آپ خود حضور اکرمؐ کے بعد حسبِ آیات و روایات اعلم تھے۔ اس سوال کے جواب میں علمائے سیر و تاریخ نے مختلف اور متعدد جوابات دیئے ہیں:

۱۔ اگر انسان کو کسی سے رشتہ مطلوب ہو تو خود سے کہنا مروّت و شرافت کے منافی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس طرح طالب کو خود مطلوب سے یا اس کے عزیز و اقارب سے اس سلسلے میں بات کرنا پڑتی ہے، جسے عام طور پر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ شاید اس وجہ سے امیر المومنینؑ نے اپنے بھائی عقیل کو یہ ذمہ داری سونپی ہو۔

۲۔ حضرت علیؑ نے شاید ایسا دنیا کو یہ بتانے کیلئے کیا ہو کہ ہر کام کا ایک ماہر ہوتا ہے اور انسان کا اپنے کاموں کو بہتر طور پر انجام دینے کیلئے ماہرین سے رجوع کرنا مستحسن عمل ہے۔

۳۔ زندگی کے دیگر مسائل کی نسبت مسئلہ ازدواج زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سامانِ تجارت کی خریداری یا

املاک کی خریداری میں پہنچنے والے نقصان و ضرر کا ازالہ تو ممکن ہے لیکن اگر انتخاب ازواج میں معمولی سی بھی غلطی ہو جائے تو پوری زندگی داؤ پر لگتی ہے لہٰذا روایات معصومینؑ میں انتخاب زوجہ میں احتیاط برتنے کی سفارش آئی ہے۔

۴۔ امیر المومنینؑ کو تو لوگ خوب جانتے تھے لیکن آپ کے بھائی عقیل سے کہ جو ماہر انساب عرب تھے، لوگ واقف نہ تھے لہٰذا ان کی شخصیت کو لوگوں پر آشکار کرنے کیلئے آپ نے ان سے مدد لی۔

۵۔ چونکہ اس رشتہ کے بعد آپ سے ایسا فرزند پیدا ہونا تھا جس کو کربلا کے میدان میں ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثال قائم کرنا تھی لہٰذا آپ چاہتے تھے کہ اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرائیں، اس کے لئے آپ نے اپنے بھائی عقیل سے مدد لی۔

غرض، ہمارے مکتب کے بزرگ اساتید، علماء اور محققین نے اس تاریخی سند کو تسلیم کر لینے کے بعد، جب اسے مسئلہ علم امامت سے متصادم پایا تو اس سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات اور استفسارات کا مندرجہ بالا انداز میں جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے علماء اس واقعہ کو ایک مسلم حقیقت تسلیم کر کے گزر گئے ہیں اور غور و تحقیق کیلئے کسی نے اپنے قلم کو یہاں پر روکا نہیں ہے لہٰذا جب ہم نے اس مسئلہ پر سوچنا اور غور کرنا شروع کیا تو ہمارے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوا اور شکوک و شبہات ہمارے دل میں بھی جاگزین ہوئے۔ اس مقام پر ہم نے اپنے آپ پر عتاب کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس واقعہ کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر سب نے تسلیم کر لیا ہو، اس میں تشکیک کا پہلو تلاش کرنا اور اس پر منفی زاویے سے قلم اٹھانا مناسب نہیں ہے لہٰذا ہم نے بھی دیگر علماء اور بزرگوں کی تاسی کرتے ہوئے امیر المومنینؑ کے اس خلافِ عادت اقدام کی توجیہ میں مزید دلائل تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ واقعہ کی سند کو اور زیادہ تقویت ملے لیکن اس سلسلے میں مزید دلائل کی تلاش میں جب قدم اٹھایا تو مثبت دلائل ملنے کے بجائے آیات و روایاتِ معصومینؑ اور سیرت ائمہ اطہارؑ سے اس کی مخالفت میں دلائل ملنے لگے۔ کسی مثبت نکتے تک پہنچنے کے بجائے اس واقعہ کے بے اساس و بے بنیاد ہونے کی توجیہات سامنے آئیں جنہیں ہم یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

(۱) اس واقعہ سے مولا امیر المومنینؑ کے اس تصور کے تسلیم کرنے کا عندیہ ملتا ہے کہ نیک صفات اعلیٰ اقدار اور شجاعت مختلف قبائل اور خاندانوں میں تقسیم ہیں لہٰذا آپ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ کے لئے کسی ایسے خاندان سے خاتون تلاش کی جائے' جبکہ یہ تصور سورہ حجرات کی آیت ۱۳ سے متصادم ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"اور ہم نے تم کو قوم اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو' تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو"۔

اس آیہ کریمہ میں قبائل میں خصوصیات اور امتیازات کے ہونے کی نفی کی گئی اور اقدار و فضائل صرف اور صرف معرفت خدا اور تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔

(۲) شاہی خاندان' خواہ کسی سطح کا ہو' اسلام کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ قرآن کریم کفر و شرک کے خاندان کی بیٹی پر ایک اسیر' کنیز مومنہ سے شادی کرنے کو ترجیح دیتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ آیت ۲۲۱ میں ارشاد ہوا ہے:

"خبردار مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرنا جب تک ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن کنیز' آزاد مشرک عورت سے بہتر ہے چاہے وہ (مشرک) تمہیں کتنی ہی بھلی معلوم ہو اور مشرکین کو بھی لڑکیاں نہ دینا جب تک مسلمان نہ ہو جائیں ......"

اگر کوئی مسلمان کفر اختیار کر لے تو اس کی زوجیت میں ہونے والی مسلمان عورت خود بخود زوجیت سے نکل جاتی ہے اسی طرح اگر کوئی مشرک عورت مشرک مرد کے عقد میں ہو اور وہ مرد مسلمان ہو جائے تو خود بخود اس کی زوجیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام میں رشتہ ایمان باللہ پر قائم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی درج بالا آیت سے واضح ہوتا ہے کہ کافر و مشرک خاندانوں میں فضائل و اقدار نہیں ہوتے ہیں۔

(۳) سورۂ ممتحنہ کی آیت ۱۰:

"اے ایمان والو! جب تمہارے پاس ہجرت کرنے والی مومن عورتیں آئیں تو پہلے ان کا امتحان لو کہ اللہ ان

کے ایمان کو خوب جانتا ہے پھر اگر تم بھی دیکھو کہ یہ مومن ہیں تو خبردار انھیں کفار کی طرف واپس نہ کرنا' نہ وہ ان کیلئے حلال ہیں نہ یہ ان کیلئے حلال ہیں ...... اور خبردار کافر عورتوں کی عصمت پکڑ کر نہ رکھو اور جو تم نے خرچ کیا وہ کفار سے لے لو......"

یہ آیت بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام فضائل کو خاندانوں میں تلاش نہیں کرتا لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ مثلاً فلاں خاندان شجاعت کا وارث ہے اور فلاں جود و سخا کا وارث ہے۔

(۴) سورۂ آل عمران کی آیت ۲۷:

﴿وتخرج الحی من المیت وتخرج المیت من الحی﴾ "اور وہ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے"

اسی طرح سورۂ یونس آیت ۳۱، اور سورۂ روم آیت ۱۹ میں بھی ذکر آیا ہے کہ خدا مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکال سکتا ہے۔

ان آیات کے تحت کیا ممکن نہیں ہے کہ شجاع سے بزدل اور بزدل سے شجاع پیدا ہو؟

(۵) یہ کہنا کہ انبیاء و ائمہ رشتہ کرتے وقت خاندانی پس منظر کو سامنے رکھتے تھے یعنی یہ کہ ہمیشہ اچھے خاندانوں میں شادیاں کرتے تھے اور یہ کہ ان کی بیویاں ہمیشہ پاک دامن اور اچھے فضائل کی مالک ہوا کرتی تھیں' صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اس بات کو قرآن غلط ثابت کرتا ہے جیسا کہ سورۂ تحریم کی آیت ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

"خدا نے کفر اختیار کرنے والوں کیلئے زوجۂ نوح اور زوجۂ لوط کی مثال بیان کی ہے کہ یہ دونوں ہمارے نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں لیکن ان سے خیانت کی تو اس زوجیت نے خدا کی بارگاہ میں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ......"۔

(۶) خداوند عالم حضرت آدم و حوا کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہابیل و قابیل دونوں ایک ہی ماں باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے باپ آدم جو نص آیت قرآن کے مطابق صفی اللہ ہیں'

خدا کے منتخب بندے تھے اور حسب نص آیۂ قرآن کے تحت اسی آدم سے خلق ہوئی تھیں لیکن انہی دونوں سے پیدا ہونے والے ہابیل فضیلت، شرافت اور مروّت کا اعلیٰ نمونہ بنے لیکن قابیل حاسد، قاتل اور برے عزائم رکھنے والا بن کر سامنے آیا۔ اب بتلایئے کہ اگر ماں پاکیزہ ہو تو کیا بیٹے بھی انہی صفات کے مالک ہوں گے؟ قرآن کی یہ آیت اس مفروضے کو رد کرتی ہے۔ ملاحظہ کریں سورۂ مائدہ کی آیت ۲۷:

﴿اذ قربا قربانا فتقبل من احدهما ولم يتقبل من الآخر قال لاقتلنك قال انما يتقبل الله من المتقين﴾ "جب دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ ہوئی تو اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کروں گا تو دوسرے نے جواب دیا میرا کیا قصور ہے۔ خدا صرف صاحبان تقویٰ کے اعمال کو قبول کرتا ہے"۔

(۷) سورۂ معارج کی آیات ۱۹، ۲۰:

﴿ان الانسان خلق هلوعا اذا مسه الشر جزوعا﴾ "بے شک انسان کو بڑا حریص اور کم طاقت پیدا کیا ہے جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بیتاب ہو جاتا ہے"۔

یہاں ہلوعا سے مراد انسان کی بزدلی ہے۔

(۸) اگر زوجات کا شرف، پاک اور با فضیلت خاندانوں سے انتخاب کرنا، ان کی پاکدلی اور عفت کا ضامن ہوتا ہے تو کیونکر خود ائمہ اطہار کی بعض زوجات غلط ثابت ہوئیں۔ زوجۂ امام حسنؑ جُعدہ بنت اشعث کی مثال لے لیجئے جس کے ہاتھوں امام حسنؑ شہید ہوئے۔ اس کی تفصیل آل حسنؑ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۹) ابوسفیان، اس کا بیٹا اور پوتا تینوں اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور اہل بیتؑ کے ایسے دشمن نکلے کہ اسلام و نبوت سے دشمنی اس خاندان کی پہچان بن گئی۔ ابوسفیان نے پیغمبرؐ کے ساتھ جنگ کی، اس کا بیٹا معاویہ حضرت علیؑ کے ساتھ نبرد آزما رہا جبکہ یزید نے امام حسینؑ کو شہید کیا۔ لیکن یزید کا بیٹا دوست دار اہل بیتؑ ثابت ہوا۔

(۱۰) قرظہ انصاری پیغمبرؐ کے اصحاب میں سے تھے ان کے دو بیٹے تھے ایک کا نام عمرو ابن قرظہ تھا جو امیر المومنینؑ کے دور خلافت میں کسی علاقے میں والی تھے۔ یہ وہی شخص ہیں جنہوں نے امام حسینؑ اور عمر

ابن سعد کے درمیان مذاکرات کرانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں یہ امام حسینؑ کی رکاب میں شہید ہونے والوں میں شامل ہوئے جبکہ انہی کا بھائی علی ابن قرظہ انصاری عمر سعد کے لشکر میں تھا اور امامؑ اور اصحاب امامؑ پر سب کیا کرتا تھا۔

یہاں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے جس سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان کے کردار میں نام کا بڑا اثر ہوتا ہے چنانچہ ہم بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ نام میں شوم ہے، نام کو بدلو تکلیف دور ہو جائے گی۔

یا بعض لوگ کسی کے جرم کو چھپانے کے لئے کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ فلاں کے ساتھ جائے جبکہ اس کا نام علی یا حسین ہے، علی اور فلاں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس یہاں معاملہ الٹا ہو گیا۔ عمر و حسینؑ کے ساتھ تھے اور علی یزید کے لشکر میں تھا۔

(۱۱) عبدالمطلب کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں سے ابوطالب، زبیر اور عبدالکعبہ، فاطمہ بنت عمر کے بطن سے تھے عباس اور ضرار کی ماں نُتیلہ بنت نمر بن قاسط تھیں جبکہ حمزہ، مقوم اور حجل کی ماں ہالۃ بنت اھیب تھیں۔ ابولہب، قثم، غیداق، حارث اور عبداللہ کی ماں ایک تھیں۔ پیغمبرؐ کے والد جناب عبداللہ بھی اسی ماں سے پیدا ہوئے جس سے ابولہب جیسے دشمن انسانیت نے جنم لیا۔

(۱۲) جناب عبدالمطلب کے اولاد میں سے حضرت حمزہ، ابوطالب اور عبداللہ دوسرے بیٹوں سے ممتاز تھے۔

(۱۳) خود جناب ابوطالب کے چار فرزند تھے جن کی مادر گرامی فاطمہ بنت اسد تھیں عقیل، جعفر، طالب اور علیؑ سب ایک جیسے نہیں تھے۔ عقیل و طالب کی بہ نسبت جعفر ممتاز تھے، جبکہ حضرت علیؑ تمام بیٹوں سے زیادہ مرتبہ اور دبدبہ رکھتے تھے۔

(۱۴) فرزندان ام البنین عباس، عبداللہ، جعفر و عثمان سب ایک جیسے نہیں تھے حالانکہ سب نے امام حسینؑ کی رکاب میں میدان کربلا میں شہادت پائی۔

(۱۵) ایک دفعہ جناب رسول اکرمؐ مسجد میں تشریف لے گئے تو آپؐ نے دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم ایک شخص کو

گھیرے ہوئے ہے آپؐ نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ تو کسی نے کہا کہ یہ شخص ماہر انساب عرب ہے۔ اس پر رسول اکرمؐ نے فرمایا "اس علم کے جاننے میں کوئی فائدہ نہیں اور اس سے جاہل رہنے میں کوئی نقصان نہیں"۔ اگر نسب شناسی کی کوئی اہمیت ہوتی تو یقیناً اس کے جاننے میں فائدہ اور نہ جاننے میں نقصان ہونا چاہیے تھا۔[1]

(۱۶) اسلام مسئلہ زواج میں قوم قبیلے، مال و دولت، شکل وصورت جیسے تمام امتیازات بالائے طاق رکھ کر صرف دین وایمان اور اعلیٰ اقدار کا پاس و لحاظ رکھنے کا درس دیتا ہے۔

(۱۷) قدیم دور سے لیکر عصر جدید تک کے فقہاء اور علماء میں سے کسی نے بھی سادات لڑکیوں کی غیر سید لڑکوں سے شادی کو نا مناسب نہیں قرار دیا ہے۔ ہمارے ملک میں اسلام کے بنیادی مسائل کو چھوڑ کر اس مسئلہ کو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ہمارے یہاں خلافِ شریعت عمل ہو رہا ہے جبکہ دنیا بھر میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں لہٰذا اس مسئلہ میں بھی تمام تر شہرت کے باوجود کوئی منطق نظر نہیں آتی۔

(۱۸) نسلی صفات وخصوصیات کی برگشت کسی نسل میں کس کی طرف ہوتی ہے، اس موضوع پر الگ سے بحث کرنے کی ضرورت ہے بہر حال بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی برگشت نسل میں کافی پیچھے چلی جاتی ہے۔ بعض بچے ماموں کے مشابہ ہوتے ہیں، بعض چچا سے شباہت رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ سے شباہت رکھتے ہوں یا یہ کہ ہمیشہ باپ سے مشابہ ہوں۔ اس سلسلے میں کوئی محکم دلیل کہیں نہیں ملتی ہے۔

(۱۹) امیر المومنینؑ کے چار بیٹوں میں سے حسنینؑ کے علاوہ سب سے زیادہ شجاع محمد حنفیہ تھے، جن کی ماں خولہ بنت جعفر تھیں۔ خولہ سے شادی کرتے وقت امام علیؑ کوئی ایسا طریقۂ انتخاب عمل میں نہیں لائے تھے۔

(۲۰) مفہوم شجاعت خود ایک الگ تحقیقی موضوع ہے عام طور پر شجاعت سے جو مراد لی جاتی ہے، وہ جسمانی طاقت کے حوالے سے ہے۔ ممکن ہے کوئی جسمانی طاقت میں نسلی امتیاز رکھتا ہو لیکن میدان جنگ میں

[1] (اصول کافی جلد اوّل باب العلم)

بزدلی دکھائے۔ شجاعت کبھی تربیت لینے سے بھی پیدا ہوتی ہے مثلاً ایک کمزور انسان بذریعہ تربیت کمانڈو بن سکتا ہے ایک شجاعت وہ ہوتی ہے جو لقاء اللہ کے شوق اور موت سے لاپروائی میں ہوتی ہے۔ مولا امیر المومنینؑ اپنی شجاعت و دلیری کا محور شوق لقاء اللہ اور موت سے لاپروائی کو قرار دیتے ہیں جیسا کہ آپ کا فرمان ہے:

"جب احمرار باس (گھمسان کی لڑائی کا دن) ہوتا تھا تو ہم لوگ رسول اکرمؐ کی پناہ میں رہا کرتے تھے"۔ اس وقت کوئی شخص بھی آپؐ سے زیادہ دشمن سے قریب نہیں ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلامؐ اور مولا امیر المومنینؑ دونوں کے دادا جناب عبدالمطلب تھے لیکن مولاؑ کے درج بالا قول کے تحت پیغمبر اسلامؐ حضرت علیؑ سے زیادہ شجاع تھے۔

(۲۱) قصۂ خواستگاری جناب اُم البنین، جناب علی اکبرؑ کے بارے میں معاویہ سے منقول ایک قصہ سے بڑی شباہت رکھتا ہے۔ اکثر سیرت نگاروں نے اس قصہ کو بھی حضرت علی اکبرؑ کی شخصیت اور بزرگی کو ثابت کرنے کیلئے نقل کیا ہے قصہ یوں ہے:

ایک دن معاویہ نے اپنے حلقۂ احباب سے پوچھا کہ اس وقت منصبِ خلافت کا سزاوار کون ہے؟ تو کسی نے کہا آپ ہیں، کسی نے کہا یزید ہے۔ اس پر معاویہ نے کہا نہیں! لوگوں نے کہا پھر تو آپ خود ہی بتائیں۔ معاویہ نے کہا: اس وقت منصبِ خلافت کے سزاوار علی ابن الحسینؑ ہیں اسلئے کہ ان میں شجاعت بنو ہاشم، حسن وجمال بنو ثقیف اور سخاوت بنو اُمیہ ہے۔ ہمارے بہت سے لوگ دین ومذہب کے بارے میں سنتے اور پڑھتے وقت بغیر کسی دقت توقف اور تدبر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اپنے آقاؤں کی تعریف وثنا کو فوراً قبول کر لیتے ہیں، خواہ اس تعریف میں ان کی تنقیص ہی ہوتی ہو۔ معاویہ نے اپنی گفتگو میں بیک وقت تین نشانوں پر حملہ کیا ہے، گویا اس نے ایک سہ شعبہ تیر چلایا ہے:

۱۔ اس نے یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنو اُمیہ تمام قبائل میں سخاوت میں سب سے آگے تھے جبکہ یہ بات ثابت ہے کہ یہ لوگ سخی نہیں تھے۔

۲۔ معاویہ جس کے دل میں اسلام دشمنی دھڑکتی ہے' اس نے فضیلت و شرافت یا منصب خلافت کے لئے موزون ہونے کا معیار دین شناسی اور شریعت شناسی جیسے اصولوں کو قرار دینے کے بجائے دورِ جاہلیت کی پیروی کی ہے ۔ اس نے منصب خلافت پر فائز ہونے کے معیار کو خاندانی اور قبائلی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی ہے جبکہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ نے ان چیزوں کو دفنا دیا تھا۔

۳۔ سب سے اہم اور غور طلب نکتہ یہ ہے کہ نصِ قولِ پیغمبرؐ و علیؑ اور اصحاب و تابعین کے مطابق' امت میں اس وقت منصب خلافت کیلئے سب سے زیادہ سزاوار حسین بن علیؑ تھے چنانچہ خود امام حسینؑ فرماتے تھے:

''منصب خلافت کیلئے سب سے زیادہ سزاوار میں ہوں''۔

معاویہ نے امامؑ کو اس منصب کے لئے نااہل ثابت کرنے کیلئے علی ابن الحسینؑ کو اس کا سزاوار ٹھہرایا اور اس میں بھی بنی اُمیہ سے رشتہ کو معیار قرار دیا ہے اسی طرح اس قضیہ میں شجاعت کو علی ابن الحسینؑ سے منسوب کر کے اسے اسکے اصل مصدر سے دور کرنے کی کوشش کی ہے نصِ پیغمبرؐ اور کثیر روایات کے تحت' امت میں سب سے زیادہ شجاع علیؑ تھے جبکہ اس قصے میں شجاعت کو علیؑ سے ہٹا کر قبیلہ بنی کلاب کی طرف منتقل کیا گیا ہے۔

کتاب میزان الحکمۃ (حدیث ۲۷۴۱) میں پیغمبر اکرمؐ کی وہ معروف حدیث کہ جو آپؐ نے لشکر اسلام کی میدان جہاد سے واپسی پر فرمائی تھی نقل ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں: ''مرحبا تم سب جہاد اصغر سے فارغ ہو کر آئے ہو' اب جہاد اکبر کرنا ہے۔'' لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہؐ! جہاد اکبر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''جہاد بالنفس'' ہے۔

جہاد بالنفس وراثتی نہیں ہوا کرتا بلکہ تربیت و توجہ بہ خدا سے انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب کی حدیث ۲۷۸۵۱ ہے کہ ''جہاد بالنفس جہاد میدان سے بہتر ہے۔''

شجاعت فقط جسمانی نہیں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ میزان الحکمۃ ہی میں شجاعت سے متعلق یہ احادیث نقل ہیں:

''سب سے زیادہ شجاع وہ ہے جو سخی ہو۔'' [حدیث ۹۱۶۴]

''شجاع وہ ہے جو علم کو جہل پر غلبہ دے۔'' [حدیث ۹۱۶۵]

''سب سے زیادہ شجاع وہ ہے جو اپنے نفس پر غلبہ رکھتا ہو۔'' [حدیث ۹۱۹۷]

شجاعت موروثی صفت نہیں ہے:

بیان کیا جاتا ہے کہ قمرِ بنی ہاشم حضرت عباس ابن علیؑ کی بے مثال شجاعت و جوانمردی کی بنیاد پر آپ کو حسین بن علیؑ نے اپنا صاحب لواء بنایا تھا۔ کہتے ہیں یہ شجاعت ورثہ میں ملی تھی اور آپ کی والدہ ام البنین کے آباء و اجداد سے منتقل ہوئی تھی۔

جب ہم نے جناب ام البنین کے نسب کے بارے میں تحقیق کی تو پتا چلا کہ ان کا سلسلۂ نسب قبیلہ بنو ھوازن پر منتھی ہوتا ہے۔ محققین و ماہرین انساب عرب نے لکھا ہے جیسا کہ کتاب ''نہایۃ لارب'' ص ۳۹۱ پر نقل ہے کہ قبیلہ بنو ھوازن دو ناموں سے معروف تھا۔ ایک کا سلسلۂ نسب مزیقیا سے ملتا ہے اور مزیقیا قحطانیہ پر منتھی ہوتا ہے۔ دوسرے کا سلسلۂ نسب قیس بن عیلان سے ملتا ہے اور عدنانیہ پر منتھی ہوتا ہے۔

قبیلۂ بنو ھوازن:

حضرت ام البنین کا بنو ھوازن کی جس شاخ سے تعلق تھا اسکا سلسلہ قیس بن عیلان عدنانیہ سے منتسب ہے چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر قبیلہ بنو ھوازن سے متعلق کچھ معلومات قارئین تک پہنچائی جائیں۔

کتاب ''غزوۂ حنین'' کے صفحہ ۴۱ پر محمد احمد باشمیل لکھتے ہیں کہ مورخین اور معاجم نسب کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ قبیلہ بنو ھوازن سرزمین عرب کا سب سے بڑا اور سب سے خطرناک قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کا سلسلہ مزیقیا عدنانیہ سے ملتا ہے جو آگے چل کر متعدد قبائل میں تقسیم ہوا ہے۔ انہیں میں سے ایک ھوزان بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس بن عیلان بن مضر بن نزار بن معاد بن عدنان ہے۔ اس قبیلہ کی چند بڑی بڑی شاخیں یہ ہیں:

۱۔ قبیلہ بنی ثقیف جو طائف کی طرف ہے۔

۲۔ قبیلہ کعب۔

۳۔ بنی ہلال۔

۴۔ بنو عامر بن صعصعہ۔

۵۔ بنوجشم عشیر۔

۶۔ بنونصر' جو مالک بن عوف کی قوم ہے۔

۷۔ بنی کلاب جس سے جناب ام البنین کا تعلق تھا۔

مذکورہ بالا تمام قبائل بنوھوازن درج ذیل تین خاندانوں پر منتہی ہوتے ہیں:

(۱) بنوسعد بن بکر

(۲) بنومعاویہ بن بکر

(۳) بنومنبع بن بکر

بکر ھوازن سے ہے۔

بنوھوازن اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں اور افرادی قوت کے حوالے سے اپنے دور کا ایک مشہور و معروف قبیلہ تھا یہ قبیلہ قریش کے بعد اسلام کا دوسرا بڑا دشمن تھا۔ مسلمانوں سے نبرد آزمائی کی خاطر یہ اسلحے سے لیس رہتا تھا۔ اس کا روم سے بھی رابطہ قائم تھا اس سلسلے میں انھوں نے اپنا ایک قبیلہ بنی ثقیف ان کے حوالے کر رکھا تھا۔ حضور اکرمؐ کے زمانہ میں اس قبیلہ نے کئی بار مسلمانوں پر حملہ کیا اور ان سے جنگیں ہوئیں۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے ہمسایہ قبائل کے ساتھ برسرپیکار رہتے تھے اور خود آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے۔

دور جاہلیت میں اس قبیلہ نے چار جنگیں بنام "جنگ فجار" لڑی ہیں ان جنگوں کو فجار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگیں اشہرِ حرم میں لڑی گئی تھیں جو کئی سال جاری رہیں۔ یہ جنگیں بعثت پیغمبرؐ سے چھبیس سال پہلے لڑی گئی تھیں۔

ہجرت مدینہ کے بعد لڑی گئی سب سے بڑی جنگ' جنگِ احزاب ہے اس جنگ میں مدینہ کا محاصرہ کرنے میں مشرکین کے تمام قبائل بمعہ قبیلۂ ھوازن شامل تھے۔ دو قبائل اسلام کے ایسے سخت ترین دشمن تھے جو مسلمانوں سے برملا ٹکر لیتے رہتے تھے جن میں سے ایک قبیلہ بنوھوازن اور دوسرا قبیلۂ قریش تھا۔ قریش کا سیاسی عسکری اور مذہبی مرکز مکہ تھا جسے لشکر اسلام نے سنہ ۸ ہجری میں فتح کر لیا اور اس کے ساتھ ہی قریش کا بھی خاتمہ ہو گیا لیکن قبیلہ ھوازن اسکے بعد بھی اسلام کیلئے ایک چیلنج بنا رہا۔ فتح مکہ کے بعد انہیں مسلمانوں سے

زیادہ خطرہ محسوس ہونے لگا لہٰذا مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو پیشگی طور پر کچلنے کے لئے انھوں نے مکہ کی طرف فوج کشی کرنے کی کوشش کی۔ لشکر اسلام کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کیلئے مکہ میں اپنے جاسوس بھیجے اور اس کے ساتھ ہی جنگ کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ دراصل فتح مکہ کے بعد ان کا سکون ختم ہو گیا تھا ایک طرف تو ان کے دلوں میں مسلمانوں کا خوف بیٹھ گیا تھا اور دوسری طرف انکی عداوت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا آخر میں نبرد آزمائی پر اتر آئے اور مالک بن عوف کو اپنے قبیلہ کا سردار بنایا جس کا تعلق بنی نصر بن معاویہ بن بکر بن ھوازن سے تھا۔ یہ شخص اپنے قبیلہ میں سب سے زیادہ شجاع سمجھا جاتا تھا اس کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔

بنوھوازن کے چرچہ شجاعت کی حقیقت

قبیلۂ بنوھوازن کی شجاعت کا چرچا تمام عرب میں تھا اور بقول سیرت نگاران حضرت علیؑ کی زوجیت کے لئے اس قبیلہ سے تعلق رکھنے والی خاتون یعنی جناب اُم البنین کا انتخاب اسی بنیاد پر کیا گیا تھا۔

مردانِ شجاع حقیقت میں وہ ہوتے ہیں جو حالات کی دگرگونی سے حواس باختہ نہیں ہوا کرتے ہیں' جو مسائل کو عقل و تدبر اور فراست سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر اہل حل و عقد اور دانشوروں سے صلاح و مشورہ کرتے ہیں۔ لیکن قبیلۂ بنوھوازن ہر وقت شرارت اور اپنی شجاعت و جوانمردی کا مظاہرہ کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ ان کی ایسی ہی غلطیاں خود ان کے وجود کے خاتمہ پر منتہی ہوئیں یہاں پر ہم ان چند غلطیوں کا تذکرہ کریں گے:

۱۔ اس قبیلہ کا ایک سرکردہ شخص مالک بن عوف نصری تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ بنونصر بن معاویہ بن بکر بن ھوازن سے تھا۔ اس شخص نے تمام دوسرے قبائل سے قیادت چھین کر خود کو سب کے اوپر مسلط کر دیا اور انہیں اپنی قیادت کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔

۲۔ فتح مکہ کے بعد جب انہیں مسلمانوں سے خطرہ درپیش ہوا تو انہوں نے شہر سے باہر مورچہ بندی شروع کر دی۔ اس کے بعد کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ مسلمانوں کو مکہ سے نکالنے اور وہاں پر دوبارہ بت پرستی کو

رواج دینے کی کوشش میں لوگوں کو جمع کرنے لگے۔

۳۔ تیسری غلطی انہوں نے یہ کی کہ لوگوں کو عورتوں، بچوں، مویشیوں، سونا چاندی اور دوسرے مال ومنال سمیت نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے زعم وگمان کے تحت اس کا فلسفہ یہ تھا کہ جب جنگ شروع ہو تو لوگوں کیلئے فرار اختیار کرنے کی گنجائش نہ رہے اور وہ مرتے دم تک مسلمانوں کے خلاف مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ جب بچے ساتھ ہوں گے تو کوئی شخص بھی بچوں کو چھوڑ کر میدان سے فرار اختیار نہیں کرے گا۔

اس غلط فیصلے پر دُرید بن صمہ نامی ایک سردار نے مالک بن عوف کو نظر ثانی کرنے کیلئے کہا اور عورتوں اور بچوں کو واپس کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے علاوہ اس نے پہاڑ کی چوٹی پر رہنے اور بعض سواروں کے ذریعے مقابلہ کرنے کا مشورہ بھی دیا لیکن مالک بن عوف نے قبول نہیں کیا۔

طیش وغضب اور جنون میں کیے ہوئے فیصلوں نے ان کی صفوں میں انتشار پھیلا دیا اور مرکزی قیادت کے خلاف آواز بلند ہونے لگیں۔ چونکہ اس قبیلہ کے لوگ پورے جزیرۃ العرب میں اپنے آپ کو جری وشجاع و بہادر سمجھتے تھے اور اپنی حیثیت کو حد سے زیادہ تصور کرتے تھے، اسلئے کسی بھی مشورہ پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ ان کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے ھوازن کے دو قبیلوں نے جنگ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور پیچھے ہٹ گئے یہ دو قبیلے یہ تھے:

(۱) قبیلۂ بنو کعب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ھوازن۔

یہ قبیلہ تمامہ، مدینہ اور شام میں رہائش پذیر تھا۔

(۲) قبیلۂ بنو کلاب۔ کلاب بن ربیعہ کعب بن ربیعہ کا بھائی تھا۔

یہ قبیلہ ابتداء میں فدک اور عوالی میں قیام پذیر تھا۔ بعد میں وہاں سے منتقل ہو کر اس نے دومۃ الجندل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں حضرت علیؑ اور معاویہ کے مابین حکمین کا اجلاس ہوا تھا۔ وہاں ایک بت نصب تھا جس کا نام وَدّ تھا۔ یہ لوگ پہلے نصرانی تھے لیکن بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

ان دونوں قبائل کے پیچھے ہٹنے سے قبیلہ بنو ھوازن کو بڑا دھچکا لگا۔ بعض لوگوں کو فتح وکامیابی کے بارے میں

شک ہونے لگا وہ سوچنے لگے کہ شاید شکست ہمارا مقدر ہو گی، اسی لئے یہ دو قبیلے جنگ میں شرکت نہیں کر رہے ہیں، ورنہ ایسا نہ کرتے۔

لیکن اس کے باوجود قبیلۂ بنو ھوازن میں ہزار کا لشکر لیکر اسلام و مسلمین کے مقابلے میں اُتر آیا جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ بنو ھوازن پہاڑ کی چوٹیوں پر مورچہ زن تھے۔ جب مسلمانوں کا لشکر وہاں سے گزرنے لگا تو اچانک اوپر سے پتھروں اور تیروں سے حملے ہوئے جس سے لشکر اسلام کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا لہٰذا راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کے کہنے پر مسلمان ایک دفعہ پھر جمع ہو گئے۔ اس مرتبہ جب مقابلہ ہوا تو لشکر اسلام نے بنو ھوازن کو شکست دی۔ ان کی تمام املاک غنیمت میں لے لی گئیں اور مردوں اور عورتوں کو اسیر بنا لیا گیا۔ پیغمبر اسلامؐ کی دایہ حلیمہ سعدیہ کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا پیغمبر اسلامؐ نے اُن کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اپنے حصے میں آئے ہوئے اسیروں کو آزاد کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے بھی اپنے اپنے حصے میں آئے ہوئے اسیروں کو آزاد کر دیا غرض قبیلہ بنو ھوازن جنگجو ہونے اور شجاعت و جرأت میں شہرت رکھنے کے باوجود شکست سے دوچار ہو گیا۔ یہاں چند سبق آموز نکات ملتے ہیں:

۱۔ قبیلۂ بنو ھوازن گرچہ کہ جنگ وجدل میں ماہر تھا لیکن اپنے اس زعم وگمان میں مست ہو کر شرارت اور جنونیت پر اُتر آیا تھا جس کا انجام شکست پر منتج ہوا۔

۲۔ جب قبیلۂ کعب بن ربیعہ نے قبیلۂ کلاب بن ربیعہ سے پوچھا کہ جنگ میں کیوں شریک نہیں ہوتے تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اس وقت اگر مشرق و مغرب سب محمدؐ کے خلاف ہو جائیں تب بھی شکست ہی ان کا مقدر رہے گی''۔ بنو کلاب جان چکے تھے کہ شجاعت کا اصل محور و مرکز محمدؐ اور ان کا دین ہے یعنی انہوں نے شجاعت کو مسلمانوں کا ورثہ قرار دیا۔

۳۔ شجاعت صرف زور قوتِ بازو اور جنگجو ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ قائد و رہبر کی دور اندیشی جنگی حکمت عملی اور بروقت تدابیر بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ان حقائق کے واضح و آشکار ہو جانے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ جناب ابوالفضل العباسؑ کی شخصیت،

شجاعت، جوانمردی اور فداکاری کو ان کی مادرِ گرامی کے قبیلۂ بنو کلاب بن ھوازن سے تعلق کو قرار دینا عقل اور تاریخی موازین سے متصادم ہے۔ اس کے برعکس یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ پیغمبر اسلامؐ کے دفن کردہ نظریۂ عظمت و بزرگی قبائل عرب کو ایک دوسری شکل و روپ میں پیش کرنے کی ایک کاوش ہے تاہم اس سلسلے میں مزید بحث و تحقیق کا دروازہ سب کیلئے کھلا ہے۔

اجتہاد و تحقیق صرف سائنس و ٹیکنالوجی اور فقہ تک محدود نہیں تاریخ کیلئے بھی ہے۔ قیام امام حسینؑ کہ جسکا تعلق ہماری حیات و بقاء سے ہے بلکہ ہماری رگِ حیات کی مانند ہے، اُسے بھی تحقیق کیلئے سزاوار ہونا چاہیے۔ ہم نہ تو اس سلسلے میں ان جھوٹی تاریخوں کے وجود سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہر واقعہ کو مسلماتِ اوّلیہ اور عقل و فطرت کے عین مطابق شمار کر سکتے ہیں کہ باب اجتہاد و تقلید سے ان کو مستثنیٰ رکھیں۔

اولادِ حضرت اُم البنینؑ

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے خداوند متعال نے آپ کو چار فرزند عطا کئے جو سب کے سب کربلا میں زیرِ پرچم سرورِ شہیدان شہید ہو گئے۔ سب سے بڑے بیٹے حضرت ابوالفضل العباسؑ ہیں آپ کو میدان کربلا میں علمدارِ لشکر حسینؑ اور حرم حسینؑ کے ساقی بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اپنے تینوں بھائیوں کو آپ نے یکے بعد دیگرے میدان شہادت میں بھیجا۔ ان تینوں کی شہادت کے بعد آپ خود میدان میں تشریف لے گئے اور جانبازی و جان نثاری کا بے مثل مظاہرہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ آپؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ اور تمام اہل بیتؑ کے چہروں پر یاس و نا اُمیدی اور افسردگی کی لہر دوڑ گئی۔

جناب اُم البنینؑ کے فرزندان نسور کے اسمائے گرامی اور معرکۂ کربلا کے وقت انکی عمریں حسب ذیل ہیں:

۱۔ **حضرت ابوالفضل العباسؑ:** آپ کربلا میں ۳۴ سال کے تھے۔

۲۔ **حضرت عبداللہؑ:** کربلا میں آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔

۳۔ **حضرت عثمانؑ:** آپ کی عمر ۲۳ سال تھی۔

۴۔ **حضرت جعفرؑ:** آپ ۲۱ سال کے تھے۔

قہرمانِ کربلا

قہرمان کلمۂ فارسی ہے اسکو کبھی کہرمان بھی کہتے ہیں۔ یہ کلمہ ایک ایسے دلیر، پہلوان، شجاع، بہادر اور صاحب قوت وقدرت واختیار کیلئے استعمال ہوتا ہے جس پر کسی کو غلبہ حاصل ہوا ہو اور جس نے کسی سے شکست نہ کھائی ہو۔ عربی میں آمدنیات اور اخراجات کے امین معتمد ومتصرف کو بھی قہرمان کہتے ہیں۔ قہرمان کربلا سے ہماری مراد علیؑ کا وہ بہادر جوان ہے جس ہے جس کا نام گرامی عباسؑ، کنیت ابوالفضل ہے اور عام لوگ جسے ''بـــــاب الحوائج'' کہتے ہیں۔

۴ رشعبان سنہ ۲۶ ہجری کو شہر مدینہ منورہ میں آسمان ولایت وامامت پر ایک قمر طلوع ہوا جو بعد میں قمر بنی ہاشم کے لقب سے معروف ہوا۔ حضرت علیؑ نے اس کا نام عباس رکھا۔ فرزندان امیرالمومنینؑ میں حسنینؑ کے بعد فضیلت جسمانی اور معنوی میں حضرت عباسؑ سب سے زیادہ غیر عادی نبوغت کے حامل تھے۔ اسی وجہ سے ہر فضیلت کے شیفتہ نے ان فضائل کے نبوغ اور ظہور کی بنیاد پر اور آپ کو اس فضیلت کا تجسم اور نمونہ پا کر ایک لقب سے نوازا دیا لہٰذا ایام طفولیت سے شہادت تک کے پینتیس (۳۵) سالہ دورِ حیات میں آپ مختلف القاب سے پہچانے گئے۔

قبیلۂ بنی ہاشم میں پہلے دن سے آپ کو ''قمر بنی ہاشم'' کے لقب سے پکارا گیا اور اسی سے آپ معروف ہوئے محرم سنہ ۶۱ ہجری کی ساتویں تاریخ سے دشت کربلا میں لشکر اُموی نے حسینؑ اور اہل بیت حسینؑ کا نہر فرات سے پانی لینا روک دیا۔ سپر یارانِ ابی عبداللہ الحسینؑ بنی ہاشم وانصار کی ایک مختصر جماعت عباسؑ کی قیادت میں شب عاشور تک دشمن کی کثرت اور قوت کو چیلنج کر کے پانی لانے میں کامیاب ہوتی رہی۔ اس وجہ سے حرم حسینی نے آپ کو ''سقائے حرم'' کے لقب سے پکارا۔

دس محرم الحرام سنہ ۶۱ ہجری صبح عاشورا جب دونوں جانب لشکر منظم اور مرتب ہونا شروع ہوئے تو لائق و

سزاوار افراد کو جنگی پرچم تقسیم کیے گئے۔ داعیٔ حق، امام وقت، ابی عبداللہ الحسین ابن علیؑ نے آپ میں دین حق کا دفاع کرنے کی جسمانی، روحانی، معنوی اور ایمانی صلاحیتوں کو دیگر اصحاب واعزاء کی بہ نسبت زیادہ دیکھ کر پرچم رسالت اسلام آپ کے سپرد کیا۔ اسی دن سے آپ ''حاملِ لوائے امام حسینؑ'' یا ''علمدار'' کے نام سے معروف ہوئے۔

تاریخ کربلا میں جن شخصیات پر مؤلفین ومصنفین نے قلم اٹھائے ہیں، ان میں کثرت کے اعتبار سے سر فہرست حسین بن علیؑ کا نام ہے آپؑ کی شخصیت پر لکھی گئی کتابوں کے اعداد وشمار صحیح معنوں میں ابھی تک سامنے نہیں آئے ہیں۔ حسینؑ کے بعد معرکۂ کربلا کی جن ہستیوں پر مصنفین نے قلم اٹھائے ہیں وہ عقیلہ بنی ہاشم اور قمر بنی ہاشم کی ذوات گرامی ہیں۔ حضرت عباسؑ سے متعلق تمام تر تصنیفات وتالیفات میں جو عنصر مؤلفین ومصنفین پر حاوی رہا ہے وہ آپ کا نسب، آپ کی جسامت وقوت بازو اور دنیوی زاویۂ زندگی سے ماخوذ دیگر صفات ہیں۔ آپ کی ذات گرامی سے متعلق ایک اور صفت جس پر آپ کی شہادت کے بعد قلم اٹھایا گیا ہے وہ بعنوان ''باب الحوائج'' ہے۔ حاجتوں کے روا ہونے کی روایتوں کی بنیاد پر آپ باب الحوائج کے نام سے معروف ہوئے اور اس حوالے سے آپ کی کرامتوں اور حاجت روائی کو موضوع بنا کر بھی لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بہر کیف جن موضوعات پر آپ کے بارے میں تصانیف اور تالیفات سامنے آئی ہیں ان میں زیادہ تر کی توجہ صرف حیات مادّی تک متوقف ہے جس سے مندرجہ ذیل قباحتیں پیش آئی ہیں:

(۱) چونکہ مادّہ اور مادّی صفات لامحالہ محدود ہوتے ہیں، اسپر قلم وزبان کا چلنا بھی محدود ہی ہوتا ہے۔

(۲) مادّہ کی طرف توجہ مرکوز کرنے سے آپ کے اعلیٰ وارفع اہداف ومقاصد پس پشت ہو گئے ہیں۔

(۳) دوست تو درکنار مخالفین بھی اپنی دنیا کی خاطر آپ سے وابستگی رکھتے ہیں۔ بعض نے اس حاجت روائی کو غلو کا رنگ دے کر آپ کے نام سے خوب اپنی دنیا بنائی ہے۔ اس کے نتیجہ میں لوگ حسینؑ اور اہداف حسینی سے دن بہ دن دور اور نا آشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

(۴) آپ سے اپنی دنیوی مفادات کی حد تک ہی وابستگی ہونے کی وجہ سے آپ سے منسوب ایسے ایسے قصے

اور افسانے جعل کئے گئے ہیں کہ جو آپ کے عالی مقام و منزلت کیلئے نہ صرف یہ کہ لائق و سزاوار نہیں بلکہ بعض اوقات اہانت و جسارت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کی فضیلت میں ایسی کہانیوں کے بیان سے خدا اور اہل بیت اطہار ؑ نالاں ہونگے۔

فضائل قہرمانِ کربلا

ہم ان صفحات پر پہلے آپ کے بارے میں وارد وہ فضائل جو امام حسین ؑ، امام سجاد ؑ، امام جعفر صادق ؑ اور علماء و فقہائے عظام کی زبان شریعت سے وارد ہوئے ہیں نقل کریں گے۔ ان فضائل و کمالات کی روشنی میں ہر قاری کیلئے یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ جو افسانوی قصے کہانیاں آپ کی فضیلت میں بیان کئے جاتے ہیں وہ آپکی شان میں اہانت اور جسارت ہونے کے علاوہ کہیں کہیں دین و شریعت اور مکتب حسینی کے اہداف سے متصادم اور متعارض بھی ہیں لہٰذا پہلے یہ فضائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کتاب ''ثاراللہ'' تالیف شیخ حسین عندلیب ص ۲۴۴ ''کامل الزیارات'' ص ۲۵۷، اور ''بحار الانوار'' جلد ۹۸ صفحات ۲۱۷، ۲۶۱ سے نقل ہے کہ ائمہ ؑ نے بارہا فرمایا ہے کہ ''آپ مظلوم شہید ہوئے''۔

(۲) ''کامل الزیارات'' صفحہ ۲۵۷ اور بحار الانوار جلد ۹۸ صفحہ ۲۱۸ میں ہے کہ ''آپ اسی راستہ سے گزرے ہیں جس صراط سے اہل بدر گزرے''۔

تاریخ اسلام کی سب سے پہلی جنگ، جنگِ بدر ہے اور اس میں شہید ہونے والے تمام شہداء دیگر شہداء سے زیادہ افضل ہیں۔ اسی بنا پر عباس ؑ کا موازنہ و مقابلہ بدر کے شہیدوں سے کیا گیا ہے۔

(۳) امام معصوم سے منسوب زیارت کے فقرات ہیں کہ:

''خدا آپ (عباس) کو سب سے افضل اور سب سے زیادہ جزائے خیر دے، وہ جزا جو وقت کے امام کی بیعت میں وفادار رہنے والوں کو عطا کی جاتی ہے۔ آپ نے اپنے امام کی دعوت قبول فرمائی، ہمیشہ امام کی اطاعت میں رہے۔ اس کے صلہ میں خداوند عالم آپ کی روح کو تمام شہداء کے ساتھ، اپنی جنت میں بہترین مقام و منزلت پر فائز کرے''۔

اسی زیارت میں امام جعفر صادق ؑ سے نقل ہے آپ فرماتے ہیں:

''خداوند عالم نے عالم اعلیٰ میں آپ کے مقام کو بلند کیا ہے''۔

(۴) حضرت امام سجاد ؑ نے کربلا کے بعد جب آپ کے فرزند عبداللہ بن عباس کو دیکھا تو فرمایا:

''خدا عباس پر رحم کرے کہ انہوں نے ہمیشہ حسین ؑ کو خود پر مقدم رکھا اور اس آزمائش میں اچھی طرح کامیابی سے گزرے اپنی جان اپنے بھائی پر فدا کی، یہاں تک کہ آپ کے دونوں بازو قطع ہوئے خداوند عالم نے اس کے بدلے میں آپ کو دو پر عطا کئے جس طرح جنگ موتہ میں شہید ہونے والے جعفر کو عطا فرمائے تھے''۔

پھر امام ؑ نے فرمایا:

''خدا نے میرے چچا عباس کو وہ مقام و منزلت عطا کی ہے کہ شہدائے اوّلین و آخرین اس پر غبطہ کرتے ہیں''۔

(۵) عصر تاسوعا جب لشکر عمر سعد خیام اہل بیت حسینی کی طرف بڑھا تو اس وقت امام ؑ نے حضرت عباس سے کہا:

''بھائی! میں آپ پر قربان ہوں ذرا جایئے اور ان سے پوچھئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں''۔

(۶) میدان جنگ میں جب آپ مشغول نبرد تھے تو آپ نے فرمایا: ''میں ہمیشہ اپنے دین کا دفاع کروں گا'' دوسرے شعر میں فرمایا: ''مجھے موت سے کوئی ڈر نہیں کیونکہ موت انسان کو وقت شہادت بلند درجہ پر فائز کرتی ہے''۔

(۷) ایثار و وفاداری عباس کے کمال کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ پیاسے نہر فرات میں داخل ہوئے اور حسین ؑ و اولاد حسینی کی پیاس کو یاد کر کے پانی پر پوری دسترس کے باوجود تشنہ ہی فرات سے باہر نکل آئے۔

(۸) جس وقت فرات پر آپ کے بازو قلم ہوئے اور آپ نے اپنے آقا و مولا حسین ؑ کو پکارا تو امام ؑ نے فرمایا:

''میری کمر استقامت خمیدہ ہو گئی ہے''۔

(۹) جب حضرت امام حسین ؑ نعش عباس ؑ پر پہنچے تو فرمایا: ''بھائی عباس! آج وہ آنکھیں سکون سے سوئیں گی جو تمہیں دیکھ کر آج تک نہیں سوئی تھیں''۔

(۱۰) آپکی زیارت میں یہ جملہ ہے کہ ''آپ تاریخ بشریت میں اپنے بھائی کے ساتھ بہترین مراسات کرنے

والے بھائیوں میں سے ہیں"۔

یہ فقرات وکلمات جو امام حسینؑ' امام سجادؑ اور امام جعفر صادقؑ نے آپ کی شان وشخصیت اور فدا کاری کے بارے میں فرمائے ہیں' اس کا ہر جملہ صاحبانِ غور وفکر کیلئے ایک بحرِ فضیلت ہے۔

یہ تھے وہ فضائل' جو صفحاتِ مقاتل اور کتبِ سوانح حضرت عباسؑ میں ملتے ہیں لیکن جب ان مناقب پر نقد و تحقیق کرنے والے مزید دقت اور غور کرتے ہیں تو چند اور فضائل بھی سامنے آتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں یہ وہ فضائل ہیں جو الفاظ کے قالب میں نہیں کو نجتے۔ ہم ان فضائل میں سے بعض کا ذکر یہاں پر کریں گے:

(۱) حضرت عباسؑ کی فضیلت کا معروف ترین کلمہ آپ کا لقب "قمر بنی ہاشم" ہے۔ اصحاب تفسیر وسیر وتاریخ نے حضرت عباسؑ کو قمر بنی ہاشم کہنے کی جو تفسیر بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عباسؑ حسن وجمال اور شکل وصورت میں' خاندانِ بنی ہاشم میں چاند کی مانند چمکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اسی بنیاد پر اسوقت عباسؑ کو قمر بنی ہاشم کہا گیا ہو جیسا کہ مفسرین نے بھی بیان کیا ہے لیکن ہماری دانست میں یہ ایک سطحی تفسیر ہے۔

حیات طیبۂ حضرت عباسؑ کے تمام لمحات کو سامنے رکھنے اور قمر کی اپنی حیثیت کا جداگانہ تجزیہ کرنے کے بعد' ان دونوں کو ملانے سے حضرت عباسؑ کی شان میں ایک اور بابِ معرفت کھلتا ہے۔ چاند اگرچہ منظومۂ شمسی میں ایک چھوٹا سیارہ ہے لیکن اس کے باوجود قرآن کریم میں نثر نگاروں کی تحریروں میں اور شعراء کے اشعار میں' قمر کا ذکر ہمیشہ شمس کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۲) چاند کی روشنی اہل زمین کیلئے مادّی اور معنوی دونوں حوالوں سے کثیر فوائد کی حامل ہے۔

(۳) چاند کا نور اپنا نہیں ہے' اسکی نورانیت سورج کی روشنی سے ماخوذ ہے اور یہی سبب ہے کہ سورج اور چاند کے درمیان دورانِ گردش جب زمین آجاتی ہے تو چاند تاریک ہو جاتا ہے اس چھوٹے سے سیارے کی جسامت اور نورانیت دونوں فضیلتیں' سورج کے پیچھے رہنے میں اور خود اسکے اور سورج کے درمیان کسی چیز کے حائل نہ ہونے میں پوشیدہ ہے۔ گویا وہ اپنی حیثیت اور بقا وکمال' سورج کے پیچھے رہنے میں دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اگر سورج سے استقلال طلب نہ کرے گا تو اس کی تمام فضیلت محو ہو جائے گی۔ عباسؑ قمر بنی

ہاشم ہیں۔ اگر قبیلۂ بنی ہاشم کے آسمان پر کوئی سورج نہ ہو تو وہاں کیسے قمر آسکتا ہے۔ عباسؑ کا قمر بنی ہاشم ہونا اس بات پر متوقف ہے کہ قبیلۂ بنی ہاشم کے آسمان پر ایک سورج طلوع ہے اور یہ قمر اس سورج کے پیچھے ہے۔ سورج اور چاند میں کوئی موازنہ ومقابلہ نہیں ہے کیونکہ چاند تو فقط ہماری زمین کیلئے ہے جبکہ سورج اور بھی کرات موجود کو نور دیتا ہے یہ چاند بھی اسی سورج سے فضیلتِ نورانیت کشف کرتا ہے۔

جس شمس سے قمر بنی ہاشم عباسؑ نے نور کشف کیا ہے' وہ شمس حسینیؑ ہیں۔ حسینؑ تنہا افق بنی ہاشم پر ہی نہیں طلوع ہوئے' وہ فقط آسمان مدینہ پر ہی نہیں چمکے بلکہ آسمان فضیلت وشرافت اور آسمان انسانیت پر بھی طلوع ہوئے ہیں لہٰذا تمام فضائل وکمالات' ایثار' قربانی' وفاداری' شجاعت' غرض جتنی بھی فضیلتیں عباسؑ میں نظر آئیں گی وہ سب کی سب اس کے اصل ماخذ کی شعاعیں ہیں اور عباسؑ اس کا آئینہ ہیں۔ اگر آئینہ پر صورت دکھانے والا نہ ہو تو آئینہ خالی نظر آئے گا لہٰذا اگر حسینؑ کو عباسؑ سے جدا کر دیں گے تو عباسؑ میں کوئی نور نظر نہیں آئے گا۔

زندگانیٔ قمر بنی ہاشم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عباسؑ حسینؑ ہی میں محو وغرق ادب رہتے تھے جس طرح خود امام حسینؑ کی شان میں وارد ہے کہ آپؑ امام حسنؑ کے حضور میں کوئی تکلم نہیں فرماتے تھے' بعینہ اسی طرح عباسؑ حسینؑ کے حضور میں رہتے تھے۔

قہرمان اور شجاعت

ابن اثیر نے اپنی کتاب میں "شجاع" کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ش" پر پیش لگائیں یا زیر دونوں صورتوں میں یہ کلمۂ مذکر سانپ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت نے اس لفظ کو مذکر اور مؤنث دونوں موارد میں استعمال کیا ہے۔ فیومی نے اپنی کتاب "مصباح المنیر" میں قوی القلب کو شجاع کہا ہے۔ اسی مناسبت سے وہ جنگ میں کود پڑنے والے کو شجاع کہتے ہیں۔ لغت میں یہ کلمہ سانپ کیلئے مختص ہونے کے باوجود قوی القلب کے معنوں میں اسکے استعمال کی وجۂ تسمیہ کے بارے میں فیومی لکھتے ہیں کہ سانپ اور قوی القلب انسان کے درمیان ایک مماثلت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ سانپ کی زبان میں زہر ہوتا ہے، وہ جسے ڈستا ہے اسے ختم کر دیتا ہے۔ مرد شجاع بھی اسی طرح ہے، جہاں کود پڑتا ہے تلف کر دیتا ہے۔ بعض نے شجاعت کو طبیعت انسانی میں پائی جانے والی ایک صفت نفسانی قرار دیا ہے جو کبھی قوی ہوتی ہے اور کبھی اس پر ضعف و ناتوانی عارض ہو جاتی ہے۔

احمد ربیع نے کتاب "سلوک مسالک" میں شجاعت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقدام کرنے اور مشکلات و خطرات میں پیچھے نہ ہٹنے کو شجاعت کہتے ہیں اور اس صفت کے حامل فرد کو شجاع کہا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی بنیاد قوت غضبیہ ہے۔ یہ صفت درحقیقت صفتِ حیوانی اور صفت درندگی ہے جس کا مرکز دل ہے اس میں انسان و حیوان دونوں ہر اس چیز کو کہ جو انکے بدن اور نفس کے موافق نہیں ہے، دفع کرتے ہیں۔

شریف جرجانی نے کتاب "تعریفات" میں صفحہ ۸۵ پر لکھا ہے کہ شجاع اس انسان کو کہا جاتا ہے جس میں وہ قوتِ غضبیہ موجود ہو جو تہور اور جبن کے درمیان ہوتی ہے۔ قوت غضبیہ کی ظہور کی تین صورتیں ہیں:

(۱) **تہور:** تہور کے معنی ہیں کود پڑنا، غضب کے استعمال میں حد سے گزر جانا، کسی قسم کی حد بندی اور نفع و نقصان کے بارے میں دور اندیش نہ ہونا۔

(۲) **جبن:** ضرورت کے مواقع پر اقدام نہ کرنے اور پیچھے ہٹنے کو جبن کہتے ہیں۔

(۳) **شجاعت:** وقت کی مناسبت سے ضرورت کے موقع پر اقدام کرنے کو شجاعت کہتے ہیں یہیں سے شجاعت، حیوانی صفت سے نکل کر خاص انسانی صفت قرار پاتی ہے۔ اسی لئے بعض نے شجاعت کو غریزۂ نفس اور طبیعت انسانی کی ایک خاصیت قرار دیا ہے لہذا کبھی کبھی نفس کی کراہت کے باوجود شجاعت کسی کام کو کر گزرتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کا نفس طبیعی طور پر بقا چاہتا ہے اور فنا ہونے سے کراہت کرتا ہے مگر مردان شجاع اس کراہت کی پروا نہیں کرتے۔ بعض علماء نے حلم، ثبات، طمانیت اور سکون و شہامت کو شجاعت کے مختلف مراتب میں شامل کیا ہے۔

شجاعت کی مذکورہ تعریف سے یہ بات واضح ہو گئی کہ شجاعت و قہرمانیت ایک بلند و بالا مظاہرۂ قوت کا نام ہے جس کا مرکز قوتِ غضبیہ ہے جو انسان اور حیوان دونوں میں مشترکہ ہے یہی وجہ ہے کہ بعض انسانوں میں بھی شجاعت حیوانی کا عنصر ختم نہیں ہوتا اور وہ اپنی اس طاقت و قدرت کو غیر محدود طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے شجاعتمند انسان کو ہمیشہ شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جس طرح شیر جنگل میں اپنے علاوہ کسی اور کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا، اسی طرح ایسے شجاع افراد بھی اپنے علاوہ دیگر شجاعت مندوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ایسے شجیع انسان کی دو صفات ہوتی ہیں:

(۱) اسے اپنے جسم و جسمانیت پر ناز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی طرح کی دوسری صفات پر بھی وہ نازاں رہتا ہے یوں اس میں ایک صفت درندگی پوشیدہ رہتی ہے۔

(۲) وہ صرف اپنے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کی نظر میں اسکے اپنے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کہیں اسکو خود اسی جیسا کوئی شجاع نظر آ جائے تو اس کے اندر فوراً حسد و کینہ اور احساس حقارت و کمزوری جنم لینے لگتا ہے۔

تاریخ میں ایسے شجاعوں کو عام طور پر پہلوان و قہرمان کہتے آئے ہیں ایسی صفات کے حامل شجاعان کی دور قدیم سے دور جدید تک ایک لمبی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے، جن میں کچھ فرضی نام ملیں گے اور کچھ حقیقی۔ مثال کے طور پر رستم، اسفندیار، مرحب عنتر، خالد بن ولید، طارق بن زیاد وغیرہ۔ ان تمام حضرات کی قوت و شجاعت کا

مرکز ومحوران کا جسم تھا، جس پر ان کو ناز تھا۔ ایسے افراد کو اپنے جسم کی جسمانیت کو بڑھانے اور سجانے پر کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔ ہر وہ چیز جوان کی طاقت وشجاعت کے باقی رکھنے کا موجب ہو وہ اسے اپنے لئے فراہم کرتے ہیں لیکن مرور ایام کے ساتھ انکی قوت وہمت' جوانی اور جسامت میں ضعف وکمزوری آ جاتی ہے اور پھر شجاعت کی جگہ ناتوانی غلبہ پالیتی ہے۔ اس طرح انکی شجاعت وقہرمانیت بھی خود انہی کی طرح بڑھاپے کی نذر ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی شجاعت کا مصدر او رماخذ صرف جسم وجسمانیت تھا۔ ایک عام انسان کے ذہن میں بالعموم شجاعت کا تصور یہی ہے۔ شاید بہت سے مومنین کے دلوں میں حضرت ابوالفضل العباسؑ کی شجاعت کا تصور بھی انہی شجاعان کی مانند ہے۔ یہ لوگ آپ کو انہی صفوں میں اور انہی صفات کا حامل گردان میں سب سے بہتر اور مقدم گردانتے ہیں لہٰذا آپ کی شان میں ایسے قصے بیان کئے جاتے ہیں اور ایسے نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ کو اپنے قوت بازو پر اتنا ناز تھا کہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے جبکہ قمر بنی ہاشم ان شجاعان کی صف میں شامل نہیں ہیں۔ اپنے جسم وجسمانیت اور جسامت وقوت کے بارے میں انکے ذہن میں کوئی فتور نہیں تھا۔ اس کے باوجود اگر کوئی انہیں اس قسم کے شجاعان کی صف میں گردانے تو یہ ان کی شان میں جسارت ہے۔

شجاعت کا دوسرا تصور

شجاعت کا دوسرا تصور ان ذوات پاک ہی کیلئے مختص ہے۔ وہ اپنی طاقت اور قدرت کو نہ تو اعلیٰ غذاؤں کا مرہون منت سمجھتے ہیں اور نہ جسم وجسامت او راسکی مالش وپرورش میں دیکھتے ہیں۔ ان کی شجاعت کا انحصار نہ تو حامیوں اور پشت پناہوں کی تعداد پر ہوتا ہے کہ انکو دیکھ کر جوش میں آ جائیں اور نہ ایسا ہے کہ خود کو تنہا دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں اور ہمت ہار بیٹھیں۔ یہ ذوات پاک دوسروں کو دیکھ کر نہ تو بغض وحسد میں مبتلا ہوتی ہیں اور نہ ہی احساس حقارت وکمتری محسوس کرتی ہیں۔ ان کی شجاعت وشہامت اور دشمن کے مقابلے میں ان کی استقامت کا مصدر خدا اور صرف خدا ہوتا ہے۔ ان میں آگے بڑھنے کی ہمت' اپنے فرضی منصبی کے ادراک اور اس میں غرق ومحو ہونے سے آتی ہے۔ انہیں فقط اپنے اوپر عائد فرض منصبی کے ادراک اور اس میں غرق ومحو

ہونے سے آتی ہے۔ انھیں فقط اپنے اوپر عائد فرض منصبی اور اسکے آگے لقاءاللہ نظر آتا ہے۔ ایسی صفات کے حامل انسان کی شجاعت کا مصدر وماخذ اور سہارا ہمیشہ خداوند متعال کی ذات پاک ہوتی ہے جو غیر محدود قدرت مطلقہ کی مالک ہے لہٰذا ان کی شجاعت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جوانی کا دور ہے یا بڑھاپے کا زمانہ۔ جسمانی فرسودگی اور کمزوری سے انکی شجاعت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ لوگ جوانی اور بڑھاپے دونوں حالتوں میں یکساں طور پر شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ علیؑ نے ۲۵ سال کی عمر میں جبکہ بھرپور جوانی کا عالم تھا تلوار کو نیام میں رکھا اور ایک گوشے میں محصور ہو کر یہ وقت گزار دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ شجاعت نفسانی کا عظیم ترین مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مخالفین کو انکی کامیابی اور کامرانی کیلئے بہترین مشورے بھی دیتے رہے۔

کیا دنیا میں کوئی ایسا شجاع ہے جو اپنے مخالفین کی بقا وسلامتی اور عزت وآبرو کا خواہاں ہو؟ یہی علیؑ جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتے ہیں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں تو جنگ صفین اور لیلۃ الحریر میں ایک عظیم قہرمان اور شکست ناپذیر مرد نظر آتے ہیں۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ کا شمار بھی اسی قبیل کے قہرمانوں اور شجاعان میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی شجاعت ومردانگی اپنے وقت کے امام کی اطاعت میں سر تسلیم خم کر کے خاضع وخاشع رہنے میں جانتے تھے۔

انکی تمام تر شجاعت ومردانگی اور بہادری کا ماخذ ومصدر امام وقت کے اہداف میں غرق ومحو ہونا تھا۔ امامؑ کی رضا ورغبت کے آگے نہ دشمن نظر میں سماتے تھے' نہ اپنی خودی اور نہ کوئی اور چیز۔ انکے دل میں نہ تو دشمن کے لشکر کی کثرت رعب کا باعث بنتی تھی اور نہ انہیں اپنے قوت بازو اور جسامت بدنی پر کوئی ناز تھا۔

یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن حر جعفی جیسے شہسوار کو جسے اپنے قوت بازو' جسامت بدنی' وسائل جنگی' زرہ وتلوار اور گھوڑے پر ناز تھا' جب حسینؑ نے اپنی ہمرکابی کی دعوت دی تو گھبرا کر بولا: "میرا نفس اتنی جلدی مرنے کیلئے آمادہ نہیں ہے" لیکن روز عاشورا' کربلا کے میدان پر تو ایک نظر ڈالئے جہاں امام حسینؑ کے یاران باوفا' خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے' بوڑھے ہوں یا نابالغ' ہر شخص میدان جنگ میں جانے کیلئے ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں جوانوں کے ہوتے ہوئے عمر رسیدہ شخصیات اس میدان میں حامل لواء

ہونے کا فخر واعزاز حاصل کرتی ہیں۔ اگر میدان کربلا میں جانے والے چھوٹے بڑوں کے جنگی رجز کو ملاحظہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب کا افتخار اور اس جنگ میں نبرد آزمائی کا ہدف یہ ہے کہ وہ امام وقت، اہل بیت رسولؐ اور محمد ﷺ کے دین کے داعی حسینؑ ابن علیؑ کا دفاع کر رہے ہیں۔

صحیح ہے کہ حضرت ابوالفضل العباسؑ قوت بازو، جسامت بدنی اور قد وقامت میں بے نظیر و بے مثال حیثیت کے مالک تھے۔ لیکن خود انکی نظر میں یہ تمام خوبیاں وصفات ناچیز تھیں۔ انکی نظریں تو بس حسینؑ پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ دشمن کہ جس سے آپ کو شدید نفرت تھی، اگر حکم امام ہو جائے تو اس کے بدترین فرد (شمر) سے بھی گفتگو کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک اور موقعہ پر جب امام حسینؑ نے آپ کو لشکر عمر سعد سے کسی استفسار کیلئے بھیجا تو وہاں بھی صرف امامؑ کے سوال پہنچانے کی حد تک اکتفا کی اور اپنی طرف سے کسی قسم کی شجاعت وجوانمردی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب آپ میدان جنگ میں گئے تو فرمایا: ''مجھے موت سے ہرگز کسی قسم کا خوف نہیں ہے کیونکہ وقت کے امام کا دفاع کر رہا ہوں''۔

میدان جنگ میں مرکزی قیادت کا حامل لواء ہونا تنہا مادی طاقت بدنی، قوت بازو اور شجاعت و دلیری کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اسکے لئے ایمان، عقیدہ راسخ اور وفاداری بھی ضروری شرائط ہیں۔ لہٰذا آپ کی زیارات میں امام حسینؑ اور دیگر ائمہ کی زبان سے آپ کی مدح وثنا میں وارد فقرات ملتے ہیں کہ ''آپؑ دین میں بصیرت رکھتے تھے، اپنے بھائی کے وفادار تھے، مشکلات ومصائب کے موقع پر تحمل وبرداشت سے کام لیتے تھے اور انتہائی صابر وحلیم تھے''۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ کو کربلا میں، دین میں معرفت وبصیرت، امام کے ساتھ وفاداری، جذبۂ فداکاری اور شوق جہاد فی سبیل اللہ میں دوسروں پر جو سبقت حاصل تھی، اسی کی بنا پر آپؑ کو یہ منزلت اور مقام حاصل ہوا ہے۔

شجاعت پہلوانی نہیں ہے

مؤلفین ومحققین اپنی تالیفات وتحقیقات میں جب کسی ایک نکتہ کی گہرائی اور تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس دوران بہت سے مسائل کو سطحی اور سرسری نظروں سے گزار دیتے ہیں یا انہیں ایک مسلمہ حقیقت تسلیم کر

کے گزر جاتے ہیں۔ ایسے ہی مسائل میں سے ایک مسئلہ مفہوم شجاعت وجوانمردی ہے۔

عام طور پر شجاعت وجوانمردی سے مراد قوتِ جسامت اور قد وقامت کو لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ شجاعت کو خاندانی ونسبی وراثہ گرداننے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ آباء واجداد سے ورثہ میں ملتی ہے۔ ہم نہ تو قد وقامت کے اثرات کے کلی طور پر منکر ہیں اور نہ انسانی خصوصیات اور صفات کے موروثی ہونے کا انکار کرتے ہیں البتہ ان دونوں اصولوں کو ہمہ گیر طور پر شجاعت ومردانگی کا محور گرداننے کے مخالف ہیں یہ اثرات ہمہ وقت مؤثر نہیں ہوتے لہٰذا نہ ہمیشہ شجاعت کو آباء واجداد کا ورثہ گردانا جا سکتا ہے اور نہ شجاعت وجوانمردی، قوتِ جسمانی اور ظاہری قد وقامت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے نامور شجاع وجوانمرد لوگ حساس اور تقدیر ساز موقعوں پر لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں، خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور موت سے ڈر جاتے ہیں یہاں تک کہ عار وننگ وحسرت اورافسوس ان کا مقدر بن جاتی ہیں۔

چنانچہ شجاع وجوانمرد کہلانے کے لائق وہ انسان ہے جو موت سے بے باک ہو اور شوقِ لقاء اللہ میں جان کی بازی لگانے کیلئے ہمہ وقت تیار رہے۔ وہ انسان جو جان بازی سے بخل کرتا ہو، اس اعزاز وافتخار کے لائق نہیں ہے۔ اس کی ایک واضح مثال عبیداللہ حُر جعفی ہے یہ شخص اپنے دور میں ایک مرد شجاع اور سپہ سالار کی حیثیت سے مشہور تھا۔

امام حسینؑ نے مکہ سے کوفہ تشریف لاتے وقت جب قصر بنی مقاتل پر وقوف کیا تو وہاں ایک خیمہ نظر آیا جس کے دروازے پر ایک بلند نیزہ نصب تھا اور ایک گھوڑا زین سے آراستہ بندھا ہوا تھا۔ علامہ باقر قرشی اپنی کتاب ''امام حسینؑ'' جلد سوم صفحہ ۸۶ پر لکھتے ہیں کہ در خیمہ پر نیزہ نصب کرنا اور زین سے آراستہ گھوڑا باندھ کر رکھنا، اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ یہ خیمہ کسی مرد شجاع کا ہے جو ہمیشہ جنگ کیلئے آمادہ رہتا ہے۔ امامؑ عالی مقام نے کسی سے پوچھا کہ یہ خیمہ کس کا ہے تو جواب ملا کہ حُر جعفی کا ہے۔ حُر جعفی عراق میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ امام حسینؑ نے اسے ایک جانی پہچانی شخصیت ہونے کے ناطے اپنی نصرت کیلئے دعوت دی لیکن اس نے حیلے بہانے بنا کر قاصد امامؑ کو مایوس واپس کر دیا۔ امامؑ خود اتمام حجت کیلئے اس کے خیمے میں تشریف

لے گئے۔ اپنی اور اپنے بھائی کی حقانیت احادیث رسولؐ کی روشنی میں اس تک پہنچائی، اسلام و مسلمین کے لئے لاحق خطرات کا ذکر کیا اور نصرت کی دعوت دی لیکن حُرجعفی نے چند جملوں میں متضاد قسم کی گفتگو کی۔ ایک طرف سے کہا: "مجھے یقین ہے کہ آپ کا ساتھ دینے ہی میں سعادت ہے لیکن اس وقت میں یہ سعادت حاصل کرنا نہیں چاہتا ہوں کیونکہ آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے"۔ دوسری طرف بولے: "میری جان اس وقت موت کیلئے آمادہ نہیں ہے"۔ تاہم جس طرح سے آجکل لوگ مولائی ہونے کا مظاہرہ کرنے کیلئے نذرونیاز پر اکتفا کرتے ہیں حُرجعفی نے بھی امامؑ کی خدمت میں کچھ نذر پیش کر کے جان چھڑانے کی کوشش کی تاکہ جان بھی بچ جائے اور عقیدہ بھی سالم رہے۔ دوسرے الفاظ میں دامے، درمے، سخنے حصہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی تلوار اور گھوڑے کو انتہائی احترام و عقیدت کے ساتھ امامؑ کی خدمت میں پیش کیا کیونکہ اسے مال سے زیادہ جان سے محبت تھی اور موت سے کراہت کرتا تھا۔ امامؑ نے اس کی پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ:

"جب تم نے میری نصرت سے اپنی جان چھڑا اور روگردانی کی تو مجھے تمہارے گھوڑے یا تمہاری کسی اور چیز کی ضرورت اور طمع نہیں ہے۔ میں گمراہ لوگوں سے کسی مدد یا پشت پناہی کا خواہاں نہیں ہوں"۔

سعادت اُخروی اور حیات دنیوی دونوں اس کے سامنے تھیں۔ سعادت و بدبختی کی اس کشمکش میں آخرکار حُرجعفی نے بدبختی کو گلے سے لگایا اور سعادت کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ میں جان کی بازی لگانے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ اس طرح اس نے اپنے شجاعت مند ہونے اور جوانمرد ہونے کی شہرت کو موہوم بنا دیا اور اس سے اُس کی بزدلی کی ایک مثال قائم ہوگئی۔ دوسری مثال اس نے اس وقت قائم کی جب واقعہ کربلا کے بعد وہ عبیداللہ بن زیاد کے دربار میں اسے یہ باور کرانے کیلئے حاضر ہوا کہ وہ اس کے ساتھ تھا اور اس نے اسی کی مرضی کے تحت امام حسینؑ کا ساتھ دینے سے گریز کیا تھا۔ عبیداللہ بن زیاد کیلئے یہ بات پہلے مرحلے میں تو خوش آئند تھی لیکن دوسرے مرحلے میں جب تک عملاً کوئی اس کا ساتھ نہ دے اس وقت تک وہ اس سے راضی نہیں ہوتا تھا لہٰذا وہ عبیداللہ بن زیاد کے نزدیک مورد عتاب قرار پایا۔ ابن زیاد کے چہرہ پر آثار غضب کو دیکھنے کے بعد جونہی ابن زیاد کچھ لمحوں کیلئے اپنی جگہ سے ہٹا حُرجعفی فرصت کو غنیمت سمجھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور

پھر آخر عمر تک امام حسینؑ کے ساتھ جان قربان نہ کرنے کی حسرت میں زندگی گزار دی۔

آپ نے دیکھا، شجاعت ...... قد و قامت، طاقت و قدرت اور تلوار سے منسوب صفت نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ دلیرِ علی مرتضیٰؑ، برادرِ حسینؑ کو بھوکے پیاسے نہر علقمہ کے کنارے دیکھیں گے تو آپ ان کو یہ کہتے ہوئے سنیں گے:

"اے نفس موت سے نہ ڈر۔ حسینؑ کے بعد زندگی ننگ و عار ہے ایسی زندگی کی خواہش مت کر"۔

اسے کہتے ہیں درحقیقت شجاعت ...... اور ایسے ہی شجیع و قہرمان تھے، عباس ابن علیؑ۔

سعادت اور کمال انسانی کی منزل

انسان کی نشوونما ایک گندم کے دانے کی طرح سے ہوتی ہے۔ جس طرح گندم کے دانے کی نشوونما میں زمین کی خاصیت، مناسب پانی، ہوا اور سورج کی روشنی کا عمل دخل ہوتا ہے، اسی طرح انسان کی نشوونما میں بھی بہت سے عوامل مؤثر ثابت ہوتے ہیں مثلاً وراثت، تربیت اور ماحول کا اثر انسان پر پڑتا ہے لیکن سب سے زیادہ مؤثر عامل ارادہ ہے، جو خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے ان عوامل میں سے جو عامل بھی دوسرے عوامل پر حاوی ہوگا، انسان اسی کا مظہر بنے گا۔

اگر کردار صرف ماں کی وراثت کا خاصہ ہوتا تو خاندان بنوکلاب میں اور بھی عباس جیسی شخصیتیں پیدا ہوتیں۔ اگر کردار باپ کی وراثت سے حاصل شدہ صفت ہوتی تو قیام حسینی میں عمر عطرف ابن علی امام حسینؑ کو روکنے کے بجائے آپ کی نصرت میں جاتے۔ اگر کردار میں وراثت کا عمل دخل ہوتا تو امام جعفر صادقؑ کا فرزند عبداللہ افطح امام موسیٰ کاظمؑ کے مقابلے میں مقام و منصب کی خواہش کی کمزوری نہ دکھاتا، امام زمانہؑ کے مقابلے میں جعفر کذاب امامت کا امیدوار بن کر کھڑا نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر بیٹے کی شخصیت کی تعمیر میں ماں باپ دونوں کا کردار ہوتا تو حضرت اُم البنین کے دوسرے فرزندان بھی وہی مقام حاصل کرتے جو جناب حضرت ابوالفضل العباسؑ نے حاصل کیا جبکہ شہادت کا عظیم مرتبہ پانے کے باوجود انہیں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ حضرت عباس ابن علیؑ کی شخصیت میں نشوونما کے دوسرے تمام عوامل مثلاً وراثت، تربیت

ماحول وغیرہ سے زیادہ خود آپ کے اس بلند و غیر متزلزل پہاڑ کی مانند ارادے کا عمل دخل ہے جس نے آپ کی شخصیت کو منزلِ کمال تک پہنچایا۔ اسی ارادہ کی وجہ سے قمرِ بنی ہاشم کو میدانِ کربلا میں سید الشہداء امام حسینؑ کے بعد دوسرے مینارے کی طرح اُبھرنے کا شرف ملا۔

ہمارے معاشرے میں ایک طرف حضرت عباسؑ میں موجود تمام فضائل و کمالات اور خوبیوں کو لوگ آپ کی مادرِ گرامی جناب اُم البنین سے منسوب کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ایک غیر سیدہ عورت کی کسی سید سے شادی ہو جائے تو اس سے پیدا ہونے والی اولاد نجیب الطرفین نہیں ہوتی۔ ان دونوں نظریات میں کس قدر تضاد ہے۔ جب حضرت عباسؑ کے فضائل کا ذکر آتا ہے تو انہیں آپکی مادرِ گرامی کا مرہونِ منت قرار دیا جاتا ہے حالانکہ آپ سیدانی نہیں تھیں۔ دوسری طرف اگر کہیں کسی سید لڑکے کی غیر سیدہ لڑکی سے شادی کا ذکر آ جائے تو کہتے ہیں کہ اگر ماں سیدانی نہ ہو تو اولاد نجیب نہیں ہوتی لہٰذا اگر حضرت عباسؑ کے بارے میں مشہور اس مفروضہ کو صحیح مان لیا جائے تو دوسرے زعم کو نقصان پہنچے گا۔ یہ کیسی دو رنگی ہے کہ ایک طرف لوگ اولادِ فاطمہ کو سب سے افضل گردانتے ہیں اور دوسری طرف حضرت عباسؑ کے تمام فضائل کو ان کی ماں سے منسوب کر دیتے ہیں۔

اگر سچ پوچھیں تو حضرت ابوالفضل العباسؑ کی عظمت و بزرگی کو نہ تو ہماری زبان بیان کر سکتی ہے اور نہ ان کا مقام ہمارے فکر و عقل و عرفان میں سما سکتا ہے۔ اگر کوئی آپ کا مقامِ واقعی جاننا چاہتا ہے تو اسکے لئے اسے کلماتِ معصومینؑ کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ جب ہم حضرت عباسؑ کے بارے میں معصومینؑ کے فرمودات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے کلمات کی روشنی میں آپکا جو مقامِ واقعی سامنے آتا ہے وہ میدانِ جنگ میں شجاعت و دلیری کے حوالے سے نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ آئمہ طاہرینؑ نے آپ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے صرف میدانِ جنگ کی شجاعت کو مرکز و محور قرار نہیں دیا ہے حتّٰی دشمن بھی آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھتا تھا، اسے بھی آپ کے چہرہ میں آیاتِ الٰہی اور رنگِ محمدؐ و علیؑ نظر آتا تھا۔ ان کی نظر میں حضرت امام حسینؑ کے بعد کوئی دین کا مظہرِ جلی تھا تو وہ حضرت عباسؑ کی ذات تھی۔ شمر ذی الجوشن اور عبیداللہ بن

زیاد نے اسی وجہ سے آپ کو امام حسینؑ سے جدا کرنے کی مذموم کوشش کی تھی لیکن جناب عباسؑ کے کلمات نے اس کی اس کوشش کو خاک میں ملا دیا۔

دشمن محض حضرت عباسؑ کی شجاعت کی وجہ سے خوفزدہ نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خود امام حسینؑ حضرت عباسؑ سے کئی گنا زیادہ شجاع تھے لہٰذا شجاعت میں حضرت عباسؑ کو امام حسینؑ پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ہے جب حضرت امام حسینؑ کہ جو حضرت عباسؑ سے شجاع تر تھے، خود کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی تو یہ سمجھنا کہ حضرت عباسؑ بچ جائیں گے، کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ ایک امام حسینؑ ہی کیا، آپکا پورا لشکر بہتر یا زیادہ سے زیادہ سو افراد پر مشتمل تھا، تیس ہزار فوج کے نرغے میں تھا، ایسے میں کسی کے بچ نکلنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دشمن حضرت عباسؑ کے قوتِ بازو سے اتنا خوف زدہ نہیں تھا جتنا آپ کی قوتِ دینی اور چہرۂ حق سے ہیبت زدہ تھا۔ عمر ابن سعد اور شمر ابن ذی الجوشن جیسے افراد یہ جانتے تھے کہ آپ کی یہ قوت کسی بھی وقت انکے تیس ہزار کے لشکر کی کایا پلٹنے کا سبب بن سکتی تھی اور ان کے لشکر کے نظریات میں تبدیلی لا سکتی تھی۔ انہیں ہر آن یہ خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ انہیں چھوڑ کر امام حسینؑ کی طرف چلے جائیں۔ انکا یہ خوف بے بنیاد نہیں تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ حُر اور دیگر چند لوگ اسی لشکرِ عمر سعد سے نکل کر امام حسینؑ کی طرف آئے تھے اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو میدانِ جنگ ہی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ سب کچھ اس چہرۂ حق کا اثر تھا جو امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ جیسی ہستیوں کی شکل میں ان کے سامنے موجود تھا۔

امام سجاد – اور امام جعفر صادق – نے بھی حضرت عباسؑ کی عظمت اسی حوالہ سے بیان کی ہے۔ ہمارے بعض افراد جو آپ کی شجاعت کے پہلو کو ایک جنونی شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ درحقیقت اپنی اس روا روی میں عظمتِ حسینؑ کی پروا کئے بغیر آپکی اہانت سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس طرح یہ لوگ نہ تو حسینؑ کی خدمت کر رہے ہیں اور نہ ہی عباسؑ کی۔

قدر و قیمت نسب میں نہیں حسب میں ہے

جب ہمارے نبیِ مرسلؐ دنیا میں تشریف لائے، اس زمانے میں دنیا کی اکثر ملل و اقوام، بالخصوص عربوں میں

قبائلی فخر و مباہات کا دور دورہ تھا۔ آپؐ نے تمام نسبی امتیازات کو رد کرتے ہوئے صرف خدا اور رسولؐ سے رشتہ کو مقام و منزلت کی سند قرار دیا۔

نصاریٰ اس بات پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے کہ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انکا نسب جناب ابراہیمؑ سے ملتا ہے ۔قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں نہج البلاغہ کے کلمات قصار۹۶میں مولا امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: ''ہمارا رشتہ اس سے ہے جس کا رشتہ اطاعت خداوندی سے ہے، اگرچہ نسبی رشتہ میں وہ ہم سے دور ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا رشتہ اس سے نہیں ہے جس نے خدا کی نافرمانی کی ہو، اگرچہ نسبی رشتہ میں وہ ہم سے قریب ہی کیوں نہ ہو''۔

شرح نہج البلاغہ تالیف ابن ابی الحدید جلد ۱۸ صفحہ ۲۵۲ پر پیغمبر اسلامؐ سے بھی اس سلسلے میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے۔

قہرمان کربلا سے منسوب ایک افسانہ

بعض خطباء ومقررین نے امام حسین - کے اس فرمان سے کہ جس میں آپؑ نے حضرت عباسؑ سے فرمایا کہ ان بچوں کیلئے پانی لاؤ' یہ کہانی بنائی کہ آپ نے جناب عباسؑ کو جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی ۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا کئی لحاظ سے غلط' فرسودہ' غیر عقلی وغیر شرعی ہے:

(۱) کسی بھی مقتل میں کوئی ایسا جملہ نہیں ملتا کہ آپؑ نے حضرت عباسؑ سے فرمایا ہو کہ تلوار نیام سے نہ نکالنا' کسی پر وار نہ کرنا یا کسی کو قتل نہ کرنا۔

(۲) کتاب ''فی رحاب کربلا'' تالیف حسین کورانی ص ۲۶۴ پر لکھا ہے کہ حضرت عباسؑ فرات سے مشکیزے میں پانی بھر کر نکلنے کے بعد لوگوں کو مارتے جاتے تھے اور رجز کا یہ شعر پڑھتے جاتے تھے: ''میں موت سے نہیں ڈرتا اگر موت میری طرف بڑھے ۔ میرا نام عباس ہے مجھے سقا کہتے ہیں''۔ رجز کے دوسرے شعر میں فرماتے ہیں: ''اگر تم میرا بایاں ہاتھ بھی قطع کر دو گے' تب بھی میں اپنے دین کا دفاع کروں گا''۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت عباسؑ کو جنگ کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو کس طرح سے دین کا دفاع کرتے۔

(۳) اسی کتاب کے صفحہ ۲۶۳ پر لکھا ہے کہ میدان کربلا میں جنگ چھڑنے کے بعد عمرو ابن خالد اور ان کے غلام مجمع بن عبداللہ اور جنادہ بن حارث' جب لڑتے لڑتے عمر سعد کے لشکر کے گھیرے میں آ گئے تو حضرت عباسؑ میدان میں کود پڑے اور ان کو دشمن کے گھیرے سے نکال لائے ۔

(۴) اسی کتاب کے صفحہ ۲۴۵ کے آخر میں امام جعفر صادق - سے حضرت عباسؑ کی شان میں یہ جملہ منقول ہے: ''میرے چچا عباسؑ صاحب بصیرت اور قوی الایمان تھے' آپ نے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ مل کر اس طرح سے جہاد کیا کہ سخت آزمائشوں میں مبتلا ہوئے اور ان سے گزرے۔

(۵) کتاب ''لون مطف'' تالیف حاجی نجفی صفحہ ۱۹۴ پر لکھا ہے کہ جب امامؑ پر پیاس غالب آ گئی تو آپؑ نے نہر فرات کی طرف حملہ کیا۔ آپؑ کے آگے آگے قمر بنی ہاشم حضرت عباسؑ ہوتے تھے بالآخر لشکر عمر ابن سعد نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور آپؑ خیمہ واپس آ گئے جبکہ حضرت عباسؑ تنہا دشمن سے لڑتے رہے۔ جب آپؑ بے انتہا زخمی ہو گئے تو زید بن ورقہ حنفی حکیم بن سنبسی نے آپؑ کو شہید کر دیا۔

اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۶ میں ابوحنیفہ دینوری کی کتاب ''اخبار قوال صفحہ ۲۵ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے آگے آگے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے ۔ صفحہ ۱۹۷ پر بیان ہے کہ حضرت عباسؑ دشمنوں کو قتل کرتے کرتے نہر فرات کے قریب پہنچ گئے ۔ نہر کی نگرانی کرنے والے سپاہی آپؑ کو دیکھ کر نہر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ آپؑ نے مشک کو پانی سے بھر کر خیمہ کا رُخ کیا۔ سروری لکھتے ہیں: ''حضرت عباسؑ کو قمر بنی ہاشم بھی کہتے ہیں ۔ آپؑ صاحب لواء ہیں' کربلا میں امامؑ کے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے دشمن نے آپؑ پر حملہ کیا اور آپؑ نے دشمن پر حملہ کیا''۔

کتاب ''نفس المہموم'' میں شیخ عباس قمی لکھتے ہیں کہ جب عباسؑ پانی لینے نہر فرات پر گئے تو چار ہزار کے لشکر نے آپؑ کو گھیر لیا لیکن آپؑ نے انکو فرات سے دور ہٹا دیا ۔ ان سے جنگ لڑی یہاں تک کہ آپؑ نے انکے اسی (۸۰) سواروں کو قتل کیا۔

یہ کہنا کہ امام حسین - نے قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباسؑ کو معرکۂ حق وباطل میں جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی' فکر اور عقل ونقل دونوں سے متصادم ہے یہ فکر مسیحیت ہے کہ اگر ظالم تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم اسے اپنا دوسرا گال پیش کر دو۔ انہی کے یہاں سے یہ فکر مسلمانوں میں داخل ہوئی ہے۔

یہ قصے دراصل ان جعلی روایات پر مبنی ہیں جو بنوامیہ نے اپنی حکومت کے تحفظ کی خاطر روایت ساز صحابیوں (مثلاً ابو ہریرہ وغیرہ) سے نقل کئے ہیں کہ وقت کے ظالمین کے ظلم کو برداشت کرنا چاہیے۔

امام حسین - نے عصر عاشورا کے ان آخری لمحات میں کہ جب تمام اصحاب وانصار واعوان شہید ہو چکے تھے' فریاد بلند کی' ''ھل من ناصر ینصرنا'' یعنی ہے کوئی جو ہماری مدد کرنے والا ۔ امام حسین - تو لشکر باطل کے

سپاہیوں کو بھی اپنی مدد کیلئے آنے کی دعوت دے رہے ہیں؛ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنے ناصر و مددگار کو جنگ سے روک دیں؟۔

معرکۂ کربلا میں ابوشعثا کندی نامی ایک شخص جسے یزید بن زیاد بھی کہتے ہیں؛ شریک تھا۔ زیارت ناحیہ میں اسے یزید بن مہاجر کندی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کوفہ سے عمر سعد کی فوج میں شامل ہو کر کربلا آیا تھا لیکن جب شمر کے کہنے پر عمر سعد نے جنگ کے خاتمہ کی تجویز کو مسترد کر دیا تو یہ عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امام حسینؑ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ یہ بڑا ماہر تیر انداز تھا لشکر عمر سعد سے آتے ہوئے اپنا تیر کمان بھی ساتھ لیکر آیا تھا یہ اپنا زانو زمین پر رکھ کر دشمن کی طرف تیر پھینکا کرتا تھا اور اس کی کمان سے نکلے ہوئے ہر تیر پر حضرت فرماتے تھے: ''خداوندا! اس کے تیر کو ہدف تک پہنچا دے اور اس کے عوض اسے جنت عطا فرما''۔ ایک وقت ایسا آیا کہ جب اس کے تمام تیر ختم ہو گئے تو اس نے تلوار اٹھائی اور دو بدو دشمن سے جنگ لڑنا شروع کر دی پانچ دشمنان دین قتل کئے اور پھر دشمن کے مقابلہ میں آ کر رجز پڑھی۔ امام حسین۔ کا ابوشعثا کے ہر تیر کے ہدف پر لگنے کی دعا فرمانا؛ اس بات کی دلیل ہے کہ آپؑ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں دشمن مارے جائیں اور انہیں شکست ہو۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ امامؑ قمر بنی ہاشم کو جنگ کرنے سے منع فرمائیں؟

امام حسین۔ نے آخری لمحات تک اپنے دشمنوں کی نابودی کے لئے دعا کی۔ اگر امامؑ دشمن کی بقا چاہتے تو کبھی بھی انکے حق میں نفرین و بددعا نہ فرماتے۔

found.

آل الحسن۔

حضرت امام حسین۔ کاروان شہدائے کربلا کے سیدالشہداء ہیں آپؑ کے رکاب میں جن انصار و یاران اور خاندان بنوہاشم کے جانبازوں نے اپنی جانیں نچھاور کی ہیں؛ انکی صفوں میں ایک مکمل صف آل حسنؑ کی بھی ہے کربلا میں امام حسنؑ کے پختہ عمر اور جوان فرزندوں کے علاوہ آپؑ کے نابالغ اور نوخیز بیٹے بھی امام حسینؑ کے رکاب میں شہید ہوئے ہیں۔

دشمنان اہل بیتؑ نے امام حسن۔ کے درخشان و منور اور طاہر و مطہر چہرے کو غبار آلود کرنے کی غرض سے آپ کی بہت سی بیویوں اور اولاد کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے آپؑ کی ازواج کی تعداد سو سے زائد بتائی ہے لیکن جب ہم نے کتب تاریخ کو کھنگالا تو کل تیرہ (۱۳) ازواج کا تذکرہ ملا۔ ان میں سے کچھ کے نام تو تاریخ میں ذکر ہوئے ہیں جبکہ بعض کے نام بھی نہیں معلوم اور صرف ان کے قبیلوں کے نام ملتے ہیں۔

اسی طرح تعداد اولاد میں بھی مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ بعض نے سولہ اولاد یعنی گیارہ لڑکے اور پانچ لڑکیاں؛ بعض نے انیس یعنی تیرہ (۱۳) لڑکے اور چھ لڑکیاں؛ بعض نے بیس یعنی سولہ لڑکے اور ۴ لڑکیاں اور بعض نے ۲۲ یعنی چودہ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں لکھی ہیں جبکہ آپ کی نسل جناب حسن مثنیٰ اور زید ابن حسنؑ سے پھیلی ہیں۔

ازواج حضرت امام حسن مجتبیٰ –

کتب تاریخ و سیر میں امام حسن مجتبیٰ ۔ کی جن ازواج کا تذکرہ ملتا ہے پہلے ہم ان سب کا ذکر کریں گے؛ اور پھر تاریخی قواعد و ضوابط اور نقد و جرح کے تحت صحیح اور غلط کی نشاندہی کرینگے۔

کتاب ''حیات امام حسنؑ'' تالیف باقر شریف قرشی صفحہ ۴۵۵ پر آپؑ کی درج ذیل ازواج کا ذکر آیا ہے:

۱۔ خولہ بنت منظور فزاریہ

۲۔ جعدہ بنت اشعث

۳۔ عائشہ خشعمیہ

۴۔ ام کلثوم بنت الفضل بن عباس:

(ان کے بارے میں لکھاہے کہ آپؑ نے ان کو طلاق دے دی تھی جس کے بعد وہ ابوموسیٰ اشعری کے عقد میں چلی گئی تھیں)

۵۔ ام الحق بنت طلحہ بن عبداللہ

۶۔ ام بشیر بنت مسعود انصاری

۷۔ ام عبداللہ بنت شلیل بن عبداللہ

۸۔ رملہ یا نفیلہ، مادر حضرت قاسمؑ

۹۔ ہند بنت عبدالرحمن بن ابی بکر

۱۰۔ عمرو ابن اہیم منقری کے خاندان سے ایک عورت آپؑ کے عقد میں تھیں۔

۱۱۔ خاندان بنوثقیف سے ایک عورت عقد میں آئی تھی۔ کہتے ہیں ان سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا تھا۔

۱۲۔ بنوضرارہ سے ایک عورت آپؑ کے عقد میں آئی۔

۱۳۔ بنوشیبان آل ہمام بن مرہ سے ایک عورت عقد میں آئی۔

خولہ فزاریہ:

خولہ بنت منظور فزاریہ جیسا کہ باقر قرشی نے "حیاۃ امام حسنؑ" جلد ۲ صفحہ ۴۵۵ پر لکھا ہے کہ فراست اور عقل میں اپنے زمانہ کی ایک بہترین خاتون تھیں آپ نے اس وقت تک تزئین وآرائش سے گریز کیا جب تک کہ خدا نے آپ کو فرزند نہیں عطا فرمایا۔ آپ کے اس فرزند کا اسم گرامی حسن مثنیٰ ہے۔ بڑے ہونے کے بعد جناب حسن مثنیٰ ایک مرد شجاع ثابت ہوئے۔ آپ امیرالمومنین حضرت علیؑ کے صدقات کے متولی تھے۔

جعدہ:

امام حسن مجتبیٰؑ کی زوجات میں سے ایک کا نام جعدہ بنت اشعث بن قیس الکندی ہے۔ صاحب قاموس رجال محمد تقی تستری نے اپنی کتاب میں جعدہ کی والد کو اصحاب رسول اللہؐ میں شمار کیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد یہ شخص مرتد ہوگیا تھا اور اسے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں اسیر کر کے لایا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بہن ام فروہ اس کے عقد میں تھیں۔ اس سے انکے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جسکا نام "محمد" رکھا گیا تھا۔ کتاب "خلفاء" میں ابن قتیبہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "کاش میں اشعث بن قیس کو اسی وقت قتل کر دیتا جب اسے اسیر کر کے لایا گیا تھا"۔ یہ ایک غدار شخص تھا جس نے سنہ ۱۲ ہجری میں جنگ ردہ کے موقع پر اپنے ہی قبیلہ کے تمام لوگوں کو اپنی جان کے عوض، خالد بن ولید کے ہاتھوں قتل کرنے کا موقعہ دیا۔ جنگ صفین کے موقع پر یہ شخص لشکر علیؑ میں شامل تھا لیکن فکر خوارج کا خالق بھی یہی تھا۔ خود پیچھے رہ کر سادہ لوح عوام کو علیؑ کے خلاف اکسایا کرتا تا کہ معاویہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکے۔ جب معاویہ نے قرآن نیزے پر بلند کیا تو اس نے لوگوں سے کہا: "اس قوم نے ہمیں قرآن کی طرف دعوت دے کر انصاف کیا ہے"۔ خوارج کو علیؑ کے خلاف اکسانے والا یہی شخص تھا۔ صاحب شرح نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۹ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ علیؑ کے لشکر میں اشعث اسی منافق کی مانند تھا جس طرح پیغمبرؐ کے لشکر میں عبداللہ سلول تھا۔ حضرت علیؑ شہید تو ملجم مرادی کے ہاتھوں ہوئے لیکن اس گروہ میں بھی اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی کی بیٹی جعدہ امام حسنؑ کے عقد میں تھی۔ معاویہ کے کہنے پر مال و دولت اور یزید سے شادی کی خواہش میں جعدہ نے سبط اکبر رسولؐ کو زہر دیکر شہید کیا۔

اشعث کے دو بیٹے تھے محمد اور قیس۔ محمد ابن اشعث نے امام حسینؑ کے نمائندے حضرت مسلم بن عقیل کو پناہ دینے کے بہانے عبیداللہ ابن زیاد کے حوالے کر کے شہید کروادیا۔ اشعث کے یہ دونوں بیٹے میدان کربلا میں امام حسینؑ کے مدمقابل عمر سعد کے لشکر میں شامل تھے۔ جب قیس نے امام حسینؑ کو یزید کے ساتھ صلح کرنے کی پیشکش کی تو امامؑ نے فرمایا: "کیا بنی ہاشم کا حق نہیں کہ تم سے خون مسلم طلب کریں؟" یہ قیس ہی ہے جس نے امام حسینؑ کی ردا کو لوٹا تھا جبکہ محمد ابن اشعث عبداللہ ازدی کو شہید کرنے میں ملوث تھا۔ امام حسینؑ کو شہید کرنے کی

خوشی میں کوفہ میں چار مساجد بنائی گئی تھیں ان میں سے ایک مسجد کا نام قیس ابن اشعث کے نام پر رکھا گیا ہے۔

اُم بشیر:

اُم بشیر بنت ابی مسعود عقبہ خزرجی کے بارے میں صاحب کتاب "منتہی الآمال" جلد ا صفحہ ۴۵ پر لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس زوجہ سے دو بیٹیاں اُم الحسن اور اُم الحسین عطا فرمائیں۔ جناب زید بن حسن بھی انہیں کے فرزند ہیں۔ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں کہ جناب زید بن حسن رسول اللہؐ کے موقوفات کے متولی تھے آپ حسن مثنیٰ سے بڑے تھے اور آپ نے تقریباً ۹۰ سال عمر پائی۔ دنیا میں حضرت امام حسن -کی نسل انہی سے پھیلی ہے جیسا کہ صاحب کتاب "عمدۃ الطالب" نے ذکر کیا ہے۔

اُم ولد:

عمر بن حسن، قاسم اور عبداللہ امام حسنؑ کے فرزند تھے۔ ان تینوں کی ماں کو "اُم ولد" قرار دیا گیا ہے یہ تینوں فرزندانِ امام حسنؑ کربلا میں شہید ہوئے ہیں۔ امام حسنؑ کے ایک اور فرزند عبدالرحمٰن کی ماں کو بھی ام ولد بتایا گیا ہے۔

اُم اسحاق:

حسین اثرم، طلحہ اور فاطمہ بنت حسنؑ کی ماں اُم اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمی ہیں۔

عائشہ خشعمیّہ:

امام حسن -کی زوجات میں سے ایک عائشہ خشعمیہ ہیں جنہیں آپؑ حضرت علیؑ کی حیات میں اپنے عقد میں لائے تھے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؑ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو انہوں نے آپؑ کی خدمت میں تہنیت پیش کی۔ امام حسنؑ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ انکے والد گرامی کی شہادت کے موقعہ پر انہیں امامت (خلافت) پر فائز ہونے کی مبارکباد دی جائے اس جسارت پر آپؑ نے اس زوجہ کو طلاق دے دی۔

معرکۂ کربلا میں اولاد امام حسن -

میدان کربلا میں امام حسنؑ کے درج ذیل پانچ بیٹے امام حسینؑ کے ہمرکاب تھے۔ ان پانچوں نے جہاد میں

حصہ لیا اور ان میں سے چار میدان کربلا میں شہید ہوئے:

(۱) عمر بن حسنؑ (۲) ابوبکر بن حسنؑ (۳) قاسم بن حسنؑ (۴) عبداللہ بن حسنؑ (۵) حسن بن حسنؑ المعروف حسن مثنیٰ۔

۱۔ حسن ابن حسنؑ (معروف بہ حسن مثنیٰ)

آپ امام حسین -کی دختر جناب فاطمہ صغریٰ کے شوہر ہیں۔ آپ کی والدہ خولہ بنت منظور فزاری تھیں۔ آپ میدان کربلا میں زخمی ہو گئے تھے۔ لشکر عمر ابن سعد میں آپ کے کچھ مادری رشتہ دار موجود تھے جن کی سفارش پر آپ کو کوفہ لایا گیا جہاں آپ کا علاج و معالجہ ہوا۔ صحت یاب ہونے کے بعد آپ مدینہ واپس تشریف لائے۔ سادات حسنی آپ ہی کی نسل سے دنیا میں پھیلے ہیں۔

"قاموس رجال" جلد ۳ صفحہ ۲۱۱ رجال نمبر ۱۸۶۴ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حسن ایک جلیل القدر، متقی و پرہیزگار شخصیت اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ آپ امیر المومنینؑ کی طرف سے صدقات کے متولی تھے۔ امام حسینؑ کے ساتھ کربلا میں بھی شریک تھے امام عالی مقام کی شہادت اور اہل بیت اطہارؑ کے اسیر ہونے کے بعد اسماء بن خارجہ نے آپ کو اسیروں کے درمیان سے نکالا۔

شیخ مفیدؒ کتاب "الارشاد" میں صفحہ ۱۹۶ پر لکھتے ہیں کہ حجاج بن یوسف جب عبدالملک بن مروان کی طرف سے والی مدینہ تھا اس زمانہ میں آپ موجود تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ حسن بن حسنؑ نے اپنے چچا امام حسینؑ کی دو بیٹیوں میں سے ایک کیلئے خواستگاری کی تو امام حسینؑ نے انہیں انتخاب کرنے کا اختیار دے دیا۔ جب آپ نے شرم کے مارے کچھ نہیں کہا تو خود امام حسینؑ نے اپنی بیٹی فاطمہ کو ان کے عقد میں دے دیا۔ حسن مثنیٰ کی وفات کے بعد فاطمہ بنت حسینؑ راتوں کو عبادت اور دن کو روزہ کی حالت میں گزارتی تھیں۔ وہ حسن و جمال میں حورالعین کی مانند تھیں۔ ایک سال تک حسن کی قبر پر خیمہ لگا کر بیٹھیں۔ سال گزرنے کے بعد اپنے غلام سے کہا کہ جب رات ہو جائے تو یہ خیمہ یہاں سے اٹھا دینا۔

حسن نے پینتیس (۳۵) سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ نے اپنے مادر زاد بھائی ابراہیم بن محمد بن طلحہ کو اپنا ولی

بنایا۔ صاحب کتاب لکھتے ہیں اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے اٹھائیس (۲۸) سال بعد آپ نے وفات پائی۔

کتاب ''تہذیب المقال فی تشیع'' اور کتاب ''الرجال'' جلد۲ صفحہ۳۰۴ پر نجاشی شیخ مفید علیہ الرحمۃ سے نقل کرتے ہیں کہ حسن بن حسنؑ نے اپنے چچا حسینؑ سے ان کی بیٹیوں میں سے ایک کی خواستگاری کی تو امامؑ نے فرمایا: ''جسکو چاہو انتخاب کرلو ہمیں قبول ہے''۔ حسن مثنیٰ نے شرمندگی کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا تو امامؑ نے اپنی بیٹی فاطمہ کو ان کیلئے یہ کہہ کر انتخاب کیا کہ وہ اماں فاطمۃ الزہرا = سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور جناب سکینہ سے بڑی ہیں۔

''انساب اشراف'' جلد۱ صفحہ۲۲۶ ''تاریخ ابن عساکر'' جلد۱ صفحہ۲۶ اور ''تہذیب التہذیب'' جلد۲، صفحہ۲۶۳ میں بھی ذکر ہوا ہے کہ آپ عبدالملک بن مروان کے دور میں صدقات امیر المومنینؑ کے متولی تھے۔

کتاب ''تہذیب المقال'' جلد۲ صفحہ۳۰۹ پر ''کشف الغمہ'' جلد۲ صفحہ۲۹۹ سے نقل ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت کا تذکرہ تو کہیں نہیں ملتا' البتہ تاریخ وفات اور مدت عمر کا ذکر ہے۔ آپ نے ۳۵ سال کی عمر میں اپنے بھائی زید کی حیات میں وفات پائی۔ آپ نے اپنے مادرزاد بھائی کو اپنا ولی بنایا۔ ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' کی جلد۱ صفحہ۱۰ پر ''عمدۃ المطالب'' سے نقل کیا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے آپ کو زہر دیا تھا صاحب ''تہذیب المقال'' لکھتے ہیں کہ امام حسنؑ کی شہادت کے وقت یعنی سنہ ۵۰ میں' اگرچہ آپ چھوٹے تھے لیکن آپ کو آپ کے والد یاد تھے۔ آپ کی تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔

آپ کی وفات سنہ ۷۸ھ میں ہوئی اور جابر بن عبداللہ انصاری نے آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

کتاب ''تہذیب التہذیب'' جلد۳ صفحہ۲۶۳ پر لکھا ہے کہ آپ کی وفات سنہ ۹۷ھ میں ہوئی۔ اگر یہ قول صحیح ہے تو آپ نے سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں وفات پائی۔

کتاب ''مقتل الحسینؑ'' صفحہ۳۵۵ پر لکھا ہے کہ آپ نے ولید بن عبدالملک کے دور میں وفات پائی قاسم کی عمر واقعہ کربلا کے وقت ۱۴ سال بتائی جاتی ہے لہٰذا اس قول کے مطابق جناب حسن قاسم سے عمر میں ۴ سال بڑے تھے۔

شہدائے آل الحسن

ارباب سیر و تاریخ شہدائے کربلا میں امام حسن - کے چار فرزندوں کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ عمر بن حسنؑ:

آپ بالغ و رشید جوان تھے میدان جنگ میں جا کر آپ نے رجز پڑھا اور نہایت ہی شجاعت مندی سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

۲۔ ابوبکر بن حسنؑ:

حضرت قاسم اور حضرت ابوبکر دونوں رملہ خاتون سے تھے۔ آپ کو عقبہ غنوی نامی ملعون نے شہید کیا۔

کتاب ''انصار الحسین'' صفحہ۱۱۳' کتاب ''ابصار الحسین فی انصار الحسین'' صفحہ۶۳ پر اور ابوالفرج اصفہانی کی کتاب ''مقاتل الطالبین'' میں ان کا ذکر ہے۔ آپ کی والدہ اُم ولد تھیں آپ میدان کربلا میں اپنے چچا امام حسینؑ کی رکاب میں شہید ہوئے تھے۔ آپ کی شہادت سے متعلق روایت ہے کہ آپ قاسم بن حسنؑ کے بعد شہید ہوئے۔

زیارت ناحیہ میں آپ کے بارے میں یہ جملہ موجود ہے:

السلام علی ابی بکر بن الحسن بن علی الزکی المرمی بالسهم الرادی لعن اللّٰہ قاتله عبداللّٰہ بن عقبة الغنوی۔

۳۔ عبداللہ بن حسنؑ:

آپ سنہ ۶۱ ہجری میں نابالغ تھے شاید اس وقت آپ کی عمر گیارہ سال رہی ہوگی۔

ابوالفرج اصفہانی اپنی کتاب ''مقاتل الطالبین'' کے صفحہ۵۸ پر لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن حسن کی ماں شلیل بن عبداللہ کی بیٹی تھیں جبکہ بعض کے خیال میں آپ کی والدہ ام ولد تھیں۔

کتاب ''نفس المهموم'' میں بحار الانوار سے نقل ہے کہ حضرت قاسم بن الحسنؑ کی شہادت کے بعد عبداللہ بن الحسن میدان میں گئے اور انہوں نے یہ رجز پڑھا:

ان تنكروني فاناابن حيدره   ضرغام آجام وليث قسورة

على الاعادى مثل ريح صرصرة

''اگر تم مجھے نہیں جانتے ہو تو جان لو میں فرزندِ حیدر ہوں۔ دشمن کیلئے میں شیر کی طرح غضبناک اور تیز آندھی کی طرح تند ہوں''۔

عبداللہ بن الحسن ایک طفل نوخیز تھے۔ جب امام حسینؑ زخموں سے چور چور ہوکر زمین پر تشریف لائے تو یہ طفل نوخیز اس منظر کو برداشت نہ کرسکا۔ خیمے سے نکل کر میدان کی طرف دوڑا۔ جناب زینبؑ نے روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکیں۔ امام حسینؑ نے بھی جناب زینبؑ سے فرمایا: بہن! اسے روک لو لیکن جناب عبداللہ نے بہت شدت سے انکار کیا۔ آپ تیزی سے دوڑتے ہوئے مقتل میں پہنچے اور امام حسینؑ کے نزدیک جا کر بیٹھ گئے فرمانے لگے:

''خدا کی قسم میں اپنے چچا سے جدا نہیں ہوں گا''۔

جب ابجر بن کعب ملعون تلوار لے کر امام حسینؑ کی طرف بڑھا تو اس بچے نے کہا: ''**ويلك يابن الخبيثه اتقتل عمي**''۔

افسوس ہو تجھ پر اے خبیثہ کی اولاد! کیا تو میرے چچا کو شہید کرے گا؟

وہ ملعون تلوار لے کر امامؑ کی طرف بڑھا۔ بچے نے اپنے ہاتھوں سے اسکا وار روکنے کی کوشش کی تو دونوں ہاتھ کٹ کر لٹکنے لگے۔ بچہ یا ابتاہ! کہہ کے ندا دینے لگا۔ امامؑ نے بچے کو گود میں لے لیا اور فرمایا:

''اے میرے بھائی کے بیٹے! جو مصیبت آپ پر نازل ہوئی ہے اس پر صبر کریں' اسے اپنے لئے بہتر سمجھیں کیونکہ خداوند عالم آپ کو اپنے صالح آباءواجداد سے ملحق فرمائے گا''۔

اس کے بعد امام حسینؑ نے اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور یہ دعا فرمائی:

''**اللهم ان متعتهم الى حين ففرقهم فرقاً واجعلهم طرائق قدداً ولا ترضي الولاة عنهم ابداًفانهم دعونا لينصرونا ثم عدوا علينا فقتلونا**''۔

حرملہ بن کاہل اسدی نے ایک تیر پھینکا جس سے آپ چچا کے گود میں شہید ہوگئے۔

زیارت ناحیہ میں آپ کے بارے میں یہ جملہ ملتا ہے: **السلام على عبدالله بن الحسن بن على الزكى لعن الله قاتله وراميه حرمله بن كاهل الاسدى.**

۴۔ حضرت قاسم بن الحسنؑ:

آپ جوان ورشید اور عاقل تھے' تاہم ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچے تھے یعنی عمر کے لحاظ سے نابالغ تھے ابوالفرج اصفہانی اپنی کتاب ''مقاتل الطالبین'' میں صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں کہ قاسم بن حسنؑ ابوبکر بن حسن کے بھائی ہیں۔

ابن اثیر جوزی اور صاحب کتاب ''در النظیم'' کے نزدیک قاسم بن الحسن کی ماں ام ولد تھیں لیکن صاحب ''حدائق الوردیہ'' اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ کا نام ''رملہ'' تھا۔

امام حسنؑ کے تمام بیٹوں میں آپ پر امام حسینؑ کی خاص توجہ رہتی تھی۔ جب قاسم میدان جنگ میں جانے کیلئے اپنے عم بزرگوار کی خدمت میں اجازت کیلئے حاضر ہوئے تو امام حسینؑ نے دیگر اصحاب ونوجوانان بنو ہاشم کے شہسواروں اور مبارزوں سے ہٹ کر ان کی جدائی پر زیادہ افسوس وحسرت کا اظہار فرمایا۔ قاسم کو میدان میں جانے کی اجازت دینے سے آپؑ نے گریز کیا بلکہ کتب مقاتل میں یہاں تک لکھا ہے کہ آخر میں اس شہزادہ سے بغلگیر ہوکر آپؑ نے اتنی فریاد کی کہ فرش زمین پر گر پڑے۔ حضرت قاسم بن الحسنؑ نے میدان میں جا کر یہ رجز پڑھا:

ان تنكروني فانا ابن الحسن   سبط النبي المصطفى والمؤتمن

هذاحسين كالاسير المرتهن'   بين اناس لاسقوا صوب المزن

''اگر مجھے نہیں پہچانتے ہو تو جان لو کہ میں فرزند حسن ہوں وہ حسن کہ جو سبط ومؤتمن پیغمبر مصطفی ہیں۔ یہ حسینؑ ہیں جنہیں تم نے اسیروں کی مانند گروی کر رکھا ہے وہ ایسے لوگوں کے درمیان گروی ہیں جو رحمت الٰہی سے محروم ہیں''۔

ابن شہر آشوب نقل کرتے ہیں کہ حضرت قاسم میدان میں گئے اور یہ رجز پڑھا:

انی انا القاسم من نسل علی   نحن وبیت اللہ اولی بالنبی

''میں قاسم نسل علیؑ بن ابی طالب سے ہوں ۔ہم اور کعبہ پیغمبر اسلامؐ سے نزدیک تر ہیں''۔

میدان کربلا میں مبارزہ کیلئے جانے والوں میں حضرت قاسم کی شہادت چند حوالوں سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل اور اشک آور ہے:

۱۔ آپ ابھی نابالغ تھے۔

۲۔ امام حسینؑ کی آپ پر بہت زیادہ عنایت وتوجہ رہی تھی ۔اس خصوصی صورت حال سے سوئے استفادہ کرتے ہوئے جعل سازوں اور افسانہ پردازوں نے آپ سے منسوب متعدد قصے اور افسانے جعل کئے ہیں۔

ذیل میں ہم ان جعلی اور خودساختہ مصائب کا مختصراً ذکر کرینگے جنہیں امام حسنؑ کی اس یادگار اور عزیز امام حسینؑ سے منسوب کرنے کی جسارت کی گئی ہے:

۱۔ بعض ذاکرین حضرت قاسم کی ماں کو شہربانو کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور ان کے نام سے مصائب میں جعلی واقعات بیان کرتے ہیں جبکہ شہربانو نامی خاتون کا قاسم بن حسن کی ماں ہونا کئی لحاظ سے بے بنیاد ہے:

(۱۔۱) تمام کتب تاریخ اور مقاتل معتبرہ میں آپ کی والدہ گرامی کا نام ''رملہ نفیلہ یا ام ولد'' لکھا ہے۔

(۱۔۲) امام حسن مجتبیٰ - سے منسوب ازواج کی تعداد معتبر او رغیر معتبر دونوں روایات ملا کے چند رہ بنتی ہے لیکن ان میں سے کسی کا نام ''شہربانو'' نہیں ہے۔

(۱۔۳) کہتے ہیں کہ ملک ایران خلیفہ دوم کے دور میں فتح ہوا جسکے نتیجے میں یزدجرد (بادشاہ ایران) کی دو بیٹیاں اسیر ہو کر مدینہ پہنچیں ۔حضرت علی - کی تجویز پر انہیں شوہر کے انتخاب کا حق دیا گیا ۔اس حق کو استعمال کرتے ہوئے ایک لڑکی نے امام حسنؑ کو منتخب کیا اور دوسری نے امام حسینؑ کو۔

کہتے ہیں کہ جس نے امام حسنؑ کا انتخاب کیا تھا ان کا نام شہربانو تھا اور ان سے قاسم بن حسنؑ پیدا ہوئے ۔ دوسری بیٹی کا نام شاہ زنان تھا جنہوں نے امام حسینؑ کو منتخب کیا اور ان سے امام سجادؑ پیدا ہوئے ۔

جید محققین اور سیرت نگاروں نے اس نقل کو مسترد کیا ہے اور اس واقعہ کو دورخلافت عثمان یا دورخلافت علیؑ سے

منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب یزدجرد کی بیٹیاں اسیر ہو کر آئیں تو ایک بیٹی محمد ابن ابی بکر کے عقد میں آئی جبکہ دوسری بیٹی امام حسینؑ کے عقد میں آئی ۔ان میں سے کوئی بھی بیٹی امام حسنؑ کے عقد میں نہیں آئی تھی ۔

(۱۔۴) شہربانو اور شاہ زنان دو الگ الگ خواتین کے نام نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں نام ایک ہی خاتون کے ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جب یہ شہزادیاں مولا امیرالمومنینؑ کے حضور پہنچیں تو آپؑ نے ان کا نام پوچھا جس پر ایک نے کہا شاہ زنان ہے ۔شاہ زنان فارسی ترکیب ہے ۔عربی میں اس کا مطلب ہے ''سیدۃ نساء العالمین' چونکہ یہ لقب حضرت فاطمۃ الزہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کیلئے مختص ہے لہٰذا حضرت علیؑ نے فرمایا آج سے تمہارا نام شہربانو (یعنی شہر کی ملکہ) ہے ۔

پس حضرت قاسم کی شہادت سے متعلق جناب شہربانو سے منسوب جو مصائب بیان ہوتے ہیں وہ چاہے مرثیے کی صورت میں ہوں یا نوحوں اور نثر کی صورت میں ان کی کوئی سند نہیں ہے ۔انکی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہیں ۔عزاداروں کو ایسے افسانوں کو اہل بیت اطہارؑ کے خاندان پاک سے منسوب کرنے سے گریز کرنا چاہئے چہ جائیکہ ایسے جعلی اور من گھڑت قصوں پر آنسو بہائے جائیں اور سینہ زنی کی جائے ۔

۲۔ دوسرا حضرت قاسم بن حسنؑ کی دامادی کا قصہ ہے اس قصہ کو کتاب ''ریاض القدس'' میں ''العہدۃ علی الراوی'' کے عنوان سے کتاب ''مفتاح البکاء'' سے نقل کیا گیا ہے۔

اس تمام قضیہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس قصے کو نقل کرنے کے بعد صاحب ریاض القدس خود اس کی بے اعتباری کا احساس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علماء نے اس نقل کو مسترد کیا ہے کیونکہ کسی معتبر کتاب میں اس کی سند نہیں ملتی ۔

اس قضیہ کو عربی مقاتل میں صرف ''منتخب المراثی'' میں شیخ فخر الدین طریحی نے نقل کیا ہے جبکہ فارسی مقاتل میں فقط ''روضۃ الشہداء'' میں ملا کاشفی نے اسے نقل کیا ہے ۔

اگر چہ کہ بہت سی کتابوں میں اور کئی خطباء و مقررین نے قصہ دامادی قاسم بن حسنؑ کو نقل و عقل سے متصادم دیکھ کر مسترد کیا ہے اور متعدد علماء نے بھی اسکی حقانیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی

انکار ممکن نہیں کہ سطحی طور پر یہ قصہ انتہائی تاثیر اور اشک آور ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کی سند کو تقویت پہنچانے کیلئے مندرجہ ذیل توجیہات جعل کی گئی ہیں:

۱۔ قصہ حضرت داؤد اور اس نابالغ بچے کے عقد نکاح کا واقعہ جسے آپؑ نے پالا تھا۔ اسکی تفصیل آئندہ صفحات میں آئیگی۔

۲۔ خداوند متعال نے امام حسینؑ کو اس دشت بلا میں ہر اس مصیبت میں مبتلا کیا جو دنیا میں بندگان خدا پر پڑ سکتی ہے۔ چونکہ نوعمر داماد کی شہادت اور نوبیاہتا بیٹی کا بیوہ ہو جانا' بذات خود ایک مصیبت ہے لہٰذا امام حسینؑ نے اپنے آپ کو اس امتحان میں مبتلا کرنے کیلئے بزم عروسی کا اہتمام کیا۔

۳۔ امام حسن مجتبیٰ -کی وصیت جو آپؑ نے امام حسینؑ سے اپنے اس بیٹے کی عروسی کے بارے میں کی تھی۔

وہ خطباء و مقررین اور ذاکرین جن کے نزدیک عزاداری کا ہدف فقط یہ ہے کہ کسی طرح لوگوں کو رلایا جائے' انکے لئے یہ قصہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ رلانے کیلئے یہ بہت موثر ہے چنانچہ اس کی بے سندی کو سند دینے کیلئے غیر مستند توجیہات کا سہارا لینے کی کوشش کی گئی ہے لیکن تاریخ و مقاتل کے محققین و مدققین اور تجزیہ نگاروں نے ان فرسودہ اور بوسیدہ توجیہات کو براہین عقل و نقل سے مسترد کیا ہے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔

قصہ دامادی قاسمؑ

یہ قصہ کتاب "ریاض القدس" جلد ۲' ص ۲۴ پر نقل کیا گیا ہے جیسا کہ بیان ہوا' خود صاحب کتاب اس بات کا اعتراف کرنے کے بعد کہ انہیں کسی معتبر کتاب سے اس قصہ کی تصدیق نہیں مل سکی ہے' اس کی سند کیلئے دو کتابوں کے نام لکھتے ہیں۔ ایک "منتخب المراثی" تالیف شیخ فخر الدین طریحی' صاحب مجمع البحرین اور دوسری "روضۃ الشہداء" تالیف ملا حسین کاشفی۔

ان دونوں کتابوں میں قصہ عروسی قاسمؑ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ اس دن قاسمؑ کیلئے ایک خیمہ مختص کیا گیا اور اس خیمے میں رسم زفاف عمل میں آئی۔ اسی طرح سے ایک بیان یہ بھی ہے کہ گویا ایک قاسم ثانی پیدا ہوئے جن کی قبر ایران کے شہر شمران میں واقع ہے۔ ہمیں بڑی شرمندگی کے ساتھ یہ بات

لکھنا پڑ رہی ہے کہ ایران اسلامی میں مرکز فقہاء و مجتہدین کے ہوتے ہوئے ایسی مجہول بلکہ جھوٹی زیارت گاہ کا برقرار رہنا' درحقیقت مذہب تشیع اور واقعہ کربلا کے صفحات پر بدنما داغ کے مانند ہے۔

صاحب ریاض القدس کہ جو اکثر مقامات پر غیر مستند نقل کو مسترد کرنے اور غیر معتبر گردانے کے باوجود اسے نقل کر کے اس کی توجیہ بنانے کے عادی ہیں' اس قصہ کے حوالے سے رسم زفاف اور ولادت قاسم ثانی کو تو خود بھی مسترد کرتے ہیں لیکن اصل رسم عقد نکاح کی یہ کہہ کر تائید فرماتے ہیں کہ اس سے بکاء اور ابکاء (رونے رلانے) میں مدد ملتی ہے۔ یوں یہ رسم عقد نکاح اب عاشورا کی مصیبت کا حصہ بن گئی ہے۔ امام حسینؑ نے جس عالم ناگواری میں اس عقد نکاح کو انجام دیا' اس کے ذکر سے دل مغموم اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

صاحب ریاض القدس نے اس قصہ کی تائید کی خاطر اور کربلا کے ناگوار ماحول میں عقد نکاح کے فلسفہ کے بیان کیلئے ایک اور غیر مستند خبر کو نقل کیا ہے وہ یہ کہ حضرت داؤد پیغمبرؑ کو راستے میں ایک یتیم بچہ ملا۔ انہوں نے اس کی تربیت کی۔ جب وہ تیرہ چودہ سال کی عمر کو پہنچا تو آپ نے اسے آداب سنت و شریعت سے آگاہ کیا۔ یہ بچہ حضرت داؤدؑ کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا آپ اس سے بڑی محبت فرماتے تھے ایک دن یہ جوان حضرت داؤدؑ کے حضور میں تھا کہ حضرت عزرائیل نے آپ سے کہا: اے اللہ کے نبی! اس یتیم کی تربیت میں آپ نے بڑی زحمتیں برداشت کیں لیکن اب اس کی عمر ختم ہو چکی ہے۔ یہ آئندہ ہفتے آپ کے پاس نہیں ہوگا۔ ہم اسے خدا کی بارگاہ میں اٹھائیں گے۔ حضرت داؤدؑ پریشان ہو گئے حضرت عزرائیل کے جانے کے بعد آپؑ نے اس جوان سے کہا کہ تم فلاں تاجر کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اپنی بیٹی تمہارے عقد میں دیدے۔ جب لڑکے نے ایسا کیا تو تاجر نے کہا ٹھیک ہے' میں نبی کے حکم کی اطاعت ضرور کرونگا۔

مجلس کو آراستہ کیا گیا' حضرت داؤدؑ نے عقد نکاح پڑھا۔ لیکن آپ نے اس جوان کو ہدایت کی کہ "اس لڑکی کے ساتھ اس وقت تک ہمبستری نہ کرنا جب تک کہ میں حکم نہ دوں اور تم ہمیشہ میری مجلس میں حاضر رہنا" لہٰذا وہ جوان ہمیشہ حضرت داؤدؑ کے محضر میں رہتا تھا۔ حضرت داؤدؑ حضرت عزرائیل کا انتظار کر رہے تھے۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ جب حضرت عزرائیل غروب آفتاب کے قریب آئے تو حضرت داؤدؑ نے عزرائیل سے

کہا: ''اے عزرائیل! تو نے ابھی تک اس جوان کی روح قبض نہیں کی'' انہوں نے کہا: ''اے نبی! آپ نبی ہیں' جمالِ خدا کا آئینہ ہیں' صفاتِ خدا کا مظہر ہیں' خدا کی صفات میں سے ایک صفتِ رحیمیت ہے۔ اس وقت جب میں نے کہا تھا کہ اس بچے کی عمر ختم ہورہی ہے تو آپ کا دل محزون ہوگیا تھا جس پر خدا کو رحم آگیا۔ آپ نے اس کا عقد پڑھا لیکن ابھی تک اس نے ہمبستری نہیں کی ہے' اپنی امید کا پھول ابھی تک نہیں توڑا ہے۔ نوجوان ہے' یہ مرجائے گا تو سب محزون ہوں گے۔ جب آپ نے اس پر رحم کیا تو خدا کو بھی رحم آگیا۔ اب اس جوان کو خدا نے چالیس سال مزید عمر دے دی ہے''۔

سیدالشہداءؑ نے بھی قاسم کو تربیت دی۔ ان سے عطوفت ومحبت کی جب قاسم نے میدان جنگ میں جانے کا عزم کیا تو آپؑ نے بھی اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی اور فرمایا: ''قاسم جاؤ اور لشکر عمر سعد سے کہو کہ میں یتیم امام حسنؑ ہوں' داماد حسینؑ ہوں' نوجوان ہوں' پیاسا ہوں محتاج رحم ہوں''۔ پس قاسم میدان میں گئے اور شعر پڑھے۔

محترم قارئین! دیکھا آپ نے' کتاب لکھنے والے قصۂ دامادی حضرت قاسم کی روایت کی سند کو غیر معتبر گردانے کے باوجود فقط حزن ومصیبت کو بڑھانے اور آنسوؤں کے چند قطروں کے بہانے کی خاطر نبیِ معصوم سے منسوب ایک ایسی روایت نقل کردی کہ جس کی سند خود بھی نہیں دی ہے۔ یہ روایت بے سند ہونے کے علاوہ اپنے اندر جھوٹ ومن گھڑت ہونے کے چند شواہد بھی لئے ہوئے ہے' جو یہ ہیں:

نقد وتجزیہ

۱۔ تمام تواریخ ومقاتل حتیٰ غیر مستند روایات نقل کرنے والوں نے بھی قصۂ دامادی قاسم کو غیر معتبر اور غیر مستند قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود اسے ''العہدۃ علی الراوی'' کے عنوان سے پھر سے آب وتاب کے ساتھ اہمیت دے کر نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسے شراب کی بوتل کو پیپسی کولا کہہ کر اس سے افطار کرنا۔

جب ایک بات جھوٹ پر مبنی ہے ضمیر وجدان اسے قبول نہیں کرتا' موازین شرع اس کو مسترد کرتے ہیں تو عہدہ بر راوی کہنے سے جھوٹی بات سچ میں تبدیل تو نہیں ہوجائے گی۔ کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ مختصر سے دنیوی مفاد کی خاطر اقدار مذہب سے یوں کھیلا جائے۔

۲۔ لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی بیٹی قاسم کے عقد میں دی۔ صاحب کتاب ذرا یہ بھی لکھتے کہ امام حسینؑ نے اپنی کونسی بیٹی قاسم کے عقد میں دی؟ حیات امام حسینؑ پر لکھی گئی کتابوں میں آپؑ کی ازواج واولاد کا جو ذکر ملتا ہے' اگرچہ ان میں تعداد کے حوالے سے مختصر سا اختلاف پایا جاتا ہے' لیکن پھر بھی جن بیٹیوں کا ذکر آیا ہے' ان میں ایک جناب سکینہؑ ہیں اور دوسری بیٹی فاطمہ صغریٰ ہیں۔ جناب فاطمہ صغریٰ کا قاسم کے عقد میں جانا دو نقول کے حوالے سے خلافِ حقیقت بات ہے:

(۲۔۱) ایک روایت یہ ہے کہ امام اس بیٹی کو مدینہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس نقل کے حامیوں کیلئے تو گنجائش ہی نہیں ہے کہ اس کو تسلیم کریں۔

(۲۔۲) دوسری روایت جو مستند ہے' یہ ہے کہ فاطمہ صغریٰ حسن مثنٰی کے عقد میں تھیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی بیٹی تھی جو قاسم بن حسنؑ کے عقد میں آئی؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ شادی تو اتنی اہمیت کے ساتھ اور انتہائی سخت وناگوار حالات میں ہوئی لیکن لڑکی کا ذکر ہی نہیں ہے؟

۳۔ اس قصے کی تائید کیلئے جو فلسفہ گھڑا گیا ہے کہ امام حسینؑ نے اس عقد نکاح کو اس لئے انجام دیا کہ وہ تمام مصیبتیں جن کا دنیا میں تصور ممکن ہے' امامؑ سب کو اپنے سر لے لیں اور کامیابی حاصل کریں۔ اس منطق کی بھلا کوئی عقلی یا نقلی تائید ممکن ہے؟ عقل انسانی تو اس کو مسترد کرتی ہے کیونکہ کوئی بھی عاقل انسان اپنے ہاتھوں اپنے لئے مصیبت وضرر پیدا کرنا جائز نہیں سمجھتا۔

(۳۔۱) انسان پر مصیبت ہمیشہ دوسروں کی طرف سے مسلط ہوتی ہے۔ کوئی انسان خود اپنے آپ کو بلاوجہ کسی مصیبت میں نہیں ڈالتا۔ البتہ خدا آزمائش وامتحان کیلئے بندے کو مصیبت میں مبتلا کرسکتا ہے۔ ہنگام کربلا میں مصیبت کے انتخاب کا کوئی حکم خدا نے امام حسینؑ کو نہیں دیا تھا۔ شریعت میں نابالغ کی رسم عقد ونکاح کا کوئی حکم نہیں ہے۔

(۳۔۲) قاسم کہ جو بھائی کی نشانی بھی ہیں اور حسینؑ کو بے حد عزیز بھی جنہیں ویسے بھی تھوڑی دیر بعد رکاب امام حسینؑ میں شہید ہونا ہے' فقط داماد بنا کر شہید ہونے سے حسینؑ کی مصیبت میں کیا اضافہ ہوگا؟ حسینؑ

کیلئے درپیش مصیبتیں تو پہاڑ جیسی ہیں جس میں بھائی کی یادگار قاسم بن حسنؑ کی شہادت بھی شامل ہے۔ پہاڑ نما ان عظیم مصیبتوں کے آگے قاسم کا داماد بن کر شہید ہونا پہاڑ کے آگے پتھر کی مانند ہے۔

(۳۔۳) امام حسینؑ نے اپنے قیام مقدس کے اسباب و علل، ہر ہر مرحلہ پر خود اپنی زبان مبارک سے بیان فرمائے ہیں۔ کتب سیر و تاریخ میں فلسفۂ قیام و نہضت سے متعلق جو نقول ملتے ہیں، ان میں سے کہیں بھی یہ جملہ نہیں لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے دنیا کی تمام مصیبتوں کو اپنے سر لینے کیلئے قیام فرمایا۔

۴۔ ایک توجیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ امام حسینؑ نے امام حسنؑ کی وصیت پر عمل کرنے کیلئے یہ عمل انجام دیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ نے جناب قاسم کو میدان جنگ میں جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا تو قاسم غمگین ہو گئے، فکر و سوچ میں پڑ گئے کہ کس طرح سے عمِ بزرگوار سے اجازت لیں۔ اتنے میں آپ کو اپنے بازو پر بندھا ہوا تعویذ یاد آیا۔ آپ نے تعویذ امام حسینؑ کو دکھایا تو امامؑ کو بھائی کی وصیت یاد آئی اور آپؑ نے فرمایا: بیٹا! اگر تمہارے لئے ایک وصیت ہے تو میرے لئے بھی ایک وصیت ہے۔

(۴۔۱) آیاتِ قرآن و روایاتِ معصومینؑ کی رو سے وصیت کا تصور یہ ہے کہ وصیت وصی اور گواہ کی موجودگی میں کی جاتی ہے نہ کہ صرف موصی الیہ کو۔ اگر کوئی ایسا کرے تو وہ قابل عمل نہیں ہے اگر یہ قابل عمل ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا لہٰذا جو بات تعویذ کی صورت میں وصیت کے نام سے جناب قاسم سے کی گئی ہے، اسے وصیت نہیں کہا جا سکتا اور اس طریقے سے وصیت گھڑنا امام کی شان میں جسارت کرنا ہے۔

(۴۔۲) آیات و روایات میں تعویذ کا تصور یہ ہے کہ مشکلات میں خدائے مالک و ملک سے پناہ مانگی جائے۔ اس طرح سے خود کو محضر رب میں چھوڑنا تعویذ کہلاتا ہے۔ کاغذ پر لکھ کر بازو پر باندھے جانے والے تعویذ کا کوئی تصور سیرت ائمہؑ میں کہیں نہیں ملتا ہے۔ اس حقیقت پر ہم آئندہ صفحات میں الگ سے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ وصی کی اہمیت اس وقت ہے جب وہ امین و معتمد ہو اور اس وصیت پر عمل کرنے کا ہر لحاظ سے پابند ہو۔ اس میں کسی قسم کی کوتاہی کا تصور نہ ہو۔ اگر بالفرض قاسم بن حسن اس تعویذ کو نہ دکھاتے

تو امام حسینؑ اس وصیت پر عمل کئے بغیر ہی شہید ہو جاتے کیونکہ اس روایت سے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ اس وصیت کو بھول گئے تھے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام حسینؑ معصوم ہستی ہیں، آپ سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہو سکتی خصوصاً فرائض و واجبات میں کوتاہی خلاف عصمت ہے۔

(۴۔۳) امام حسنؑ کو امام حسینؑ سے اولاد کے بارے میں وصیت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جسے بالغ ہونے پر حضرت قاسم کو بجا لانا تھا۔ اگر ہم اس وصیت کو تسلیم کر بھی لیں تو اس وصیت پر عمل اس وقت ہونا چاہئے تھا جب قاسم حدِ بلوغ کو پہنچ جاتے لیکن یہاں اس نوبت کے آنے سے پہلے ہی وصی اور موصی الیہ دونوں جام شہادت نوش فرما گئے۔ لہٰذا اس کی بھی کوئی منطق نہیں بنتی۔

۵۔ اگر ہم قاسم کی رسم عقد نکاح، زواج یعنی رسم زفاف کو بھی تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایام مصیبت امام حسینؑ میں جشن نما محافل برپا کریں اور تبرکات کے نام سے مٹھائیاں تقسیم کریں۔ شادی کے ان مراسم کو زندہ رکھنے کی شریعت میں کیا سند ہے اگر ان مراسم کو باقی رکھنا ضروری ہے تو پھر صفحات تاریخ میں دیگر امام زادگان کی شادیوں کی بھی تاریخیں ملنا چاہئے۔ کیا کسی تاریخ میں ملتا ہے کہ امام حسینؑ کی شادی کب ہوئی تھی؟ حضرت عباسؑ کی کب ہوئی؟ حضرت علی اکبرؑ کی شادی ہوئی تھی یا نہیں، اگر ہوئی تھی تو کب ہوئی؟ اگر ملتا ہے تو پھر آپ کا حق بنتا ہے کہ قاسم کی عروسی کربلا میں آب و تاب کے ساتھ نہ ہونے کے غم میں ایام عزا میں قاسم کی شادی کی پر رونق محفل سجائیں۔ کسی بھی امام کی حیات طیبہ میں یہ نہیں ملتا کہ ان کے یہاں رسم عروسی پُر شکوہ تقریبات کی شکل میں انجام پائی ہوں۔

۶۔ ایک توجیہ ان قصہ سازوں نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی شادی اس وقت کرائی جب عزرائیل نے خبر دی کہ بچے کی عمر ختم ہو رہی ہے۔ یہ اس لئے کیا تاکہ بچے کا حق ادا ہو سکے اس قصے کے من گھڑت ہونے کے شواہد بھی خود قصے کے اندر موجود ہیں جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

(۶۔۱) صاحب کتاب نے قصہ داؤدؑ کی کوئی سند کہیں سے بھی نہیں دی ہے۔

(۶۔۲) حضرت داؤدؑ نبی تھے، حقیقت پر مبنی فیصلے کیا کرتے تھے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ راستے سے ملنے والے یتیم کو اپنا بیٹا بنالیں۔ شریعت اس طرز کو تسلیم نہیں کرتی۔

(۶۔۳) جو بچہ مجہول نسب کا ہو، اسکا قاسم بن حسن سے جو نسل نبوت و رسالت سے ہیں، موازنہ کرنے کی جرأت کرنا جسارت ہے۔

(۶۔۴) لکھا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس بیٹے کا عقد نکاح کر کے اسے اپنی بیوی سے ہمبستری کرنے سے منع کیا۔ آیا میاں بیوی کے درمیان رشتہ محبت، ہمبستری سے پہلے زیادہ ہوتی ہے یا بعد میں؟

(۶۔۵) داؤدؑ نے ایسا اس لئے کیا تا کہ خدا سے رحم کروا کر اس نوجوان کو موت سے بچا سکیں۔ اسی طرح امام حسینؑ نے بھی اس خیال سے قاسم کا عقد نکاح کیا تھا کہ خدا آپ پر بھی رحم کرے۔ داؤد کا منہ بولا بیٹا داؤد کے رحم کی بنیاد پر بچ گیا لیکن حسینؑ کا پروردہ میدان جنگ سے واپس نہیں آیا!!

(۶۔۶) امام حسینؑ نے قاسم سے یہ کیسے فرمایا کہ میدان میں جا کر لشکر سے یتیم حسنؑ ہونے، نوجوان ہونے اور نو داماد ہونے کے ناطے رحم کی اپیل کرنا جبکہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "ذلت ہم سے نہیں ہے"۔ نہ تو خود امام حسینؑ نے اور نہ ہی آپ کے یاران باوفا میں سے کسی نے کبھی بھی دشمن سے رحم کی درخواست کی لہٰذا خود یہ جملہ اس قصہ کے جھوٹ ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ مجالس امام حسینؑ کی سرپرستی کوئی امام یا نائب امام یا لائق و سزاوار ہستی نہیں فرما رہے ہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جاہل لوگ عزاداریٔ امام حسینؑ میں بھی اپنے معاشرہ کے جاہلانہ آداب و رسومات کو فروغ دینے کی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

قصہ تعویذ قاسم

تعویذ عام اصطلاح میں چند اسمائے متبرکہ یا آیات قرآنی یا دعائیہ کلمات یا نقوش وغیرہ کو کسی کاغذ یا چمڑے وغیرہ پر لکھنے کے بعد جسم یا کسی اور چیز پر باندھ کر اس سے حاجتیں اور امیدیں وابستہ رکھنے کو کہتے ہیں تعویذ کا یہ تصور درحقیقت عقل، لغت، آیات قرآنی اور روایات معصومینؑ سب سے متعارض اور متصادم ہے۔

جو لوگ دین میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور حقائق کو سمجھنے کیلئے درک و ادراک کے اصولوں پر گامزن اور استوار رہنے کے پابند ہوتے ہیں، وہی راہ ہدایت پاتے ہیں اور دنیا و آخرت دونوں میں ساحل نجات پر پہنچتے ہیں۔ مرنے سے پہلے اگر چند لمحے ہی باقی رہ گئے ہوں، مثبت غور و فکر کبھی انہی چند لمحوں میں سعادت سے ہمکنار کر دیتی ہے اس کی واضح مثال حُر بن یزید ریاحی اور بعض دیگر افراد ہیں کہ جو لشکر عمر سعد میں تھے، چند لمحات کی سوچ نے انہیں شقاوت ابدی کے بجائے سعادت ابدی سے ہمکنار کر دیا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو دین میں تعقل و تدبر کے عادی نہیں یا کہتے ہیں کہ دین میں سوچ کی گنجائش نہیں اور سمجھتے ہیں کہ عشق کی سواری ہی انسان کو ملاءِ اعلیٰ تک پہنچا دے گی، ایسے لوگ آیاتِ قرآنی کے تحت اصحاب جہنم ہیں۔ چنانچہ سورۂ ملک آیت ۱۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر﴾

"اگر ہم سنتے اور غور کرتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے"

اس آیت کے مطابق جہنمی ہونے کا واحد سبب ہے نہ سننا اور غور نہ کرنا۔ ہم یہاں پر تعویذ کی حقیقت کو روشن کرنے کی کوشش کریں گے جس کے بعد غور و فکر کرنے والے قارئین خود فیصلہ کر سکیں گے کہ جناب قاسم کے بازو پر تعویذ تھا یا نہیں؟

لفظ تعویذ کا مادّہ عوذ ہے العوذ کے معنی کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا ہیں چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

﴿اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین﴾ "میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں" (بقرہ/۶۷)

اس کے علاوہ سورۂ آل عمران آیت ۳۶، سورۂ نحل آیت ۹۸ اور سورۂ یوسف آیت ۲۳ میں بھی یہ لفظ خدا کی پناہ میں جانے اور اس سے اپنی پناہ میں لینے کی درخواست کرنے کے معنوں میں ذکر ہوا ہے۔

پناہ لینے کا تصور یہ ہے کہ خود کو کسی مقتدر، صاحب حکومت و سلطنت کی حفاظت میں دینا اور پھر اس ہستی سے یہ چاہنا کہ وہ بدی کو اس سے دور کر دے۔

خدا یا کسی اور سے پناہ لینے کی تفسیر وتوضیح کرنے سے پہلے خود وجود کے بارے میں کچھ گفتگو ضروری ہے کسی چیز کے چار وجود ہوتے ہیں اور ہر ایک کا مرحلہ اس سے پہلے والے کے لئے سیڑھی کے مانند ہوتا ہے۔

۱۔ ذہنی یا تصوراتی وجود:

مثلاً آپ تصور کریں کہ میں کھانا کھا رہا ہوں، پانی پی رہا ہوں، شادی ہو رہی ہے، یہ بھی ایک قسم کا وجود ہے اس وجود کا واحد اثر ذہن پر مرتب ہوتا ہے۔ جب تک یہ وجود ذہنی حدود میں محصور رہے گا، اس پر کسی قسم کے بھی دیگر اثرات مرتب نہیں ہونگے۔ اس کو وجود احساس بھی کہتے ہیں۔ یہ وجود کا ادنیٰ ترین درجہ اور مخفی و پوشیدہ وجود ہے۔ جب تک اظہار نہ کیا جائے کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ جب تک اس کو الفاظ کی شکل میں لا کر بیان نہ کیا جائے، یہ کسی کام کا نہیں۔

۲۔ وجود لفظی:

جو چیز ذہن میں آئی ہے اس کا الفاظ کی صورت میں اظہار کرنا، وجود لفظی ہے۔ مثلاً پانی پلا دو، کھانا کھلا دو، شادی کرا دو یا مثلاً خطرہ ہے، میرا تحفظ کرو۔ پس وجود لفظی، وجود ذہنی کے بعد کا مرحلہ ہے لیکن یہ وجود کہ جسے اب آپ لفظوں کے ذریعہ مانگ رہے ہیں، اس کا روبہ عمل ہونا پکارے جانے والے کی سماعت، اس کے علم، اس کی قدرت اور پھر اس کی مصلحت پر متوقف ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ آپکی بات سنتا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا ہے تو آیا اسے علم بھی ہے کہ آپ جو طلب کر رہے ہیں، آپ کو حقیقتاً چاہئے اور یونہی مذاق میں یا بیہودہ نہیں بول رہے ہیں۔ اگر اس نے جان بھی لیا ہے کہ واقعاً آپ کی بات حقیقت پر مبنی ہے تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ کام جو آپ اسے کرنے کو کہہ رہے ہیں، وہ اسے انجام دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ جس کے پاس قدرت نہ ہو وہ کچھ نہیں کر سکتا مثلاً جس کے پاس کھانا نہ ہو آپ ہزار بار بھی اظہار کریں اور وہ سن بھی لے اور آپ کی بھوک کو بھی جان لے، پھر بھی کچھ فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے پاس آپ کو دینے کیلئے کچھ ہے ہی نہیں۔ اسی طرح جس کے پاس لڑکی نہ ہو وہ کسی کو لڑکی نہیں دے سکتا اور خود جس کے پاس تحفظ نہ ہو وہ کسی کو تحفظ نہیں دے سکتا لہٰذا قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ان الذی تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ﴾ ''خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی نہ بنا سکیں گے اگر چہ سب اس پر اکٹھے ہو جائیں'' (حج/۷۳)

سماعت، علم اور قدرت ہونے کے بعد بھی ممکن ہے کہ وہ آپ کا کام انجام نہ دینے میں مصلحت جانے کبھی وہ سب کچھ رکھتے ہوئے بھی کام انجام نہیں دیتا کیونکہ وہ اسے آپ کے حق میں بہتر نہیں دیکھتا ہے۔ خداوند عالم بہت سے لوگوں کو جو دعا کرتے ہیں غنی اور مالدار نہیں بناتا یا ان کو تحفظ نہیں دیتا کیونکہ اسکی مصلحت میں انکے لئے بہتر نہیں دیکھتا۔ چنانچہ امام حسینؑ کو ۳۰ ہزار کے لشکر نے گھیر رکھا تھا لیکن انہیں تحفظ نہیں دیا کیونکہ اس کی مصلحت نہیں تھی جبکہ امام زمان (عج) کو ابھی تک اپنے حفظ و امان میں رکھا ہوا ہے کیونکہ یہ اس کی مصلحت ہے۔

۳۔ وجود کتبی:

آپ اپنی بات بلیک بورڈ پر یا کاغذ پر لکھ دیجئے۔ یہ ایک رنگ ہے جو دوسرے جسم پر ظاہر ہوتا ہے اسے وجودِ کتبی کہتے ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے کوئی ضروری نہیں کہ دیکھنے والا اسے دیکھ کر آپ کی لکھی ہوئی بات سے کوئی تاثیر اپنے ذہن میں مرتب کرے۔ یہاں بھی شرائط ہیں کہ وہ اسے پڑھ سکتا ہو، سمجھ سکتا ہو، جو بات آپ نے لکھی ہے اسے انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو اور اسے انجام دینے میں مصلحت دیکھتا ہو۔ عمومی طور پر وجود کتبی مخلوقات کے درمیان ایک قسم کا ذریعۂ ارتباط ہوتا ہے۔ یہ خدا اور مخلوق کے درمیان رابطہ کا وسیلہ نہیں ہے لہٰذا کسی بھی نبی یا امام یا ولی اللہ نے خدا کو خط لکھا ہو یا اپنے عرائض تحریر میں لا کر خدا کو رسال کئے ہوں، ایسی کوئی سند یا مثال نہیں ملتی۔ پس وجود لفظی کے بعد وجود کتبی بطور سند پیش کیا جاتا ہے تا کہ فریقین کی طرف سے انکار کرنے کا یا مکرنے کا خطرہ لاحق نہ رہے۔

وجود کتبی خالصتاً مخلوقات کے مابین ہوتا ہے، خالق اور مخلوق کے درمیان نہیں اور تعویذ وجود کتبی ہے، ہمیں تاریخ انبیاءؑ اور سیرت ائمہؑ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں انبیاءؑ یا ائمہؑ کا خدا سے تحریری طور پر کسی چیز کے طلب کرنے کا ذکر ہو۔ جو افراد اپنے گھروں کی بنیادوں میں آیتیں لکھ کر رکھتے ہیں یا گھروں کے دروازوں پر ''فاللہ خیرا'' لکھتے ہیں یا اپنے بازوؤں اور گاڑیوں پر آیات لکھ کر باندھتے ہیں، خود ان میں سے بھی

اکثر لوگوں کا اپنے عمل پر کامل عقیدہ نہیں ہوتا۔ اگر عقیدہ محکم ہوتا تو مسلح محافظ نہ رکھتے۔ خدا کی حفاظت میں ہونے کے بعد پھر ان کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے۔ غرض کہنے سے یا لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا' اصلاً عمل کی ضرورت ہوتی ہے صرف لکھنے سے کہ اے خدا مجھے تحفظ دیدے تحفظ نہیں ملتا بلکہ اس کے لئے خود کو دل و جان سے خدا کے سپرد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ہم نے اس سلسلے میں جو قرآنی آیات نقل کی ہیں' ان میں بھی ایسا ہی ذکر ہوا ہے۔ پس لکھنے کا یہ عمل کسی عقل اور منطق سے درست نہیں ہے۔

۴۔ وجودِ حقیقی:

روٹی انسان کی بھوک کو ختم کرتی ہے' پانی انسان کی پیاس کو بجھاتا ہے۔ شادی انسان کی خواہشات نفسانی کو تسکین دیتی ہے۔ لیکن یہاں بھی روٹی' پانی' شادی بذات خود انسان کے مسائل کو حل نہیں کرتے۔ روٹی تنور میں ہونے سے بھوک ختم نہیں ہوتی۔ پانی برتن میں ہونے سے پیاس نہیں بجھتی' شادی کے لئے فقط عقد نکاح پڑھنے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے رسم ازدواج اور میاں بیوی کے درمیان قرب کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وجودِ حقیقی کیلئے وجودِ مقصود تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پناہ بھی اسی طرح ہے پناہ درحقیقت ایک تصور ہے' وجود ذہنی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ میں فلاں کی پناہ میں ہوں' حکومت کے تحفظ میں ہوں یا حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم اپنی رعیت کو تحفظ دیں گے۔ فقط اس تصور سے تحفظ نہیں مل جاتا بلکہ حکومت کو عملی اقدام کے ذریعہ خطرات کے موانع ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اصول کافی' باب الاسماء حدیث نمبر ۲ میں ہشام بن حکم نے امام صادق - سے نقل کیا ہے کہ "جس نے اسم سے پناہ لی اور مسمی کی پرستش نہیں کی' وہ کافر ہے جس نے اسم و مسمی دونوں کی پرستش کی' وہ مشرک ہے۔ جس نے صرف مسمی کی پرستش کی' وہ موحد ہے"۔ اس روایت کے تحت صرف الفاظ اور کلمات کا دہرانا یا لکھنا کسی کام کا نہیں ہے لہٰذا اسم سے پناہ لینے کے بعد عملی زندگی میں دوسری چیزوں کے ذریعہ پناہ مانگنا اور شریعت میں حسن نہ رکھنے والی چیزوں کے ذریعے سے پناہ طلب کرنا' اس حدیث کے تحت شرک کے مترادف ہے۔ صرف تیسرا تصور ہی وہ واحد تصور ہے جو صحیح ہے' جس میں خود کو خدا کے سپرد کرنے کی بات ہے' جنہوں نے خود کو خدا

کے سپرد کر دیا پھر انہیں کسی اور سے کسی قسم کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ انبیاءؑ اور ائمہ اطہارؑ دشمنوں کے نرغے میں ہونے کے باوجود اپنے لئے محافظ نہیں رکھتے تھے۔ جب امیر المومنینؑ کو ۱۹ رمضان المبارک یا اس سے پہلے لوگوں نے محافظ رکھنے کا مشورہ دیا تو آپؑ نے ان سے فرمایا: "تم مجھے کس سے بچانا چاہتے ہو؟ خدا سے' یہ تو ممکن نہیں۔ اگر کہتے ہو لوگوں سے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے"۔ اگر کچھ لوگ کسی کے محافظ ہوتے ہیں تو اگر یہ محافظ خود انہوں نے رکھے ہیں تو یہ شرک کے مترادف ہے اگر دوسروں نے رکھے ہیں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔

تعویذ کے بارے میں اس حقیقت کے روشن ہونے کے بعد حضرت قاسم کے بازو پر باندھے گئے تعویذ کے قصہ کی حقانیت کو ہم قارئین کے فیصلہ پر چھوڑتے ہیں اگر کوئی کہے کہ وہ تعویذ نہ تھا بلکہ امام حسنؑ کی وصیت تھی تو وہ بھی غلط ہی ٹھہرے گا کیونکہ قرآن میں وصیت کرنے کا طریقہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے حکم قرآن یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں وصیت کرو تو شاہد و گواہ رکھ کر کرو۔ دو عادل گواہوں کی موجودگی میں وصیت کرنے کا حکم ہے:

"ایمان والو! جب تم میں سے دو عادل گواہ ہوں' یا پھر تمہارے غیر میں سے ہوں اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہیں موت کی مصیبت نازل ہو جائے' ان دونوں کو نماز کے بعد روک کر رکھو پھر اگر تمہیں شک ہو تو یہ خدا کی قسم کھائیں کہ ہم اس گواہی سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھائیں گے' چاہے قرابتداری کا معاملہ کیوں نہ ہو اور نہ خدائی شہادت کو چھپائیں گے کہ اس طرح ہم یقیناً گناہگاروں میں شمار ہو جائیں گے"[1]

چنانچہ اگر وصیت بھی تھی تو دو عادل گواہوں کا ہونا لازم تھا اور بازو میں لکھ کر باندھنے کے بجائے کسی امین کے سپرد ہونا چاہئے تھا پھر' جیسا کہ بیان کیا جا چکا تعویذ کا مقصد پناہ اور تحفظ میں دینا ہوتا ہے' لہٰذا وصیت یا تعویذ کا عمل جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو' (نعوذباللہ) امام حسنؑ سے منسوب کرنا' آپؑ کی شان میں بہت بڑی جسارت ہے۔

[1] مائدہ/۱۰۶

found.

آل الحسینؑ -

آل الحسینؑ سے ہماری مراد وہ تمام افراد ہیں جو قیام امام حسین - میں آپ کے رکاب میں موجود تھے اور آپ کے اہداف کو کامیاب بنانے' اس کی پاسداری کرنے اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں آپؑ کے ہم سفر وہم رزم رہے۔ آپ کے ساتھ انکی یہ وابستگی خواہ نسبی رہی ہو جیسے آپ کی اولاد اور عزیز و اقارب ہیں یا پھر یہ وابستگی فکری عقیدتی وقلبی بنیادوں پر استوار ہو' جیسے آپ کے اصحاب ویاران ہیں ہم یہاں پر سب کو زیر بحث لائیں گے۔ ان عظیم ہستیوں میں بعض وہ ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ اپنی جانیں راہ خدا میں قربان کر دیں جبکہ بعض نے آپ کے مشن کی محافظت وپاسداری اور فروغ کی خاطر اسیری کو قبول کیا۔ ہم یہاں پر سب کا تذکرہ کریں گے' ان کا بھی کہ جنکا وجود حق وحقیقت اور صداقت پر مبنی تھا اور انکا بھی کہ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ لوگوں نے اپنے مفادات کی خاطر بعد میں جن کا اضافہ کیا ہے۔ انشاءاللہ آئندہ چند صفحات میں ان سب کو ترتیب وار کتب تاریخ اور مقاتل کے اسناد کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

سب سے پہلے ہم آپ کی ازواج کا تذکرہ کرینگے:

ازواج امام حسین -

نقل از: کتاب "سر السلسلة العلویہ" تالیف ابی نصر بخاری متوفی سنہ ۳۴۱ ہجری صفحہ ۳۰' کتاب "عمدة الطالب فی انساب آل ابی طالب" صفحہ ۱۹۱' کتاب "اعلام الوریٰ" صفحہ ۲۵۰' کتاب "المنتہیٰ" صفحہ ۱۲۶ "کشف الغمہ" جلد دوم صفحہ ۲۴۸' کتاب "ارشاد" صفحہ ۲۵۳ "تذکرة الخواص زندگانی امام حسینؑ" جلد اول صفحہ ۱۸۷۔

متذکرہ کتب میں آپ کی درج ذیل ازواج مطہرات کا ذکر آیا ہے:

۱۔ شاہ زنان بنت کسریٰ یزدجرد

بعض مؤرخین کے مطابق آپ کے کا نام شہر بانو تھا۔ تاریخ میں آپ نام "سلافہ" یا "سلامہ" یا "غزالہ" بھی ذکر ہوا ہے۔ آپ مادر امام سجاد - ہیں۔ امام زین العابدینؑ کی ولادت کے بعد ایام نفاس کے دوران ہی مدینے میں آپ وفات پا گئی تھیں۔

تمام مؤرخین مقاتل اس بات پر متفق ہیں کہ شہر بانو نامی کوئی خاتون کربلا میں موجود نہیں تھیں۔ لہٰذا ان سے منسوب تمام مصائب' مرثیے اور نوحے باطل ہیں۔

۲۔ لیلیٰ بنت ابی مرۃ ابن عروہ ابن مسعود ثقفی

محققین تاریخ و مقاتل نے آپ کے بھی کربلا میں ہونے کی نفی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں کسی قسم کی سند موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے منسوب مصائب و دیگر باتیں بھی غلط ہیں۔ آپ مادر حضرت علی اکبرؑ ہیں۔

۳۔ ام قضاعیہ

آپ مادر جعفر ہیں۔ حیات امام حسین - ہی میں وفات پا چکی تھیں۔ ان کے بھی کربلا میں موجود ہونے یا نہ ہونے کی کوئی تاریخ سند نہیں ہے۔

۴۔ ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ

آپ کے بھی کربلا میں موجود ہونے کا تاریخ میں کہیں ذکر نہیں آیا ہے۔

۵۔ رباب بنت امرالقیس کندی

آپ مادر عبداللہ یا بعض مقاتل کے تحت مادر حضرت علی اصغر و سکینہ ہیں۔ آپ کربلا میں موجود تھیں۔ تمام مقاتل میں آپ کا ذکر موجود ہیں۔

۶۔ ہند

ہند بنت عبداللہ بن عامر بن کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد الشمس بن عبد مناف۔

بعض نے لکھا ہے کہ ہند پہلے امام حسین -کی زوجہ تھیں ۔آپ سے علیحدہ ہونے کے بعد یزید ابن معاویہ کی زوجیت میں آگئیں ۔یہ بھی ایک عجیب داستان ہے جس کا ذکر بعض کتب غیر معتبرہ میں آیا ہے ۔اسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصہ یا تو برے عزائم کے تحت گھڑا گیا ہے یا پھر کسی نے انتہائی نادانی میں اس کو ساخت کیا ہے ۔

۶۔ اصب بنت اسحٰق۔

ان کے متعلق بھی ہند کی مانند ایک داستان بنائی گئی ہے جسے ہم آئندہ صفحات میں تفصیلاً ذکر کرینگے۔

حضرت لیلیٰ

امام حسین -کی ازواج مبارکہ میں جناب لیلیٰ بنت ابی مرہ بن مسعود ثقفی کا نام سر فہرست آتا ہے آپ کے زوجیتِ امام حسین -میں آنے کی حتمی تاریخ کے بارے میں تا حال کوئی مستند روایت نہیں مل سکی ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کس سن اور کس مہینے میں آپؑ خاندانِ نبوت میں داخل ہوئیں ۔تاہم حالات کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امام حسین -کی زوجیت میں آنے والی آپ پہلی خاتون ہیں ۔امام حسینؑ کے بڑے فرزند علیؑ ابن الحسینؑ جو حضرت علی اکبر کے نام سے معروف ہیں' آپ ہی کے بطن مبارک سے متولد ہوئے تھے ۔

بعض مؤرخین اس مغالطہ میں کہ منصب امامت فرزند بزرگ کا حق ہے' امام سجادؑ کو جنکا اسم گرامی بھی علی بن الحسینؑ ہے' علی اکبر قرار دیتے ہیں ۔حالانکہ جب سرائے اہل بیت کو مجلس عبیداللہ ابن زیاد میں پیش کیا گیا اور بتانے والے نے بتایا کہ یہ حسین -کے بیٹے علی -ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ وہ میرے بڑے بھائی حضرت علی اکبر تھے' جنہیں کربلا میں شہید کر دیا گیا ۔جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امامت ہمیشہ بڑے بیٹے کو ملتی ہے' تاریخ کے صفحات پر موجود یہ روشن بیان انکے اس خیال کی واضح طور پر نفی کرتا ہے ۔عقلی لحاظ سے بھی اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ امامت ہمیشہ بڑے بیٹے ہی کو ملنی چاہئے لہٰذا یہ بات عقل و نقل دونوں کے خلاف قرار پاتی ہے ۔علاوہ ازیں معروف بھی یہی ہے اور تمام محققین نے لکھا بھی ہے کہ امام حسینؑ کے بیٹوں میں حضرت علی

اکبر سب سے بڑے تھے ۔اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب لیلیٰ ہی آپ کی سب سے پہلی زوجہ ہیں ۔

محمد علی عابدی اپنی کتاب ''علی -ابن الحسینؑ'' میں رقمطراز ہیں کہ ایمان و فضیلت کے حوالے سے جناب لیلیٰ بہت بلند مقام پر فائز تھیں ۔آپ ہر اعتبار سے ایمان و عصمت اور نبوت و امامت کے گھرانے کی زینت بننے کی لائق و سزاوار تھیں ۔

بہر حال ہمارا مقصد سیرت نگاروں کی طرح آپ کے شجرۂ نسب اور خاندانی فضیلت کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا موضوع اور مقصود و مطلوب یہ ہے کہ حضرت امام حسین -کو پس پشت ڈالنے کی غرض سے جو قصے' کہانیاں اور افسانے تراشے گئے ہیں' جو کسی بھی اعتبار سے ہستی خود ان ذوات پاک کے حوالے سے بھی کوئی مناسبت و موزونیت نہیں رکھتے' انکی حقیقت کو واشگاف کیا جائے ۔

جو داستانیں جناب لیلیٰ' اور حضرت علی اکبرؑ سے منسوب کی گئی ہیں' اگر کسی سچے اور حقیقت پسند عزادار امام حسین -کی نظروں سے تاریخ کے یہ صفحات گزریں تو وہ اپنی پشت پر زنجیر مارنے کی بجائے اس زنجیر کو اپنی شرمسار پیشانی پر دے مارے ۔

یہ قصے دو دھاری تلوار کی مانند ہیں جو ایک طرف جناب لیلیٰ پر پڑتی ہے تو دوسری طرف ان کے فرزند رشید' شبیہ ختم المرتبت جناب علی اکبرؑ کو زخمی کرتی ہے ۔ذیل میں ہم ان قصوں کا تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں ۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ ان کے مفاہیم پر ذرا دقت سے غور کریں :

۱۔بیشتر مؤرخین نے لکھا ہے کہ کربلا میں حضرت علی اکبر -کی عمر ستائیس سال تھی ۔امام حسینؑ نے عقل و منطق اور کردار کے حوالے سے آپ کو شبیہ رسول اللہ قرار دیا ہے ۔آپکی فہم و فراست اور مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ امام حسین -کی حیات مبارک میں ہر اس موقع پر کہ جہاں امامؑ کو خود موجود ہونا ہوتا تھا' وہاں حضرت علی اکبرؑ آپؑ کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

اہل بیت نبوت یقیناً شجاعت' شہامت اور سخاوت جیسی خوبیوں کے مالک تھے ۔مگر ان سب خوبیوں سے بڑھ کر حاملان دین و شریعت اور عاملانِ قرآن تھے ۔ان ذوات مقدسہ کی تمام فضیلتیں دین و شریعت سے

منسوب و مربوط ہیں۔اس کے باوجود حضرت علی اکبر -جیسی شخصیت کے بارے میں یہ کہنا کہ اتنی عمر گزر جانے کے باوجود وہ جناب لیلیٰ کو اپنی ماں نہیں سمجھتے تھے بلکہ حضرت زینبؑ کو ماں جانتے تھے، اس فکر کے حامل افراد آخر کیا تفسیر پیش کریں گے؟ کیا اس میں حضرت علی اکبر -کی کوئی فضیلت ہے یا امام حسینؑ کی کوئی خوبی کہ آپ نے اپنے بیٹے کی توجہ کو ماں سے ہٹا کر پھوپھی کی طرف مبذول کرایا، یا ماں کی طرف متوجہ نہ ہونے کو نظر انداز کیا؟ کیا جناب لیلیٰ میں (نعوذباللہ) کوئی عیب و خامی تھی کہ جسکی وجہ سے آپ اکبر -کی ماں کہلانے کی اہل نہیں تھیں؟ کیا دین محمدؐ میں والدین بالخصوص ماں کے حقوق مسلمہ نہیں ہیں؟ کیا حدیث رسولؐ نہیں ہے کہ جب پوچھنے والے نے پوچھا تو آپؐ نے تین دفعہ فرمایا کہ ماں کے ساتھ احسان کرو؟ کیا یہ باتیں حسین -کے جوان رشید کی نظروں میں نہیں تھیں؟ اگر تھیں اور یقیناً تھیں تو پھر یہ افسانہ تراشی کیا علی اکبرؑ کے مقام کو شریعت و معرفت کے مقام سے نیچے نہیں گراتیں؟ اسی طرح کیا یہ بات عصمتِ صغریٰ کی مالک جناب زینبؑ کے مقام کو گرانے کے مترادف نہیں ہے کہ وہ بھتیجے کے بارے میں اس حد تک آگے چلی گئیں کہ اُصول شریعت کی خلاف ورزی کو نظر انداز کر بیٹھیں؟ شاید کہانی گھڑنے والوں کے پیش نظر ہمارے معاشروں میں مروج صورت حال ہو، جہاں گود لئے ہوئے بچوں کا اصل ماں باپ سے کوئی رابطہ نہیں رہنے دیا جاتا۔

۲۔کہتے ہیں کہ جناب لیلیٰ نے حضرت علی اکبرؑ کو میدان میں جانے سے روکا تھا۔کربلا میں موجود تمام صاحبِ اولاد خواتین میں جناب لیلیٰ کو سب سے زیادہ بے صبر و بے قرار دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ جب حضرت علی اکبر -میدان جنگ میں جانے کی اجازت لینے کیلئے اپنی ماں لیلیٰ کے پاس تشریف لائے تو جناب لیلیٰ نے علی اکبر -کو انکے کپڑوں کا صندوق دکھایا جس میں اٹھارہ جوڑے تھے۔ وہ علیؑ جو کپڑوں کے دو جوڑے سے زیادہ نہیں رکھتے تھے، انکے پوتے کیلئے جناب لیلیٰ نے اٹھارہ جوڑے چھپا کر رکھے تھے۔گویا جناب لیلیٰ کا تعلق اہل بیت نبوت و امامت سے نہ تھا بلکہ وہ کسی سرمایہ دار گھرانے کی خاتون تھیں اور حضرت علی اکبر -اس گھرانے کے شہزادے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ علی اکبرؑ

شہزادے تھے مگر انکی شہزادگی ان کپڑوں کی آرائش و زیبائش دنیوی سے نہیں تھی بلکہ ان کی آرائش معرفتِ حق اور توجہ بہ حسینیؑ میں تھی۔

۳۔ابھی تک یہ لوگ جناب لیلیٰ کو اُم لیلیٰ کہتے ہیں جبکہ تمام مؤرخین نے آپ کا اسم گرامی لیلیٰ لکھا ہے۔کسی بھی مقتل میں اُم لیلیٰ کا ذکر نہیں ہے۔امام حسینؑ کی بیٹیوں میں سے بھی کسی بیٹی کا نام لیلیٰ نہیں تھا کہ جس کی بنیاد پر آپ کو اُم لیلیٰ کہا جا سکتا ہو لہٰذا جتنے بھی مرثیے اور نوحے اُم لیلیٰ کے نام سے انشاء کئے گئے ہیں۔ قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انکی کیا حیثیت ہے؟

کتاب ''زندگانی امام حسینؑ'' میں ھاشم رسولی محلاتی نے کتاب ''ریاحین الشریعہ'' جلد سوم صفحہ ۲۹۷ پر، کتاب ''شرارہ عشق حسینی'' میں حاج عباس نجفی نے صفحہ ۸۳ پر، کتاب ''علی اکبرؑ'' کے مؤلف عبدالرزاق مقرم نے صفحہ ۱۴ پر، کتاب ''ارشاد'' میں شیخ مفیدؒ نے طبری نے ''اعلام الوریٰ'' میں، ابن جریر نے ''تاریخ طبری'' میں، ابن اثیر نے ''تاریخ کامل'' میں اور یعقوبی نے اپنی تاریخ میں مادر جناب علی اکبر -کا نام لیلیٰ لکھا ہے۔کسی نے بھی اُم لیلیٰ نامی خاتون کا ذکر نہیں کیا ہے۔

کتاب ''ریاحین الشریعہ'' کتاب ''فرسان الھیجا'' کتاب ''عیون العبریٰ'' سید عبدالرزاق مقرم کی کتاب ''علی اکبرؑ'' شیخ المحدثین کی ''محدث نوری'' شیخ عباس قمی کی ''نفس المہموم'' اور نابغہ تحقیق شہید مرتضیٰ مطہریؒ کی ''تحریفات عاشورا'' جیسی مشہور و معروف کتابوں میں لیلیٰ نامی کسی خاتون کے کربلا میں ہونے کے بارے میں لاعلمی یا دلیل نہ ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے۔البتہ کتاب ''معالی السبطین'' ۔''ریاض المقدس'' ۔''اسرار الشھادۃ'' اور بعض دیگر کتب میں ان لوگوں نے کہ جنہوں نے مصائب خوانی کو اپنا مشغلہ اور ذریعہ معاش بنا رکھا ہے ان واقعات کو بیان کیا ہے۔اسکے علاوہ ایسے سادہ لوح مؤمنین کہ جن کے اندر قریحہ شعر گوئی ہے لیکن کتابوں کے مطالعہ سے دور ہیں، انہوں نے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر مرثیئے اور نوحے انشاء کئے ہیں جو اس وقت ہماری مجالس کی زینت اور آنسو بہانے کیلئے اشک آور گیس بنے ہوئے ہیں۔لیکن وہ مومنین کہ جو اس بیت نبوت و امامت کی عصمت و طہارت کے قائل ہیں یقیناً جھوٹے قصے کہانیوں کو ان سے منسوب کرنے کو کبھی گوارا نہیں

کر سکتے۔امید ہے کہ یہ چند سطور عاشقان امام حسینؑ کیلئے لمحہ فکریہ ثابت ہونگی۔

علی بن الحسین ـ

تمام موٴرخین کے نزدیک امام حسینؑ کے دو فرزند علی کے نام سے معروف تھے۔ایک کی ماں جناب لیلٰی بنت ابی مرۃ ابن مسعود ثقفی ہیں۔جناب لیلٰی کے یہ فرزند بعد میں علی اکبر ؑ کے نام سے معروف ہوئے۔آپ اپنے بابا کے رکاب میں جنگ کرتے ہوئے میدان کربلا میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

امام حسینؑ کے دوسرے فرزند جن کا نام بھی علی ہے، آپؑ کی زوجہ شہربانو سے پیدا ہوئے اور آپؑ کے بعد منصب امامت پر فائز ہوئے آپ بھی کربلا میں موجود تھے لیکن بحکم خدا زندہ رہے، دشمن آپؑ کو شہید نہ کرسکا۔امام حسین ؑ کی شہادت کے بعد آپ کے اس فرزند کو اسیر کرکے کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں لے جایا گیا۔ان تمام مراحل سے گزر کے آپؑ واپس مدینہ پہنچے اور چالیس سال تک امامت و رہبریٔ اُمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔زین العابدین اور سجادؑ آپ کے مشہور القاب ہیں۔آخر مدینے میں ہی لقاءاللہ سے سرفراز ہوئے۔آپؑ کے بعد آپؑ کے فرزند، حجت پنجم امام محمد باقرؑ ہدایت و رہبری کے منصب پر فائز ہوئے۔

اس وقت ہمارا موضوع علی بن الحسینؑ فرزند لیلٰی بنت ابی مرۃ بن مسعود ثقفی معروف بہ علی اکبرؑ ہیں۔گرچہ مشہور و معروف ہے کہ جناب لیلٰی کے فرزند ہی امام حسینؑ کے سب سے بڑے بیٹے ہیں اور اکثر کتب تاریخ میں بھی جناب لیلٰی کے بیٹے ہی کو امام حسینؑ کا فرزند اکبر قرار دیا گیا ہے۔لیکن بعض موٴرخین نے کسی علت کے بغیر اس میں تشکیک ظاہر کی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ امام سجادؑ فرزند شہربانو کو علی اکبر کہا گیا ہے اور فرزند لیلٰی کو علی اوسط۔شاید انکے اس خیال کے پس پشت یہ منطق و توجیہہ ہو کہ امامت ہمیشہ بڑے فرزند میں منتقل ہوتی ہے، حالانکہ عقل و نقل اور سنت کے کسی بھی زاویئے سے اس بات کی کوئی سند نہیں ملتی۔شاید اسی وجہ سے ہمارے یہاں رائج مراسم عزاداری میں خطباء، نوحہ خواں و سوز خوان حضرات جناب علی اکبر ؑ کو اٹھارہ سال کا کڑیل جوان بیان کرتے ہیں، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔اس سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل تاریخی شواہد قلمبند کررہے ہیں:

(۱) صاحب ''مناقب'' ابن شہرآشوب، صاحب ''آلام الوریٰ'' طبرسی، صاحب ''ارشاد'' شیخ مفیدؒ صاحب ''حدائق الوردیہ''، ابن ادریس، صاحب ''نفس المہموم'' شیخ عباس قمی، صاحب ''مقاتل الطالبین''، ابوالفرج اصفہانی اور صاحب ''ہدایۃ الزائر'' علامہ نوری، ان سب کے مطابق جناب حضرت علی اکبر دور خلافت عثمان کے وسط میں متولد ہوئے تھے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتل عثمان سے تقریباً تین سال پہلے یعنی ۳۳ ہجری کے آس پاس آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ان علماء و موٴرخین کی تائید امام سجادؑ کے اس جواب سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے ابن زیاد کے سوال کرنے پر فرمایا تھا۔ابن زیاد نے آپ سے پوچھا: ''کیا علی ابن الحسینؑ کربلا میں قتل نہیں ہوئے تھے؟'' اس کے جواب میں امامؑ نے فرمایا: ''وہ میرے بڑے بھائی تھے۔''

پس ان علماء کی تصریح کے تحت وقت شہادت حضرت علی اکبر کی عمر ۲۷، ۲۸ سال کے درمیان تھی۔

(۲) تاریخ کربلا شاہد ہے کہ امام حسینؑ کے اصحاب باوفا اصحاب رسولؐ اور بنی ہاشم کے دوسرے جوانوں کے ہوتے ہوئے بھی حضرت علی اکبر معرکہ کربلا کے ہر مشکل اور اہم موقع پر پیش پیش نظر آتے ہیں۔اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ علم و فضل، شجاعت و شہامت میں بلوغت کے ساتھ ساتھ بہ اعتبار عمر بھی اپنے تمام بھائیوں میں بڑے تھے۔

(۳) تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ امام سجاد ؑ کی مادر گرامی شہربانو (شاہ زنان) حضرت علیؑ کے دور خلافت میں اسیر ہوکر لائی گئیں اور اسکے بعد امام حسینؑ کے عقد میں آئیں۔حضرت علیؑ کا دور خلافت سنہ ۳۶ ہجری میں شروع ہوا۔اس وقت حضرت امام حسینؑ کی عمر ۳۳ سال تھی۔اہلبیت کی خاندانی روایات کے پیش نظر، آپکا اتنی عمر بغیر شادی کے رہنا کیا قرین قیاس نہیں ہے؟ لہٰذا تمام آثار و قرائن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جناب لیلٰی ہی آپ کی پہلی زوجہ ہیں اور وہ علی بن الحسینؑ جو کربلا میں شہید ہوئے اور جنہیں علی اکبرؑ کہا جاتا ہے، وہ جناب لیلٰی کے بطن سے آپکے بڑے فرزند ہیں۔

اس حقیقت کے واضح ہوجانے کے بعد، حضرت علی اکبر ؑ کو اٹھارہ سال کا جوان قرار دینا ایک بے معنی سی

بات ہے۔ وہ حکایتیں اور قصے جو حضرت علی اکبر -اور ان کی مادر گرامی جناب لیلیٰ سے منسوب کر کے بیان کئے جاتے ہیں' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کے گھڑنے والوں کے تصور میں حضرت علی اکبرؑ بھی ہمارے معاشرے کے کسی اٹھارہ سال کے عام جوان کی مانند ہیں کہ جو اس قسم کے جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ بفرض محال اگر آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی' تب بھی ایسی باتیں بیتِ امامت و نبوت میں پرورش پانے والی خواتین اور ان کی اولاد سے بعید ہیں۔

پس یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ وقت شہادت حضرت علی اکبرؑ کی عمر ۲۷' ۲۸ سال تھی۔ لہٰذا حضرت علی اکبرؑ کے حوالے سے جو بھی حکایتیں' عقل و شرع اور عرفان امامت سے ہٹ کر' ایک عام انسان کی مانند زبانِ حال سے جاری ہوں' خواہ انہیں امام حسینؑ سے نسبت دی جائے' جناب زینبؑ سے یا جناب لیلیٰ سے' در حقیقت اس خاندان کے حق میں جسارت ہے۔ ایسی من گھڑت کہانیاں گھڑنے والوں کا اس بیت امامت و طہارت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے لہٰذا ان جعلی حکایتوں اور جھوٹے قصوں کو فروغ دینے سے پہلے عزادارانِ امام حسینؑ کو بھی سوچنا چاہئے کہ آیا وہ اس کے ذریعے مقصدِ قیام امام حسین -کو فروغ دے رہے ہیں یا ہدف امام پر ایک اور چھرا گھونپ کر امامؑ کی مظلومیت میں اضافہ کر رہے ہیں؟

سلامہ/سلافہ/غزالہ بنت یزدجرد

آپ کا لقب شاہ زنان تھا جو ملکۂ نساء یا سیدۂ نساء کے ہم معنی ہے۔ آپ امام چہارمؑ سید الساجدین -کی مادر گرامی تھیں۔

معتبر تاریخی اسناد کے مطابق آپ ایران کے بادشاہ یزدجرد کی بیٹی تھیں جس کا نسب نوشیروان سے ملتا تھا۔ آپ بیت امامت میں کب اور کیسے آئیں' زوجۂ امام بننے کا شرف کیسے حاصل ہوا؟ اس سلسلے میں محققین کی آراء اضطراب و انتشار کا شکار نظر آتی ہیں۔ کتب تاریخ و سیر کی ورق گردانی کرنے سے تین اقوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں جب ایران فتح ہوا تو یزدجرد کی دو بیٹیاں بھی اسیر ہو کے آئیں۔ حضرت علیؑ نے حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا کہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے شوہر انتخاب کرنے کا حق دیا جائے

اور جس کی زوجیت میں جائیں اس کا مالِ غنیمت شمار کی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ کام خود حضرت علیؑ کو تفویض کر دیا۔ آپ نے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے شاہ زنان کو امام حسینؑ کے عقد میں دے دیا اور دوسری کو محمد بن ابو بکر کے عقد میں۔

یہ روایت شیخ کلینیؒ نے حضرت امام محمد باقر -کے حوالے سے نقل کی ہے۔

۲۔ دورِ خلافت عثمان میں جب عبداللہ بن عامر کریز نے خراسان فتح کیا تو اس نے یزدجرد کی دو بیٹیوں کو اسیر کر کے خلیفۂ وقت کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ انہوں نے ایک بیٹی کو امام حسنؑ کے عقد میں دے دیا اور دوسری کو امام حسینؑ کے۔

۳۔ حضرت علیؑ نے اپنے دورِ خلافت میں حریث بن جابر کو شرقی ایران کا والی بنایا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے یزدجرد بن شہریار کی دو بیٹیوں کو آپؑ کی خدمت میں روانہ کیا آپؑ نے شاہ زنان کو امام حسینؑ کے اور دوسری بیٹی کو محمد ابن ابی بکر کے عقد میں دیا۔

نقد و تحقیق

اب ہم ان تینوں اقوال پر ترتیب وار نقد و تجزیہ پیش کرینگے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آسکے:

(۱۔۱) حضرت عمرؓ کے زمانے میں یزدجرد بقید حیات تھا اسکا قتل سنہ ۳۰ ہجری میں ہوا یعنی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کے بعد لہٰذا خلافت ثانی کے دور میں اس کی بیٹیوں کے اسیر ہونے کی خبر صحیح نہیں ہو سکتی۔

(۱۔۲) ایران سنہ ۱۷ ہجری میں فتح ہوا اس وقت تک امام حسین -سن بلوغت کو نہیں پہنچے تھے۔ آپ کا سن ولادت سنہ ۴ ہجری ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ فتح ایران کے وقت آپ کی عمر کل تیرہ برس تھی محمد بن ابی بکر تو اور بھی چھوٹے تھے۔ انکا سن ولادت سنہ ۱۰ ہجری ہے۔ گویا فتح ایران کے وقت وہ کل سات برس کے تھے۔ پس ثابت ہوا کہ فتح ایران کے موقع پر امام حسینؑ اور محمد بن ابی بکرؓ دونوں کم سن تھے اور انکے عقد زواج کا کوئی امکان نہیں تھا۔

(۱۔۳) اس واقعہ کے حوالے سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مال غنیمت صرف جنگ میں شریک ہونے

والوں کیلئے ہوتا ہے یا دوسرے لوگوں کا بھی اس میں حق ہے؟ اس سلسلہ میں نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۳۲ میں مولا علیؑ فرماتے ہیں کہ: ''مال غنیمت صرف جنگ میں شریک ہونے والوں کیلئے ہے۔'' علاوہ ازیں مال غنیمت کی منصفانہ تقسیم کے حوالے سے یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا اس جنگ کے نتیجہ میں حاصل شدہ غنیمت میں سے سب کو ایک ایک کنیز یا اس کے برابر کوئی چیز ہی ملی تھی؟

(۴۔ا) تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ امام حسینؑ کے فرزند رشید امام سجاد -سنہ ۳۸ ہجری میں پیدا ہوئے۔ بعض کتب میں تصریح کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ آپؑ اپنے جد بزرگوار حضرت علی بن ابیطالب -کے دورِ خلافت میں پیدا ہوئے اور آپ نے دو سال تک ان کی معیت میں زندگی گزاری۔

کتاب ''روضۃ الواعظین'' صفحہ ۲۲۲ ''بحار انصار'' صفحہ ۵۲ ب ''تحفۃ الراغب'' صفحہ ۱۳ ''فصول المہمہ'' صفحہ ۲۱۲ اور ''کشف الغمہ'' میں آپ کی ولادت کی تاریخ ۵ شعبان المعظم سنہ ۳۸ ہجری یا وسط جمادی الاول نقل ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ شاہ زنان دورِ خلافت عمرؓ میں امام حسینؑ کی زوجیت میں آئی تھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی شادی اور تولد اولاد میں بیس (۲۰) اکیس (۲۱) سال کا فاصلہ ہے۔ یہ بات قرین قیاس کے خلاف ہے۔ اگر بچہ جنم دینے کے تمام تقاضے پورے ہوں' کوئی خارجی و شخصی موانع بھی حائل نہ ہو' اس کے باوجود عروسی کے بعد طویل عرصہ تک اولاد کا نہ ہونا لوگوں کے ذہنوں میں متعدد سوالات کو جنم دیتا ہے۔ لیکن امام حسینؑ اور شاہ زنان کے بارے میں نہ کوئی ایسا سوال پیش آیا اور نہ ہی کسی نے از خود اس تاخیر کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ قول درست نہیں ہے۔

(۵۔ا) حضرت عمر کے دورِ خلافت میں فتح ایران کی جنگ مدائن میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں یزدجرد اور اس کا خاندان میدان جنگ میں موجود نہیں تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ عقب میں رہے اور جنگ شروع ہوتے ہی مدائن سے نکل کر قم' کاشان' اصفہان اور مرو سے ہوتے ہوئے مشہد پہنچ گئے۔ چنانچہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے خاندان کا کوئی فرد قتل یا گرفتار بھی نہیں ہوا۔

(۶۔ا) اس قول میں نقل ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اگر بادشاہ کی بیٹی اسیر ہو جائے تو اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کی کیا سند ہے؟ آیا اس مسئلہ کی کوئی شرعی بنیاد موجود ہے؟ کیا آیات قرآنی اور سیرت پیغمبرؐ سے یہ بات ثابت ہے؟ نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں کوئی سند نہیں ملتی۔ اس کے برخلاف قرآن کریم کی کئی آیات میں خداوند عالم نے عزت و شرف کو اپنے لئے مخصوص قرار دیا ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ عزت' اللہ' رسول اور مومنین کیلئے ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۱۳۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فان العزة لله جميعاً﴾ ''عزت تو ساری کی ساری خدا کیلئے ہے''

سورۂ فاطر آیت ۱۰:

﴿من كان، يرد العزة فللّٰه العزة جميعا﴾

''جو شخص عزت چاہتا ہے تو ساری کی ساری عزت خدا ہی کیلئے ہے''۔

سورۂ یونس آیت ۶۵:

﴿انّ العزة لله جميعاً﴾ ''تمام تر عزت اللہ ہی کیلئے ہے''۔

سورۂ منافقون آیت ۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿والله العزة ولرسوله وللمومنين ولكن المنافقين لايعلمون﴾ ''عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور اس کے رسول اور مومنین کیلئے ہے لیکن منافقین جانتے نہیں ہے''۔

(۷۔ا) یزدجرد ایران کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے آخری دور میں خراسان کو اپنا مرکز بنایا تھا اور سنہ ۳۰ ہجری میں وہیں پر قتل ہوا تھا۔ جبکہ حضرت عمرؓ کے دور میں صرف دو جنگیں لڑی گئی تھیں۔ ایک قادسیہ میں اور دوسری مدائن میں پیش آئی تھی۔ لہٰذا یہ منطق کسی صورت بھی درست نہیں ہے۔

(۲۔ا) دوسرا قول یہ ہے کہ عبداللہ بن عامر کریز نے خراسان فتح کرنے کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو حضرت عثمان ÷ کے پاس بھیجا۔ خراسان سنہ ۳۰ ہجری میں فتح ہوا جبکہ کتاب ''تاریخ اسلام'' اور ''تاریخ المنتظم''

دونوں میں اس دوران کسی لڑکی کے اسیر ہوکر عثمان ÷ کے پاس آنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

بالفرض محال اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ دونوں شہزادیاں حضرت عثمانؓ کے دور میں اسیر ہوکر مدینہ لائی گئی تھیں' تب بھی یہ امر محال ہے کہ خلیفۂ وقت انکو حضرت علی -کے سپرد کردے کیونکہ حضرت علیؑ کے ساتھ انکا جو سلوک رہا ہے' اسکے پیش نظر اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

(۱۔۳) تیسرا قول یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں حریث میں جابر حنفی نے یزدجرد کی دو بیٹیوں کو حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا۔ حضرت علی -نے ایک بیٹی کو حضرت امام حسینؑ کے عقد میں دیا اور دوسری کو محمد بن ابی بکر کے عقد میں۔

آیت اللہ العظمیٰ خوئیؒ نے اپنی کتاب رجال میں حریث بن جابر حنفی کے بارے میں اتنا لکھا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کے انصار میں سے تھے لیکن یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ وہ کسی منصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں بیٹیوں کو حضرت علیؑ کی خدمت میں کب اور کیسے پیش کیا گیا' اسکے متعلق کوئی واضح سند یا تعبیر و توضیح نہیں ملتی۔ لیکن اپنی کتاب میں قاسم بن محمد بن ابی بکر کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ وہ امام سجاد -کے خالہ زاد بھائی تھے اس کی سند میں آپ نے کتاب کافی سے کلینی کی روایت پیش کی ہے۔ آیت اللہ العظمیٰ خوئی ؒ کی اس گرانقدر تحقیق کے بعد ہمیں اس سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہے۔ پس اس مختصری بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ تیسرا قول ہی تاریخی شواہد اور عقل و منطق کی روشنی میں درست معلوم ہوتا ہے۔

علم حدیث و سیر کے دیگر بزرگ علماء بھی اس کی بات پر متفق ہیں کہ امام حسین -کی زوجات میں ایک زوجہ، یزدجرد کی بیٹی شاہ زنان تھیں، جنکے بطن سے امام چہارم حضرت علی بن الحسینؑ سید الساجدین پیدا ہوئے آپؑ کی تاریخ ولادت سنہ ۳۸ ہجری ہے' اس پر بھی تمام مورخین کا اتفاق ہے۔ افسوس کہ آپ کی مادر گرامی انہی ایام میں وفات پا گئیں لہٰذا امام سجاد -کے علاوہ آپ سے کسی اور زوجہ کا ذکر بھی نہیں ملتا ہے ظاہر ہے کہ آپ کے کربلا میں موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی کہیں اسکا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں عزاداری امام حسین -کے حوالے سے جناب شہربانو سے متعلق جو بھی مصائب ذکر کئے جاتے ہیں' تاریخ میں انکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

علی ابن الحسینؑ۔۔۔زین العابدینؑ

آپؑ بانیٔ قیام کربلا کے فرزند رشید ہیں۔ قیام کربلا کے ہر مرحلہ پر آپؑ اپنے پدر گرامی کے ساتھ رہے اور امامؑ کی شہادت کے بعد قیام کربلا کے ہدف کو دوام بخشنے میں آپ کا کردار سرفہرست رہا ہے۔

محققین و ماہرین ارباب سیر و تاریخ لکھتے ہیں کہ امام سجاد -کی والدہ گرامی آپ کی ولادت کے چند دنوں بعد وفات پا گئی تھیں۔ چنانچہ جناب شہربانو کے کربلا میں موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جناب شہربانو سے صرف ایک ہی اولاد کے ہونے کا ذکر ملتا ہے اور وہ امام چہارم' وارث امام حسینؑ ہیں۔ اکثر مؤرخین کے نزدیک' آپ سنہ ۳۸ ہجری یعنی امیر المومنینؑ کے دور خلافت میں پیدا ہوئے۔ آپؑ جناب علی اکبر -سے عمر میں چھوٹے تھے۔ اس بات سے مکتب تشیع کے اس اعتقاد کو تقویت ملتی ہے کہ منصب امامت منصوص من اللہ ہے' کوئی جمہوری منصب نہیں۔ امام کے انتخاب میں تمام مروجہ معاییر و کسوٹیاں جیسے ظاہری حسن و جمال عمر میں بڑا ہونا' وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ خداوند عالم نے اس انتخاب کو اپنی مشیت اور ارادے سے مربوط دکھانے کا غیر معمولی مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

حضرت ھارون -بڑے تھے اور حضرت موسیٰ -ان سے چھوٹے' لیکن موسیٰ -اولوالعزم نبی قرار پائے جبکہ ہارون کو ان کی وزارت ملی۔ اسی طرح امام جعفر صادق -کے بیٹے جناب اسماعیل اور عبداللہ افطح امام موسیٰ بن جعفر -سے بڑے تھے۔ جلال و جمال کے لحاظ سے بھی لوگ امامت کیلئے اسمٰعیل ہی کو مستحق سمجھتے تھے لیکن خدا نے انکو اور دوسرے فرزندان کو چھوڑ کر موسیٰ بن جعفر -کو امامت کیلئے منتخب فرمایا۔ امام زین العابدینؑ کی امامت کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ حضرت علی اکبر جلال و جمال میں مثل پیغمبر تھے اور عمر میں بھی بڑے تھے' لیکن امامت کیلئے امام زین العابدینؑ کو منتخب کیا۔ انتخاب انبیاءؑ اور آئمہؑ کا اختیار ہمیشہ سے خدا کے پاس رہا ہے لہٰذا خداوند عالم نے انبیاءؑ و آئمہؑ کے بارے میں دو طرح کا مؤقف اختیار کیا ہے:

۱۔ انہیں سخت سے سخت دشمنوں اور مخالفوں کے بیچ میں تنہا چھوڑ دیا' جیسا کہ حضرت یحییٰ -اور حضرت زکریاؑ کے ساتھ ہوا۔ خود امام حسینؑ تن تنہا میدان کربلا میں "ھل من ناصر ینصرنا" کہتے رہے' یہاں تک کہ آپؑ

بے یار و مددگار شہید ہوئے۔

۲۔دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان کی ہر طرح سے محافظت فرمائی۔ وہ دشمنوں کی کڑی نظر میں ہوتے تھے لیکن خدا نے ان کو اپنے حفظ میں لئے رکھا جیسا کہ حضرت موسیٰ -فرعون کی تمام تر کوششوں کے باوجود بچ نکلے اور خود فرعون کے گھر میں آپ کی پرورش ہوئی۔ اسی طرح امام زمانؑ کو خلفائے بنوعباس کی تمام تر نگرانی کے باوجود خدا نے اپنی حفاظت میں رکھا۔

امام سجاد -کہیں اثنائے سفر میں نہیں بلکہ کربلا میں شدید مرض تپ میں مبتلا ہوئے جس کی وجہ سے میدان جنگ میں نہیں جاسکے۔ یہ بات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھی جاتی ہے۔

خداوند عالم نے چاہا کہ اس معرکہ کشت وخون اور خوف و دہشت کے عالم میں سلسلۂ امامت کو قطع ہونے سے بچائے۔ لہٰذا چند دنوں کیلئے امام سجادؑ کو بیماری میں مبتلا رکھا تا کہ آپؑ معرکہ کربلا میں امام وقت کا دفاع کرنے سے جو کہ واجب تھا، معذور رہیں اور ادھر اشقیاء کے غیض وغضب اور طیش سے بھی محفوظ رہیں۔

واقعۂ کربلا میں دوسروں کی طرح امام سجاد -کا بھی ایک اہم اور بنیادی کردار ہے، آپ کو بھی معرکۂ کربلا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن آپؑ کے چہرۂ تابناک کو اور آپ کی شجاعت وشہامت اور جرأت گویائی کو بے بسی کا رنگ دے کر رائج عوامی افکار کے قالب میں پیش کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے تا کہ برے عزائم رکھنے والوں کی تمنا پوری ہو اور ادھر سادہ لوح عقیدتمند آپ کی اصل شخصیت اور کردار سے واقف نہ ہو پائیں۔

اس سلسلے میں جو داستانیں وجود میں آئی ہیں ہم یہاں پر ان سے متعلق چند نکات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

۱۔آپ کی تعریف میں دور قدیم سے عصر جدید تک خطباء اور شعراء نے اس عنصر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپؑ ابن الخیرتین تھے یعنی آپ کا نسب پدری حوالے سے آل محمدؐ سے اور مادری نسب شاہ ایران سے ملتا تھا۔ شعراء اور نثر نگاروں نے اپنے اشعار اور تالیفات میں اس بات کو بہت اہمیت دی ہے اور یہی باتیں مختلف انداز میں مجالس عزاء کی زینت بنتی ہیں۔ درحقیقت یہ بھی چہرۂ درخشان ائمہ کو محجوب رکھنے کی ایک کوشش ہے۔

اس صفت کی چنداں کوئی اہمیت نہیں ہے:

(۱۔۱) ہم نے قبائل واشاعیب کی موروثی کو قرآن وروایات اور مزاج اسلامی کے حوالے سے حضرت ام البنین سے متعلق بیان میں ذکر کیا ہے۔ وہاں پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۔۲) یہاں پر شہنشاہیت کو نسب آل محمدؐ اور عترت اطہارؑ کے مقابلے میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ قطعاً غلط ہے۔

(۱۔۳) بادشاہوں کے خاندان میں پیدا ہونے والا ہر شخص صاحب فضیلت نہیں ہوا کرتا ہے۔ خود اہل بیت کی نسل سے ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں جو شرف وفضیلت میں اس خاندان سے مناسبت نہیں رکھتے تھے بعض مذموم عزائم رکھنے والوں نے شہنشاہیت کو آل محمدؐ کے مقابلے میں لانے کیلئے ایسی کہانیاں گھڑی ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں کے نوابوں اور چودھریوں نے اپنی نسل کو نبی حضرت یوسفؑ سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کو حسن وجمال حضرت یوسفؑ سے وراثت میں ملا ہے حالانکہ ان سے کہیں زیادہ حسن وجمال کے حامل لوگ گزرے ہیں، جو ان کے خاندان سے نہیں تھے اور انہیں کے خاندان میں بہت سے بدشکل لوگ بھی گزرے ہیں لہٰذا شہنشاہیت اور خاندانی پس منظر عنصر ایمانی کے بغیر کوئی مقام وحیثیت نہیں رکھتے۔

جو منزلت مادر امام سجاد -کو حاصل تھی، وہ دیگر ائمہ کی مادران گرامی کو بھی حاصل تھی اور ان سب کو یہ فضیلت اس بیت شرافت میں پہنچنے کے بعد، قرآن وسنت اور سیرت اہل بیتؑ پر عمل پیرا ہونے پر ہی ملی تھی۔

۲۔امام سجاد -کو میدان کربلا میں شہید ہونے سے محفوظ رکھنے کی خاطر خدا نے وقتی طور پر بیماری میں مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن لوگوں کو رلانے کیلئے قصہ ساز انہیں ایک ایسے مریض اور ناتوان انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو عمر بھر بیمار رہا ہو۔ اسی طرح دوران اسیری ان سے متعلق ایسے ایسے مصائب کا ذکر کیا جاتا ہے جنکا حقیقت وواقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ سب کچھ صرف لوگوں کو رلانے کیلئے کیا جاتا ہے۔

۳۔امام سجاد -گرچہ واقعہ کربلا کے شاہد وراوی اور اہداف ومقاصد امام حسینؑ کے ترجمان گزرے ہیں، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آپؑ چالیس سال تک مسلسل دن رات صرف امام حسینؑ کی مصیبت میں روتے

رہے ۔امام سجاد - حجت خدا تھے اور جانتے تھے کہ بہترین رونا خوف خدا میں رونا ہے ۔چنانچہ اس رونے کیلئے آپؑ جو مرثیے پڑھتے تھے' اس کا مجموعہ وہ دعائیں ہیں جو آج ہمارے پاس "صحیفہ سجادیہ" کے نام سے معروف ہے ۔ خدا کے حضور میں انہی سجدوں اور عباداتوں کے سبب آپؑ سید الساجدین اور زین العابدین کہلائے ۔

آپ کو تاج البکائین کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ صرف امام حسینؑ پر ہی روتے تھے ۔حقیقت یہ ہے کہ آپؑ خوف خدا میں زیادہ روتے تھے ۔لہٰذا ایسی باتیں آپ کے متوجہ بہ الی اللہ رہنے کی حقیقت سے لوگوں کی نظروں کو ہٹانے کی مذموم کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے ۔

قضاعیہ

مؤرخین امام حسینؑ کی زوجات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ آپ کی ایک زوجہ کو قضاعیہ کہتے تھے قضاعیہ ،خود انکا نام نہیں بلکہ انکے قبیلہ کا نام تھا اور اسی نسبت سے انہیں قضاعیہ کہا جاتا تھا ۔کتاب "نہایۃ الارب" کے صفحہ نمبر ۳۵۸ پر رجال نمبر ۱۴۶۰ میں قضاعہ کے نسب کا ذکر یوں ملتا ہے: بنوقضاعہ بن مالک بن عمرو بن مرہ بن زید بن مالک بن حمیر ۔چنانچہ بنوقضاعیہ قبیلہ کا نام ہے ۔

رجال نمبر ۸۱۴ میں لکھا ہے کہ حمیر کا تعلق قبیلہ بنوسبا قحطانیہ سے تھا ۔لیکن کسی بھی کتاب میں نہ تو ان خاتون کا نام ملتا ہے اور نہ ان کے والد کا نام ۔صرف اتنا معلوم ہے کہ امام حسینؑ کی زوجات میں ایک کو قضاعیہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔لکھا ہے کہ انکے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جسکا نام جعفر تھا' جو بعد میں انتقال کر گیا تھا ۔

عماد زادہ کتاب "زندگانی امام حسین" میں لکھتے ہیں کہ شاید آپؑ کی یہ زوجہ کربلا میں موجود تھیں ۔لیکن انکی یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ان کا ذکر نہ شہادت سے پہلے کہیں ملتا ہے' نہ شہادت کے بعد' نہ اسارت کے ایام میں اور نہ مدینہ واپسی پر ۔چونکہ اس بات کی کوئی سند نہیں ،لہٰذا ایک بے سند امکان پر کوئی بات کرنا بے سود ہی ہوگا ۔

اُمّ اسحاق

اُم اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بنوتیم بن مرۃ کے بارے میں کُتب تاریخ و رجال میں ہے کہ یہ خاتون پہلے امام حسنؑ کے عقد میں تھیں ۔امام حسنؑ نے اپنی شہادت کے وقت امام حسینؑ سے وصیت فرمائی کہ اس خاتون کو میرے بعد اپنے عقد میں لے لینا' جس پر امام حسینؑ نے عمل کیا اور آپؑ کی اس زوجہ سے فاطمہ (صغریٰ) پیدا ہوئیں ۔

تاریخی نقول و اسناد پر کُلی طور پر عقل کی حکومت نہیں چلتی ۔جس بات کو تمام ارباب سیر و تاریخ نے نقل کیا ہو' اسے یکسر مسترد کرنا فقط امکان سے باہر ہی نہیں بلکہ ایسا کرنا متکبرانہ عمل بھی متصور ہوگا ۔لیکن اگر ایک تاریخی سند کا کسی دوسری تاریخی سند سے ٹکراؤ اور تصادم ہو اور کسی ایک روایت سے دستبردار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو ایسی صورت میں جو روایت زیادہ ضعیف اور کمزور ہو اسے نظر انداز کرنا ضروری اور لازمی ہو جاتا ہے ۔

امام حسینؑ کی حیات طیبہ میں' آپ کی زوجات اور اولاد سے متعلق ایک پیچیدہ مسئلہ آپ کی بیٹی جناب فاطمہ صغریٰ اور اُن کی مادر گرامی کا ہے ۔

ایک طرف کتب سیر و تاریخ اور مقاتل میں موجود یہ مسلمہ حقیقتیں ہیں :۔

۱۔ فاطمہ صغریٰ اخلاق کریمہ کی حامل تھیں ۔

۲۔ عمر میں جناب سکینہؑ سے بڑی تھیں ۔

۳۔ سنہ ۶۱ ہجری میں سانحہ کربلا کے موقعہ پر اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کربلا میں تھیں ۔اس وقت آپ کی عمر سن بلوغت سے گزر چکی تھی ۔

۴۔ حضرت امام حسینؑ نے شہادت سے پہلے امام سجاد - کے بیمار ہونے کے سبب امامت سے متعلق کچھ امانتیں آپ کے سپرد کی تھیں تاکہ ایام اسارت کے گزرنے کے بعد یہ امانتیں امام سجاد - تک پہنچ جائیں ۔

۵۔ امام سجاد - اور حضرت زینبؑ کے بعد آپ نے بازار کوفہ میں اہل کوفہ سے خطاب فرمایا اور اہل بیتؑ کا دفاع کیا ۔

یہ تمام روایتیں جناب فاطمہ صغریٰ کو یک بالغ، مدبرہ، پُرحکمت' امین' نڈر' جرأتمند اور بے باک شخصیت کے طور

پر پیش کرتی ہیں۔

دوسری طرف اہل تاریخ و مقاتل کے یہ بیانات ہیں:

۱۔ کتاب "ادب الطف" جلد ۱ صفحہ ۲۶ پر خطیبِ توانا علامہ سید جواد شبر علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات سنہ ۱۱۰ ہجری میں ہوئی۔

۲۔ اسی صفحہ پر کتاب "نفس المہموم" سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جناب فاطمہ صغریٰ نے سنہ ۱۱۷ ہجری میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت سکینہ نے بھی اسی سنہ میں وفات پائی تھی۔

۳۔ اسی کتاب میں صفحہ ۱۵۹ پر "اعیان الشیعہ" سے نقل ہے کہ جناب سکینہ نے ۵ ربیع الاول سنہ ۱۱۷ ہجری کو مدینہ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر پچھتر سال تھی۔

ان بیانات کا تجزیہ کرنے پر مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ اگر ہم جناب فاطمہ صغریٰ کی عمر وقت وفات ستر سال اور آپ کا سنِ وفات ۱۱۰ ہجری یا ۱۱۷ ہجری تسلیم کر لیں تو اس حساب سے آپ کا سن ولادت سنہ ۴۰ یا ۴۷ ہجری بنتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ سنہ ۶۱ ہجری میں سانحہ کربلا کے وقت پہلے قول کی رو سے آپ کی عمر ۲۱ سال اور دوسرے قول کی رو سے ۱۴ سال تھی۔

۲۔ اگر جناب سکینہ کی عمر وقت وفات ۷۵ سال تھی اور آپ کا سن وفات ۱۱۷ ہجری ہے تو آپ کا سن ولادت سنہ ۴۲ ہجری ہوا۔ اس حساب سے جناب سکینہ کی عمر معرکہ کربلا کے وقت ۱۹ سال بنتی ہے۔

۳۔ جناب سکینہ جو عمر میں آپ سے چھوٹی تھیں اور جسے سب تسلیم کرتے ہیں' زیادہ تر اہل تاریخ کے نزدیک ان کا سن ولادت سنہ ۴۷ ہجری ہے اور اس حساب سے جناب سکینہ کا سن معرکہ کربلا کے وقت ۱۴ سال بنتا ہے۔

تیسری طرف کتب تاریخ و رجال میں یہ بیان ہے کہ مادر جناب فاطمہ صغریٰ' جناب ام اسحٰق' پہلے امام حسن۔ کے عقد میں تھیں اور بعد شہادتِ امام حسن۔ آپکی وصیت کے مطابق امام حسینؑ کے عقد میں آئیں۔ اس قول کے تجزیہ سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

(ا) سیرتِ امام حسن۔ پر لکھی گئی کتابوں میں آپ کی شہادت کی تاریخ سنہ ۴۹ ہجری یا سنہ ۵۰ ہجری یا سنہ ۵۱

ہجری بتائی گئی ہے۔ اگر بالفرض جناب ام اسحٰق وقت عدت گزارنے کے فوراً بعد بھی امام حسینؑ کے عقد میں آئیں تو اس حساب سے حضرت فاطمہ صغریٰ کی کربلا میں زیادہ سے زیادہ عمر ۸ سال اور ۹ مہینے اور دس سال اور نو مہینے کے درمیان بنتی ہے۔ اگر ہم اس قول کا اعتبار کرتے ہیں تو جناب فاطمہ صغریٰ کی عمر جناب سکینہ سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ پھر ہمیں اس بات سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا کہ فاطمہ صغریٰ حامل امانت تھیں اور اسی طرح آپ کے بازار کوفہ میں خطبہ دینے کو بھی نظر انداز کرنا پڑے گا۔ جبکہ کسی نے بھی فاطمہؑ صغریٰ کے کربلا میں کم عمر ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔

(۲) امام حسنؑ کے وصیت نامہ میں کوئی ایسا فقرہ نہیں ملتا کہ جس میں آپؑ نے امام حسینؑ سے وصیت کی ہو کہ اُم اسحٰق کو میرے بعد اپنے عقد میں لے آنا۔ اگر ایسا کرنا ہی ہوتا تو جناب قاسم اور عبداللہ کی والدہ کے بارے میں وصیت کرتے چونکہ وہ دونوں عمر میں چھوٹے تھے اور سرپرستی کے محتاج تھے۔ اس اعتبار سے ان کی والدہ کو عقد میں لانا زیادہ مناسب تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی یہ وصیت ایک بامعرفت خاتون ہونے یا آپ سے عشق و محبت رکھنے کے حوالے سے تھی تو حسن مثنیٰ کی والدہ منظور فرازیہ زیادہ سزاوار تھیں' ان کے بارے میں وصیت فرماتے؟

(۳) جناب اُم اسحٰق کے کربلا میں موجود ہونے سے متعلق تاریخ و مقاتل کی کسی بھی کتاب سے کوئی سند نہیں ملتی ہے۔

ان منقولات کا ایک دوسرے سے موازنہ و مقابلہ کرنے کے بعد یا تو خود وجود فاطمہ صغریٰ سے دستبرداری اختیار کرنا پڑے گی جو مسلمہ طور پر کربلا میں موجود تھیں اور جناب حسن مثنیٰ کے عقد میں تھیں یا پھر فاطمہ صغریٰ کی مادر گرامی اُم اسحٰق بنت طلحہ کے امام حسنؑ کے عقد میں ہونے سے منکر ہونا پڑے گا اور پھر یہ ماننا پڑے گا کہ آپ کی والدہ محترمہ ابتداء ہی سے امام حسینؑ کے عقد میں تھیں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے پیچیدہ مسائل حیات امام حسینؑ میں شامل ہیں جو ایک معما بنے ہوئے ہیں۔ کسی محقق کیلئے ان مسائل پر اپنی تحقیق کے نتائج کا ذکر کرنا' ہمارے معاشرے میں سبب موت و حیات بنا ہوا ہے لہٰذا وہ دو راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ یا تو وہ صفحات تاریخ کو نظر انداز کر کے صرف عوام کی آواز

کو سنے اور وہی کچھ بیان کرے جو عوام سننا چاہتے ہیں اور یا پھر ان سماعتوں کے خلاف متونِ تاریخ میں موجود حقائق کو سامنے لا کر عوامی ردِّ عمل کا سامنا کرے۔ ان دونوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا گزیر حقیقت ہے۔

جدّہ سادات حسنی

ارباب تحقیق و تدقیق کے نزدیک معتبر و مستند سمجھی جانے والی کتب تاریخ و سیر: جیسے "اعلام الوریٰ" صفحہ ۲۵۰، "المنتہیٰ" جلد اول صفحہ ۱۷۷، کتاب "الارشاد" شیخ مفید صفحہ ۲۵۳، "کشف الغمہ" جلد ۲ صفحہ ۲۴۸، "تذکرۃ الخواص" صفحہ ۹۸ میں حضرت امام حسینؑ کی دو ہی بیٹیوں کا ذکر آیا ہے۔

۱۔ فاطمہ صغریٰ بنت ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبداللہ التیمی

۲۔ سکینہ بنت رباب۔

کچھ غیر مستند کتابوں میں اختلاف کے ساتھ بعض نے زینب نامی بیٹی اور بعض نے رقیہ نامی بیٹی کا ذکر کیا ہے، جبکہ بعض نے سب کو ملا کر کل چار بیٹیوں کے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ کسی بھی معتبر یا غیر معتبر کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ امام حسینؑ کی فاطمہ نامی دو بیٹیاں تھیں۔

امام حسین ؑ کی یہ بیٹی 'صغریٰ' کے نام سے مشہور اس لئے نہیں ہیں کہ آپ کی فاطمہ نامی اور بیٹیاں بھی تھی اور یوں اس سے چھوٹے بڑے کا امتیاز مقصود تھا بلکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کی توجیہ علمائے تاریخ و انساب یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زہرا = سے امتیاز رکھنے کی خاطر آپ صغریٰ کے نام سے مشہور ہوئیں۔

شیخ مفید علیہ الرحمہ، علامہ محسن امینؒ، شیخ عباس قمی اور دیگر ارباب سیر و تاریخ کے نزدیک اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ فاطمہ بنت الحسینؑ حضرت امام حسن ؑ مجتبیٰ کے فرزند رشید حسن ابن حسن معروف بہ مثنیٰ کے عقد میں تھیں اور آپ سفر کربلا میں اپنے شوہر سمیت، اپنے والد گرامی امام حسین ؑ کے معیت میں تھیں۔

بعض تاریخی تجزیہ نگاروں کے نزدیک آپ مدینہ سے کربلا سفر کے دوران جناب حسن مثنیٰ کے عقد میں آئی تھیں آپ کے شوہر گرامی جناب حسن مثنیٰ جب کربلا میں زخمی ہوئے تو لشکر اعداء میں موجود ان کے کچھ مادری رشتہ داروں کی سفارش پر ان کو علاج و معالجہ کیلئے کوفے لے جایا گیا جہاں سے صحت یاب ہو کر وہ واپس مدینہ آ گئے۔

اولادِ امام حسن ؑ جنہیں حسنی کہا جاتا ہے، حکومت بنو امیہ اور بنو عباس سے برسرِ پیکار رہی تھی۔ ان میں سے برجستہ ترین شخصیت جناب حسین فخ کی ہے جو امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، نسل آل علیؑ میں امام حسین ؑ کے بعد دوسرے سید الشہداء تھے۔ پس جناب فاطمہ صغریٰ جدّہ سادات حسنی ہیں۔

آپ کی جرأت و شہامت کی ایک جھلک یہ ہے کہ آپ نے دربار شام میں یزید سے اس لہجہ میں بات کی:

"اے یزید! کیا تو آلِ رسولؐ کو اسیر کر کے نہیں لایا"

ان تمام تاریخی اسناد کے مسلمہ ہونے کے بعد جناب فاطمہ صغریٰ کا کربلا میں موجود ہونا ایک ایسی حقیقت نظر آتی ہے جس پر تمام تاریخ مقاتل متفق ہیں۔

ہمیں آپ کی باعفت و بابرکت شخصیت پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ آپ بھی اپنی بہن جناب سکینہ کی مانند مظلومہ ہیں۔ دوست و دشمن دونوں نے مختلف انداز میں آپ کی طہارت و پاکیزگی کو داغدار کرنے کی جسارت کی ہے۔ آپ کو معنویت و عرفانیت کی منزل سے گرانے اور بازار کوفہ میں دیئے گئے آپ کے دندان شکن خطبوں کو نظر انداز کرنے کی غرض سے خاندان عصمت و طہارت کے دیگر افراد کی طرح آپ کے متعلق بھی کہانیاں گھڑی گئی ہیں۔

اسی طرح آپ کی بہن جناب سکینہ کی برجستہ شخصیت پر نامناسب اور نالائق افراد کو بطور شوہر انتخاب کرنے کے الزامات عائد کر کے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابوالفرج اصفہانی نے اپنی کتاب میں امام حسینؑ کی ان دو عزیزہ اور مکرمہ بیٹیوں کو نامناسب اور نازیبا نسبتیں دی ہیں، جو دشمنوں کے اہل بیت کے خلاف پروپیگنڈے کی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ ابوالفرج نے زبیر بن بکار سے اور اس نے مصعب سے نقل کیا ہے کہ جناب فاطمہ نے حسن مثنیٰ کی وفات کے بعد عبداللہ بن عمر عثمان بن عفان سے اور اسکے بعد عبدالرحمٰن ضمیری سے شادی کی۔ مصعب اور زبیر بن بکار دشمنان اہل بیت میں سے تھے اور انہوں نے اسی دشمنی میں یہ روایتیں جعل کی ہیں۔ جہاں دشمنوں نے دشمنی میں یہ حرکتیں کی ہیں، وہاں دوستوں نے بھی آپ کی جہادی خدمات، مصائب پر کمال صبر و تحمل اور دشمن کو دیئے جانے والے

دندان شکن خطبوں کو سامنے لانے کی بجائے' آپ کو وہم و خیال میں غرق ایک عام سی موہومہ لڑکی کی صورت میں کچھ اس طرح سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

آپ کے والد گرامی آپ کو انتہائی بے توجہی کے ساتھ بیماری و بے بسی کی حالت میں' شہر مدینہ کے ویران گھر میں جناب ام سلمٰی کے سپرد کر کے' آپ سے یہ وعدہ کر کے نکلے کہ ''اگر شہر کوفہ میں ہماری حالت بہتر ہوئی تو ہم علی اکبر کو تمہیں لینے کیلئے بھیجیں گے'' یا بقول بعض افسانہ پردازوں کے ''علی اکبر کی شادی کیلئے ہم آپ کو لینے آئیں گے۔

جناب علی اکبرؑ کہ جن کی عمر امام سجادؑ سے بھی چار سال زیادہ ہے' امام سجادؑ کی شادی ہو کر امام محمد باقرؑ کو پیدا ہوئے بھی تین سال ہو چکے ہیں لیکن یہاں جناب علی اکبرؑ کی شادی کا عندیہ دیا جا رہا ہے۔ الغرض امامؑ یہ کہہ کر مدینہ سے نکلے اور اپنی اس بیمار بیٹی سے جو وعدہ کیا تھا' قیام مکہ تک کے اگلے پانچ مہینوں میں امام حسینؑ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ بالآخر یہ بیمار بیٹی داغ جدائی اور فرقت میں بے ساختگی و بے بسی کے عالم میں' کبھی ہوا اور پرندوں سے خطاب کرتی اور کبھی چوراہوں پر بیٹھی رہتی۔ خاندان عصمت سے تعلق رکھنے والی اس بیٹی سے منسوب یہ کہانیاں ذیل کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں:

۱۔ کتاب ''ریاض القدس'' جو درحقیقت قادیت سے خالی نظر آتی ہے۔

۲۔ کتاب ''معالی السبطین'' جس میں سبطین کے درجات کو گرانے والے قصے بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ کتاب ''ریاحین الشریعہ'' جس سے شریعت کی بو ہرگز نہیں آتی ہے کیونکہ اس میں جھوٹ زیادہ ہے۔

۴۔ کتاب ''اسرار الشھادۃ'' جو شہادت امام حسینؑ کو بے اسرار بنانے کی خاطر لکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔

کتاب ''ریاض القدس'' جلد ۲ صفحہ ۱۱۶ پر العھدۃ علی الراوی کے عنوان سے کتاب ''مفتاح البکا'' سے نقل ہے:

''امام حسینؑ کی ایک بیٹی فاطمہ نام کی تھیں۔ وہ امامؑ کے مدینہ سے نکلتے وقت مرض تپ میں مبتلا تھیں۔ اس وجہ سے آپؑ انہیں ساتھ نہیں لے گئے۔ ان کو جناب ام سلمٰی کے سپرد کیا اور یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ صحت مند ہو گئیں اور اہل کوفہ نے بے وفائی نہ کی تو میں علی اکبر کو لینے کیلئے بھیجوں گا۔ یہ مخدرہ ہمہ وقت اپنے بابا' برادر و خواہران

کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں اور خون کے آنسو بہاتی تھیں۔ اس طرح ان کی بیماری میں شدت آتی گئی ضعف و نقاہت میں اضافہ ہوتا رہا۔ کبھی دروازے کے سامنے سے گزرنے والوں سے خبر لیتی تھیں کہ شاید بابا حسین اور بھائی علی اکبر کی خبر مل جائے اور کبھی چوراہوں سے گزرنے والے قافلوں سے پوچھتی تھیں' لیکن کسی سے بھی کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔ جب کچھ مدت گزر گئی' حزن و ملال میں اور اضافہ ہوا، نہ بھائی لینے کیلئے آیا اور نہ کوئی پیغام آیا تو مایوس ہو کر گوشہ عزلت اختیار کی۔ گھر کے کونے میں بیٹھ کر نالہ و فغاں کرتی تھیں اور بار بار یہ کہتی تھیں کہ میں وطن میں بے وطن ہوں' میرے جد کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے۔ اپنے بابا سے خطاب کر کے کہتی تھیں کہ آپ لوگ تو کربلا گئے اور کبھی آپ کے فتور شریف میں یہ نہیں آیا کہ آپکی کوئی بیمار لڑکی بھی ہے جسے مدینہ میں چھوڑ آئے ہیں۔ ایک دن اسی عالم میں خود کو مخاطب کر کے بولیں چلو چل کے چوراہے پر بیٹھتے ہیں' اگر بابا کی خبر نہ ملی تو میں خود ایک خط بابا کے نام بھیجوں گی' اس میں جدائی کی داستان لکھوں گی۔ شاید اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہو جائے۔ اپنے خون جگر سے ایک عریضہ اس مضمون کا لکھا: ''بابا! کب تک میں کہتی رہوں گی کہ بابا نہیں آئے''۔ غرض اس خط کو لکھ کر فاطمہ پھر بابا کے فراق میں گریہ و زاری میں مشغول ہو گئیں۔

اس دوران ایک عرب شتر سوار اس گھر کے دروازے کے پاس سے گزرا۔ اس نے سنا کہ اندر ایک خاتون اس طرح سے فریاد کر رہی ہیں' جس طرح موسیقار روتا ہے۔ شتر کو مہار کیا اور اس خاتون کی احوال پرسی کی غرض سے نیچے اتر آیا۔ شتر سوار نے سمجھ لیا کہ یہ آہ و فغاں امام وقت کے فراق میں ہو رہا ہے۔ بیٹی اپنے بابا کی جدائی میں رو رہی ہے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا' سلام کیا اور کہا کہ میں غریب آدمی ہوں' بادہ نشین ہوں اور کربلا جانے والا ہوں۔ آپ کے بابا کیلئے کوئی پیغام ہو تو بتا دیجئے۔ کربلا کا نام سن کر فاطمہ صغریٰ نے عرب شتر سوار کو سلام کا جواب دیا اور اسے بتلایا کہ میں فاطمہ بنت الحسینؑ ہوں۔ میرے بابا' سلطان مکہ و مدینہ کربلا گئے ہیں۔ میں اس وقت بیمار تھی' اس لئے مجھے لیکر نہیں گئے۔ اس وقت سے اب تک میں صبح و شام گریہ و زاری کر رہی ہوں۔ اس وقت بیماری نے میری طاقت مجھ سے چھین لی ہے۔ میرا یہ عریضہ میرے بابا تک پہنچا دو۔ میں تمہارے حق میں دعا کرتی ہوں۔ عرب شتر سوار نے عرض کی' آپ اپنا عریضہ دے دیں۔ فاطمہ نے خط بھی دیا

اور زبانی پیغام بھی۔ ہر ایک کے نام شکوے شکایات بھی اس کو زبانی سنائے ۔ اس کے بعد یہ عرب شتر سوار کربلا کی طرف روانہ ہو گیا۔

صاحب مفتاح لکھتا ہے: "معلوم نہیں یہ عربی مُلک تھا یا بشر' کیونکہ اس کو پتہ تھا کہ امام حسینؑ اس وقت کربلا تشریف لے گئے ہیں۔ اتنی جلدی کوئی بشر تو کربلا نہیں پہنچ سکتا ہے، یقیناً یہ ملک ہوگا اس عریضہ کو چونکہ جلدی پہنچانا مقصود تھا تا کہ امام حسینؑ کی مصیبت میں اضافہ ہو جائے اسلئے خدا نے ملک کو بھیجا۔

جب یہ شتر سوار اگلے روز کربلا پہنچا تو امام حسینؑ میدان جنگ میں تھے اور کی نداد ے رہے تھے' لیکن لبیک کہنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس دوران امامؑ نے دیکھا کہ مدینہ کی طرف سے کوئی سوار آ رہا ہے۔ جب نزدیک پہنچا تو امام -کو سلام کیا اور صغریٰ کا خط دیا۔ امامؑ نے خط کھول کر دیکھا' پتہ چلا بیمار بیٹی کی طرف سے ہے۔ امامؑ پر بے حد گراں گزری۔ خط کو لیکر خیمے میں تشریف لے گئے اور بلند آواز سے فرمایا: یا ام کلثوم، یا سکینہ، یا رباب! تم سب کو بشارت ہو، فاطمہ صغریٰ کا خط آیا ہے۔ آپ نے خط پڑھنا شروع کیا اور اہل بیت نے فریاد کی۔ بعض نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ اس خط کو لیکر نعش اکبر پر گئے اور خطاب کیا اکبر اٹھو! بہن صغریٰ کا خط آیا ہے" آپ نے خط پڑھ کر اکبر کی نعش کو سنایا۔ خط میں لکھا تھا "مریضہ ضعیفہ کی طرف سے"۔

صاحب کتاب لکھتے ہیں: نہیں معلوم امام حسینؑ نے خط کا جواب دیا یا نہیں، لیکن اگلے دن فاطمہ کو ایک پرندے نے شہادت امامؑ کی خبر دی جو اپنے آپ کو خون حسینؑ میں لت پت کر کے یہ خبر مدینہ لیکر آیا تھا اور اس نے امام کے گھر کی چھت سے خون کے قطرات نیچے ٹپکائے۔

فاطمہ نے جب اس پرندے کی آواز سنی تو اپنے بستر سے اٹھیں حجرے تک آئیں اور گریہ شروع کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ جب خون کے قطرے نیچے گرے تو ایک قطرہ فاطمہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک یہودی نابینا لڑکی کی آنکھ میں چلا گیا جس سے اس کی بینائی بحال ہو گئی"۔

اس افسانے پر اپنا نقد و تجزیہ پیش کرنے سے قبل ہم عزاداران امام حسین -کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امام حسین -کی مظلومیت کے بیان کیلئے خود امامؑ کے خطبوں' بازار او ر دربار کوفہ و شام میں

جناب زینبؑ او ر سید سجاد -کی دلسوز تقریروں اور جناب فاطمہ صغریٰ کے خطبے' سب کو طاق نسیان میں رکھ کر آپ نے ان افسانوں پر مرثیے اور نوحے انشاء کیئے ہیں' اس کی آخر کیا منطق ہے؟ جس مذہب کی حقانیت عقل اور دلیل و برہان پر قائم ہو، جس پر اسکے علماء اور دانشمندوں کو فخر و ناز ہو' اس مذہب کو افسانوں میں پیش کرنے اور ان افسانوں پر انشاء کئے گئے مرثیوں پر رونے اور نوحوں پر سینہ زنی کرنے سے بڑی مصیبت اہل بیت کیلئے' نیز امام زمانہ کیلئے اور کیا ہو سکتی ہے!؟؟

یہ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ علماء بھی اس کو غلط کہنے کی اجازت نہیں دیتے' اس کے خلاف آواز اٹھانے کو دین و مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس کو زندہ رکھنے کے حق میں ہیں۔ ہم آخر کس مصیبت پر روئیں' اہل بیت کرام سے منسوب کی جانے والی ان جعلی کہانیوں پر گریہ کریں یا ان کہانیوں کو مذہب اہل بیت کے فروغ کا سبب گردانے والے کرداروں کی عقل کا ماتم کریں؟۔

نقد و نظر

۱۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ تمام معتبر و موثق کتب تاریخ میں حضرت امام حسینؑ کی فاطمہ نامی صرف ایک ہی بیٹی کا ذکر آیا ہے۔ وہ آپ کے ہمراہ کربلا میں تھیں' حسن مثنیٰ کے عقد میں تھیں اور انہی سے نسل امام حسنؑ پھیلی ہے۔ اس کے علاوہ کسی فاطمہ نامی بیٹی کا ذکر' سوائے افسانہ پردازوں کے افسانوں کے، کہیں نہیں ہے۔

۲۔ حضرت امام حسینؑ کے خروج مدینہ سے متعلق واقعات میں' تاریخ کے صفحات پر کسی فاطمہ نامی بیٹی کو مدینہ میں وعدہ دے کر چھوڑ آنے کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ بالفرض اگر فاطمہ مریضہ تھیں' تب بھی جب امام حسینؑ اس شہر سے مایوس ہو کر نکل رہے تھے تو اس بیٹی کو تنہا چھوڑ کر نکلنے کی کوئی منطق نہیں بنتی۔ یہ خلاف شفقت و محبت پدری ہے کہ ایک باپ اپنی بیمار بیٹی کو اس طرح سے چھوڑ کر جائے' جبکہ سارے اہل و عیال' یہانتک کہ شیر خوار بچے بھی ہمراہ جا رہے ہوں۔

۴۔ فاطمہ اگر بیمار تھیں اور کسی سواری پر سوار نہیں ہو سکتی تھیں تو کجاوہ اور محمل پر سوار کر کے اپنے ساتھ لے

جانے میں امام حسینؑ کیلئے کیا دشوار تھی؟؟ آخر امام سجادؑ کو بھی بیماری کے عالم میں دشمن اسیر کر کے کوفہ سے شام لے گئے، لیکن آپ صحیح و سالم رہے۔

۵۔ امام حسینؑ مدینہ سے نکلتے وقت مکہ کیلئے نکلے تھے۔ کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ آپؑ مدینہ سے کوفہ یا کربلا کیلئے نکلے تھے۔

۶۔ آپؑ اہل کوفہ کی دعوت اور اصرار پر مکہ چھوڑ کر کوفہ کے لئے عازم سفر ہوئے تھے' کربلا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو منزل شراف پر جب لشکر حر نے کوفہ کی طرف جانے سے روکا' تب آپ کربلا پہنچے۔

۷۔ آپؑ چار مہینے مکہ میں رہے۔ اس دوران آپ کی زبان سے کبھی کسی بیمار بیٹی کا ذکر نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ آپ مکہ چھوڑ کر کربلا پہنچے' وہاں بھی آپ کو اس وقت تک اپنی بیٹی یاد نہیں آئی' جب تک کہ بیٹی کا خط نہیں ملا!

۸۔ بعض نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے صغریٰ سے وعدہ کیا تھا کہ علی اکبرؑ کی شادی پر لینے آئیں گے۔ بنا بر تحقیق جناب علی اکبر عمر کے لحاظ سے امام سجادؑ سے چار سال بڑے تھے اور اسی وجہ سے آپ کو اکبر کہا گیا ہے۔ جب امام سجادؑ کہ جو آپ سے عمر میں چار سال چھوٹے تھے اور ان کے فرزند رشید امام محمد باقرؑ کی عمر کربلا میں تین چار سال تھی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جناب علی اکبر غیر شادی شدہ رہے ہوں۔

۹۔ قصے میں لکھا ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ مسلسل بیمار رہتی تھیں' ایک دن کربلا خط بھیجنے کی غرض سے آپ گھر سے نکل کر چوراہے پر گئیں تا کہ کسی جانے والے مسافر کے ذریعہ اپنی سلامتی کی خبر اور شکوہ و شکایات پر مشتمل رقعہ کربلا بھیج سکیں۔ چوراہے تک لے جا کے قصہ ساز نے اس قصے کو یہیں روک دیا ہے۔ آگے کیا ہوا' آپ کتنی دیر تک وہاں منتظر رہیں' مسافر ملا یا نہیں' اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۱۰۔ لکھا ہے کہ جب آپ گھر میں تھیں' اس وقت ایک شتر سوار نے آ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ میں کربلا جا رہا ہوں' کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔

یہ شخص کون تھا؟ اس کو کربلا جہاں صحرا ہی صحرا ہے' کیوں جانا تھا؟ خود جناب فاطمہ صغریٰ کو یہ کیسے پتہ چلا

کہ امام حسینؑ کربلا میں ہیں؟ جبکہ امام ۲ محرم الحرام کو کربلا مجبوری کے عالم میں پہنچے تھے۔

۱۱۔ کہتے ہیں کہ یہ شتر سوار دوسرے دن کربلا پہنچا جبکہ امام حسینؑ مکہ سے کربلا پچیس دن میں پہنچے تھے۔ یہ شخص بھلا اتنا جلد کیسے پہنچا؟

۱۲۔ چونکہ انسان کیلئے اتنی جلد مدینہ سے کربلا پہنچنا ممکن نہیں' اسلئے اسے ملک قرار دے دیا۔ بھلا ملک کے ذریعہ فاطمہ کا خط امام حسینؑ تک پہنچانے کی کیا حکمت تھی؟

۱۳۔ قصہ سازوں نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ فاطمہ صغریٰ کو جناب ام سلمیٰ کے پاس چھوڑ آئے تھے لیکن قصے میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ جناب ام سلمیٰ نے آپکی بیماری کے علاج کا بندوبست کیا ہو یا داغ فراق میں تسلی دی ہو۔

۱۴۔ دوسرے دن ایک پرندے نے خون حسینؑ میں لت پت آ کر فاطمہ صغریٰ کے مکان کی چھت سے خون کے قطرات ٹپکائے اور امامؑ کی شہادت کی خبر دی۔ یہ سچ مچ پرندہ تھا یا ملک۔ اگر پرندہ تھا تو ایک دن میں مدینہ سے کربلا کیسے پہنچا؟ کیا پرندے کی اتنی رفتار ہوتی ہے؟ پھر کیا خون اتنی دیر تک جسم پر مائع کی حالت میں باقی رہ سکتا ہے کہ قطرات کی صورت میں ٹپکنے لگے؟

۱۵۔ قصہ سازوں نے قصۂ دامادی قاسم میں لکھا ہے کہ آپ کا عقد نکاح بھی امام حسینؑ کی ایک بیٹی فاطمہ سے ہوا تھا۔ اگر ایسا ہے تو کیا امام حسینؑ کی فاطمہ نامی تین بیٹیاں تھیں؟ پھر یہ تو بتائیے کہ یہ بیٹیاں امام حسینؑ کی کس کس زوجہ سے تھیں؟

۱۶۔ قصہ اگر صحیح مان بھی لیں تو یہ بتلایئے کہ جب اہل بیت اطہارؑ زینب و ام کلثوم واپس مدینہ پہنچیں تو اس وقت فاطمہ صغریٰ کا ذکر کیوں نہیں ہے' ان کا نام گم کیوں ہو گیا؟ اس قدر شکوے و شکایات کرنے والی بہن صغریٰ نے سید سجادؑ سے شکایت کیوں نہیں کی؟ زینب و ام کلثوم سے اپنے بھائی کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ اپنی ماں سے شکایت کیوں نہیں کی؟۔

رباب بنت امرءالقیس

ڈاکٹر بہشتی عصر حاضر کے بعض دیگر مشہور و معروف مؤلفین کی طرح اپنی کتاب "زنان قہرمان" میں جناب رباب کا حسب و نسب بیان کرتے ہوئے غلطی کرتے ہیں کہ جناب رباب دورجاہلیت کے معروف شاعر امرءالقیس بن حجر بن حارث کندی کی بیٹی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق امرءالقیس نامی ایک شخص نے ۴۹۷ء سے ۵۴۵ء عیسوی کے دوران سرزمین حجاز میں زندگی گزاری ہے۔اسکی موت بھی اسی قریہ میں واقع ہوئی۔کتاب "قصص العرب" میں نقل ہے کہ وہ ۵۰۰ء عیسوی میں اس دنیا سے رخصت ہوا' جبکہ دوسری جگہ لکھا ہے کہ یہ شخص ہجرت سے ۸۰ سال پہلے مرا تھا۔ اس شخص کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔کہیں عدی لکھا ہے' کہیں ذوالقروح اور کہیں ملک ضلیل۔کتاب "تہذیب الاسماء واللغات" کے مؤلف، محی الدین بن شرف النووی اپنی کتاب کی جلد ا، صفحہ ۱۲۶ پر امرءالقیس کا حسب و نسب یوں بیان کرتے ہیں:

"امرءالقیس بن حجر بن حارث بن عمر بن حجر بن عمرو بن معاویہ بن حارث بن یغوث بن مرتع بن معاویہ بن کندۃ۔یہ دورجاہلیت کا معروف شاعر تھا۔اس کے بعض اشعار کو سبعہ معلقہ کا درجہ ملا ہے"۔

تاریخی اسناد اور نقول پر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امرءالقیس جو دورجاہلیت کا ایک مشہور شاعر تھا' حضرت امام حسینؑ کی زوجہ جناب رباب کا باپ نہیں ہوسکتا۔اگر اس امرءالقیس کو رباب کا باپ مان لیا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت امام حسینؑ کی ولادت کے وقت جناب رباب کی عمر کم از کم ۸۳ سال تھی۔

کتاب "اعیان الشیعہ" جلد ۶ صفحہ نمبر ۴۴۹ پر جناب رباب کے نسب کو یوں بیان کیا گیا ہے:

رباب بنت امرءالقیس بن عدی بن اوس بن جابر بن کعب بن علیم بن ھبل بن عبداللہ بن کنانہ بن بکر بن عوف بن عزرہ بن زید الادت بن رحیدہ بن ثور بن کلب۔کتاب "نسمۃ السحر" میں آپ کا نسب یوں ذکر ہوا ہے:

رباب بنت امرءالقیس بن عدی بن اوس بن جابر بن کعب بن حباب بن کلب الکلبیہ۔

کتاب "آغانی" میں یوں لکھا ہے:

رباب بنت امرءالقیس بن جابر بن کعب بن علی بن ویرہ بن ثعلبہ بن عمران بن الحاف بن قضاعہ۔اسی کتاب میں آپ کی والدہ کا نسب بھی لکھا ہے: زینب بنت ھناں العھو وبنت ربیع بن مسعود بن مصاد بن حصاد بن کعب، جبکہ کتاب "اعیان الشیعہ" جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۴۴۹ پر آپ کی والدہ کے نسب کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

ھند بنت ربیع بن مسعود بن مروان بن حصین بن کعب بن علیم بن کلیب۔

کتاب "رحین الشریعہ" جلد ۳ صفحہ نمبر ۳۱۳ پر حضرت رباب کے نسب اور آپ کے امام حسینؑ کی زوجیت میں آنے کا بیان ناسخ التواریخ سے نقل کرتے ہوئے یوں ذکر ہوا ہے:

رباب' امرءالقیس بن عدی بن جابر بن کعب بن علی بن مرہ بن ثعلبہ بن عمران بن الحاف بن قضاعہ کی بیٹی تھیں۔رباب کی ماں ھند بنت ربیع بن مسعود بن مروان بن حصین بن کعب بن علیم بن کلیب تھیں۔

امرءالقیس جو جناب رباب کے والد ہیں' دورخلافت حضرت عمر بن خطاب میں مسلمان ہوئے تھے۔چنانچہ فرھاد میرزا اپنی کتاب "قمقام" میں ابوالفرج کی کتاب "آغانی" سے عوف بن خارجہ المذی سے روایت کرتے ہیں کہ امرءالقیس بن عدی نے حضرت عمر کے دورخلافت میں ان کے سامنے اسلام قبول کیا۔حضرت عمرؓ نے ان کو شام کے قبیلہ قضاعہ کا امیر مقرر کیا تھا۔اسلام قبول کرنے کے بعد جب وہ (دربار سے) باہر آئے تو حضرت علیؑ ان کے پیچھے پیچھے گئے اور ان سے فرمایا: اے امرءالقیس! میں علی' ابن عم رسول خدا ہوں' ان کا داماد ہوں۔میرے دو بیٹے ہیں۔ہم تمہارے یہاں انکا رشتہ کرنے کے خواہشمند ہیں۔امرءالقیس نے حضرت علیؑ سے عرض کیا: میری تین بیٹیاں ہیں' (۱) محیاۃ (۲) سلمہ (۳) رباب۔محیاۃ کو میں آپ کے عقد میں دیتا ہوں' سلمہ کو امام حسنؑ کے اور رباب کو امام حسینؑ کے۔

صاحب کتاب "جمہرۃ انساب عرب" صفحہ ۲۵۷ پر جناب رباب کے نسب اور امام حسینؑ کی زوجیت میں آنے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جناب رباب' امرءالقیس بن عدی بن اوس بن جابر بن کعب بن علیم بن حناب کی بیٹی تھیں۔امرءالقیس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ حضرت عمر نے ان کو بنوقضاعہ کا امیر مقرر کیا۔بعد از قبول اسلام انہوں نے اپنی تین بیٹیاں امام علیؑ امام حسنؑ اور

امام حسینؑ کے عقد میں دیں۔ جناب رباب سے حضرت امام حسینؑ کے دو بچے حضرت سکینہ مظلومہ اور حضرت علی اصغر پیدا ہوئے۔ حضرت سکینہ' بنا بر نقل مؤرخین' سنہ ۴۷ ہجری میں یعنی امیر المومنینؑ کی شہادت کے سات (۷) سال بعد پیدا ہوئیں۔ حضرت علی اصغر کی عمر کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ وہ کربلا میں کتنے مہینے کے تھے یا کب پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ جناب رباب کی کسی تیسری اولاد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

رباب بنت امرءالقیس' تاریخ وسیرت پر لکھی گئی معتبر و مستند کتابوں کے مطابق' امام حسینؑ سے بہت نزدیک اور آپکی نگاہوں میں محترم وعزیز تھیں۔ یہ امامؑ کی آخری زوجہ ہیں۔ سفر کربلا میں آپؑ کے کاروان میں از ابتدا تا انتہا ہر مقام پر شریک سفر نظر آتی ہیں۔ میدان کربلا میں عشق الٰہی اور شوق شہادت کے لرزہ خیز مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد عقیلۂ قریش زینب کبریٰ ؑ کی قیادت میں' سفر اسارت میں' بازاروں اور درباروں میں آپ بھی گئیں۔ مدینہ واپس آنے کے بعد ایک سال تک آپ نے سوگواری کی زندگی بسر کی اور بالآخر ۶۲ھ میں اپنے خالق حقیقی' مہربان شوہر سید الشہداءؑ اور فرزند دلبند عزیز سے جاملیں۔ یہ بہرحال ایک مسلمہ حقیقت ہے جس میں کسی شک وشبہ وتردد کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ آپکے امام حسینؑ کی زوجیت میں آنے کا جو قصہ بیان ہوا ہے' وہ محل نزاع ہے۔

''ریاحین الشریعہ''''ناسخ التواریخ''اور کتاب ''قمقام''میں مذکور اسناد نہ صرف یہ کہ غیر مستند اور ضعیف روایتوں کا مجموعہ ہیں' بلکہ تاریخی تحلیل وتجزیہ کے حوالے سے بھی قابل قبول نظر نہیں آتے۔ اس میں درج ذیل سقم اور تاریخی نقائص نظر آتے ہیں:

۱۔ ایک شخص جو ابھی ابھی مسلمان ہوا ہو' فوراً ہی اس کو ریاست اسلامی کے ایک خطے میں منصب امارت پر فائز کردینا' خود ایک مشکل مسئلہ ہے۔ اس طرح کی کوئی مثال نہ خلفائے راشدین کے دور میں ملتی ہے اور نہ دوسرے خلفاء کے دور میں۔

۲۔ جس دن سے شام ریاست اسلامی میں داخل ہوا' اسی روز سے یہ خطہ اولاد ابوسفیان کے زیر نگیں رہا۔ سب سے پہلے یزید ابن سفیان کو شام کا گورنر بنایا گیا۔ اسکے بعد اسکا بھائی معاویہ ابن ابوسفیان اس منصب پر

فائز ہوا۔ اس خطہ میں بسنے والے قبائل میں امیر مقرر کرنے کا اختیار بھی معاویہ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا' نہ کہ خلیفہ کے ہاتھ میں تھا۔

۳۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ کی ذات مبارک مجسمۂ زہد وتقویٰ ہے آپ دنیا ومافیہا سے بے نیازی کے مظہر واقعی ہیں یہ بات آپ کی سیرت کے منافی ہے کہ ایک شخص جو تازہ تازہ مسلمان ہو کر دربار سے نکلا ہو' آپ جیسی شخصیت اس کے پیچھے ہولے اور خود اپنے اور اپنے بیٹوں کے لئے اس سے خواستگاری کرے' جبکہ معاویہ اور عمرو عاص ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی طرح علیؑ کی عیب جوئی کا کوئی بہانہ ہاتھ آجائے۔ ذرا سوچئے اور غور کیجئے کہ اس میں حضرت علی کی کوئی فضیلت بیان ہوئی ہے یا تضحیک کا پہلو نکلتا ہے؟

۴۔ اُن دنوں حضرت امیر المومنینؑ کے عقد میں تین زوجات جناب امامہ' خولہ اور اسماء بنت عمیس پہلے ہی موجود تھیں ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کو طلب کرنے کی کوئی دینی مذہبی اور خدائی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔

۵۔ اس قصہ میں مذکور ہے کہ امرءالقیس نے محیاۃ نامی اپنی لڑکی کو حضرت علیؑ کے اور سلمہ نامی لڑکی کو امام حسنؑ کے عقد میں دیا تھا۔ ہم نے جب حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کی زوجات کی فہرست مختلف کتابوں سے جمع کیں تو ہمیں حضرت علیؑ کی زوجات میں کسی محیاۃ نامی عورت اور امام حسنؑ کی زوجات میں کسی سلمہ نامی خاتون کا ذکر نہیں ملا۔

۶۔ حضرت عمرؓ ۲۳ھ میں قتل ہوئے تھے۔ اگر ہم اس کو حضرت عمرؓ کے دور کا سب سے آخری واقعہ بھی قرار دیں تو یہ سنہ ۲۲ ہجری یا سنہ ۲۳ ہجری کا واقعہ ہوگا۔ دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت رباب کی صرف دو اولادوں کا ذکر ملتا ہے ایک جناب سکینہ اور ایک طفل رضیع یا عبداللہ رضیع جو علی اصغر کے نام سے معروف ہیں۔ محققین سیر وتاریخ کے مطابق معرکہ کربلا کے وقت جناب سکینہ کی عمر ۱۲' ۱۳ سال تھی ان حضرات کی تحقیق کے مطابق آپ ۴۷ ہجری میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس طرح گویا جناب رباب کی شادی اور جناب سکینہ کی ولادت میں کم از کم ۲۴ سال کا وقفہ بنتا ہے۔ شادی اور تولید نسل میں اتنا وقفہ معاشرے میں

موجب سوال واستفسار ہوتا ہے۔ زوجین میں سے کسی ایک میں عیب ونقص یا ایک دوسرے سے طویل عرصہ تک جدائی اسکا سبب ہوسکتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی صورت حال ان دونوں کے ساتھ پیش نہیں آئی اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن تھا۔ پس یہ واقعہ جو ریاحین الشریعہ اور اس کے مصادر میں ذکر ہے عقلی اور منطقی اعتبار سے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ تمام مورد استفادہ مصادر کو چھاننے کے باوجود ہم یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ جناب رباب بنت امرءالقیس حضرت امام حسینؑ کے عقد میں کب آئی تھیں۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ یہ واقعہ کسی حال میں سنہ ۲۳ ہجری یا اسکے آس پاس کا نہیں ہے بلکہ اسکے بہت بعد کا ہے۔

آمنہؑ حسینؑ

ارباب سیرو تاریخ کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ امام حسین-کی اولاد میں دو بیٹیاں شامل تھیں۔ انکے علاوہ دو بیٹیاں اور بھی تھیں یا نہیں اس پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ مفید نے کتاب ''ارشاد'' میں کمپانی کے کتاب ''حسین کیست؟'' میں اور سید محسن امین اور محقق عبدالرزاق مقرم نے اپنی تالیفات میں انہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ جن دو بیٹیوں کے بارے میں سب اتفاق کرتے ہیں وہ جناب سکینہؑ مظلومہ اور جناب فاطمہ صغریٰ ہیں۔ جناب سکینہؑ کا اصلی نام آمنہ یا امیہ ہے سکینہ آپ کا لقب ہے۔ آپ کی مادر گرامی رباب بنت امرالقیس بن عدی بن کلبی ہیں۔ واقعہ کربلا کے وقت آپ کی عمر میں اور جناب فاطمہ صغری کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ حسن مثنیٰ کے عقد میں تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت آپ کی عمر کسی صورت بھی دس سال سے کم نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ ہی ہوگی۔ چنانچہ امام حسینؑ جناب سکینہ کو ''یا خیرۃ النسواں'' کہہ کے بھی مخاطب فرماتے تھے۔ بعض مقاتل میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ عبداللہ بن حسن کے عقد میں تھیں۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت آپ بالغ تھیں اور آپ کی عمر اتنی کم نہیں تھی جتنی کہ اکثر ذاکرین بیان کرتے ہیں۔ واقعہ کربلا

کے بعد اسیر ہوکر کوفہ وشام سے ہوتی ہوئی آپ مدینہ واپس آئیں اور ۵ ربیع الاول ۱۱۷ھ کو مدینہ ہی میں آپ نے وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی۔ اس طرح سے واقعہ کربلا کے وقت جو کہ سنہ ۶۱ ہجری میں وقوع پذیر ہوا آپ کا سن ۱۴ سال بنتا ہے۔ آپ امام حسینؑ کی ایک عزیزہ اور رشیدہ بیٹی تھیں۔ حسب فرمان امامؑ آپ کی حیات طیبہ مخالفین وموافقین دونوں کی افتراء پردازی اور تہمت کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

ابوالفرج اصفہانی اور بعض دیگر مورخین نے ایک گھناؤنی سازش کے ذریعہ آپ کی عزت ومنزلت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف شعروشاعری اور رقص وسرود کی محفل سجانے جیسے بے ہودہ الزامات عائد کئے ہیں تو دوسری طرف معصب بن زبیر کی زوجیت میں ہونے کی کہانیاں اس مخدرہ سے منسوب کی گئی ہیں۔

محقق عبدالرزاق مقرم اپنی کتاب ''سیدہ سکینہ'' صفحہ ۷۳ پر اس قصے کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ سکینہ مظلومہ مدینہ واپسی کے بعد مصعب بن زبیر کے عقد میں چلی گئیں۔ لکھتے ہیں کہ اس قصے کو سچ ثابت کرنے کیلئے کبھی مصعب بن زبیر کی خاندانِ اہل بیت سے رشتہ داری بتائی جاتی ہے اور کبھی مصعب بن زبیر کے کوفہ وبصرہ کا حاکم مقتدر ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس قصہ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک افتراء وتہمت ہے جو ان لوگوں کی طرف سے لگائی گئی ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ سے اہل بیت خصوصاً اولاد علیؑ وحسینؑ کے مقام ومنزلت کو گرانے کے درپے رہے ہیں۔ یہ ایک من گھڑت قصہ ہے جو ان لوگوں کے مذموم عزائم کی عکاسی کرتا ہے۔

فرزندان زبیر کی اہل بیت سے دشمنی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے باپ زبیر کو علیؑ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔

اس قصہ ازدواج کو جعل کرنے والا زبیر بن بکار ہے۔ یہ شخص دشمن اہل بیت تھا اور اہل بیت کے مقام و منزلت کو گرانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ اسی وجہ سے شیخ مفید علیہ الرحمہ نے سند کے اعتبار سے اس کی بیان کردہ روایات کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔

علامہ حلّیؒ بھی زبیر بن بکار بن عبداللہ بن مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیر کو علیؑ اور اولادِ علیؑ کے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح احمد بن علی سلیمانی بھی اس کی بیان کردہ روایتوں کو جعلی ہونے کی بنا پر نا قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔

ابن اثیر "تاریخ کامل ابن اثیر" جلد ۷ صفحہ ۱۹ پر لکھتے ہیں کہ مصعب بن عبداللہ بن مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیر بن عوام، حضرت علیؑ سے منحرف تھا۔

ھثیم بن عدی کوفی، نسائی اور یحییٰ بن معین کے نزدیک بھی مصعب کا شمار جھوٹے انسانوں میں ہوتا ہے۔ وہ اسے قابلِ اعتبار انسان نہیں سمجھتے تھے۔ کتاب "شہید مسلم بن عقیل" صفحہ ۴۵ پر اس شخص کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ابن الندیم کہتے ہیں کہ مصعب زبیری اور اس کا باپ عبداللہ اولادِ علیؑ کے سخت دشمنوں میں سے تھے۔

مدائنی لکھتے ہیں کہ مصعب نے معاویہ کے نزدیک مقام حاصل کرنے کیلئے بہت سی روایات جعل کی ہیں۔

جناب سکینہؑ سے متعلق حدیث جعل کرنے والا پہلا شخص مصعب زبیری ہے، جو سنہ ۲۳۶ میں مرگیا۔

ابوالفرج اور دیگر مؤرخین نے اپنی بات کی سند زبیر بن بکار بن عبداللہ بن مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیر کو قرار دیا ہے۔ جبکہ خاندان زبیر بن بکار، عبداللہ اور مصعب کی اہل بیت سے دشمنی و عداوت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسی باتیں جناب سکینہؑ سے منسوب کرنا، دراصل اس مظلومہ کے مقام و منزلت کو کم کرنے کی مذموم کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ایک طرف مخالفین نے تاریخ کے صفحات پر آپ کو بدنام کرنے کی کوششیں کی ہیں تو دوسری طرف دوستوں نے غالباً غیر شعوری طور پر بہت سے خودساختہ مصائب جناب سکینہؑ سے منسوب کر دئے ہیں۔ ایسے قصوں کی بھی کوئی حد و شمار نہیں ہے۔ ہم ذیل میں ان خودساختہ مصائب کی ایک فہرست عزادارن امام حسینؑ کی خدمت پیش کر رہے ہیں:

واضح رہے کہ ان خوساختہ مصائب میں سے اکثر کا وجود تاریخ کے صفحات پر ہے ہی نہیں اور اگر ان میں سے

کچھ کو تاریخ کے اوراق میں جگہ ملی ہے تو انہیں بھی مؤرخین نے ضعیف اور مشکوک قرار دے دیا ہے۔

۱۔ جب امام حسینؑ خیمہ سے آخری وداع کر کے میدان جنگ کے لئے نکلے تو جناب سکینہؑ بھی خیمہ سے باہر نکل کر آ گئیں اور امام کی سواری (ذوالجناح) کے پاؤں سے لپٹ گئیں، جسکی وجہ سے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جب امامؑ نے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ جناب سکینہؑ نے گھوڑے کا پاؤں پکڑ رکھا ہے۔ اگر ہم فرض کرلیں کہ جناب سکینہؑ تین یا چار سال کی تھیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حسینؑ گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور بچی نظر نہ آئے؟

اور اگر جناب سکینہؑ ایک بالغہ، رشیدہ اور رعب دار خاتون تھیں تو کیا اس سن و شعور کی بی بی سے ایسی غیر عقلی حرکت کا سرزد ہونا قیاس نہیں لگتا؟

۲۔ جب امام حسینؑ کو اس بات کا پتہ چلا تو زین سے نیچے تشریف لائے اور جناب سکینہؑ کو گھوڑے کے پاؤں سے الگ کیا۔ جناب سکینہؑ نے گھوڑے کے پاؤں تو چھوڑ دئے لیکن امامؑ سے کہنے لگیں: بابا آپ مجھے اپنے سینے پر لٹائیے۔ اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی بیٹا یا بیٹی جس کی عمر دس گیارہ سال ہو گود میں آنے کی خواہش کر سکتی ہے؟ اور کیا باپ اسے گود میں لے بھی لیگا؟ ہاں بغلگیر تو ہو سکتا ہے لیکن گود میں لینے والی بات سمجھ سے باہر ہے۔

۳۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوفہ و شام کے راستے میں سکینہؑ مظلومہ سواری سے نیچے گر گئیں اور قافلہ آگے نکل گیا۔ چنانچہ ایک مقام پر پہنچ کر سرِ مبارک امام حسینؑ نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور تمام کوششوں کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حاملان سر مقدس نے امام سجادؑ سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔ آپؑ نے عقیلہ قریش جناب زینبؑ سے فرمایا کہ اہل بیت کے یتیموں کو شمار کیجئے۔ تب معلوم ہوا کہ جس سواری پر جناب سکینہؑ سوار تھیں وہ خالی ہے۔ جناب زینبؑ حضرت سکینہؑ کو تلاش کرتی ہوئی واپس گئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک خاتون آپکو گود میں لئے بیٹھی ہیں۔ جناب زینبؑ نے حیران ہو کے پوچھا: آپ کون ہیں؟ خاتون نے جواب دیا: "زینبؑ! میں تمہاری ماں فاطمہؑ ہوں"۔ جناب زینبؑ نے جب

ماں کو دیکھا تو ضبط نہ کر سکیں اور اپنے اوپر گزرنے والی مصیبتوں کو ماں سے بیان کرنے لگیں۔

یہ قصہ بھی مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ اس بات کے شواہد خود اسکے اندر موجود ہیں مثلاً:

(۱۔۳) اکثر مؤرخین اور مقتل نگاروں نے جناب سکینہؑ کو بالغہ و رشیدہ قرار دیا ہے۔ مجملہ انکے آپ کے بالغہ و رشیدہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت امام حسینؑ کا وہ شعر ہے جس میں آپ نے جناب سکینہؑ کو "یا خیرۃ النسواں" کہہ کے خطاب کیا ہے۔

کلمۂ نسواں بالغ اور حد بلوغت سے گزرنے والی خواتین کیلئے استعمال ہوتا ہے لہٰذا ایک بالغہ لڑکی کا گھوڑے سے گرنے کے بعد چیخ و پکار نہ کرنا کیا قرین قیاس نہیں لگتا؟

(۲۔۳) دور قدیم ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ اسیروں کو ہمیشہ سخت پہرے اور نگرانی میں لایا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوتاہی کی صورت میں ان کے محافظین سے بازپرس کی جاتی ہے۔ کسی اسیر کے گز رجانے یا حادثے کا شکار ہونے کی صورت میں انھیں جوابدہ ہونا پڑتا ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ سوار کا محافظ اس بچی کے گرنے کو محسوس ہی نہ کرے اور خالی سواری لیکر آگے بڑھ جائے۔

(۳۔۳) اول تو حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی آمد کی کوئی منطق نہیں ہے بالفرض محال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تو یہ کہنا کہ جناب زینب نے اپنی ماں فاطمۃ الزہراؑ کو نہیں پہچانا' اس کی کیا منطق پیش کرینگے؟

(۴۔۳) سر مقدس امام حسینؑ کو کسی بانس پر باندھ کر تو نہیں لے جایا رہا تھا بلکہ سرہائے مقدس ہاتھوں میں موجود نیزوں کی انیوں پر ہوتے تھے۔

۴۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کربلا میں تمام مصیبتوں کا مرکز خود امام حسینؑ کی ذات تھی۔ روایات میں ملتا ہے کہ آپ اتنے پیاسے تھے کہ شدت پیاس سے آسمان بھی دھندلا نظر آتا تھا۔ ائمہ طاہرین خصوصاً امام سجادؑ نے زندگی بھر اپنے بابا کی پیاس کے تذکرہ کو خود بھی زندہ رکھا اور دوسروں سے بھی اسے زندہ و تازہ رکھنے کی سفارش کرتے تھے۔ حضرت سکینہؑ دیگر اہل بیت کی مانند خیمے میں رہی ہیں۔ یقیناً بہت پیاسی تھیں لیکن اس مصیبت پیاس میں انہی کو مرکز بنانا صحیح نہیں ہے۔

کربلا میں اور بھی چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے مگر پیاس کا نمونہ صرف جناب سکینہؑ مظلومہ کو بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ آخر اس میں کیا منطق ہے؟ دوسرے بچے بھی پیاسے رہے ہوں گے اور پیاس جس کو بھی لگے پیاس ہی ہوتی ہے۔

۵۔ کہتے ہیں کہ دوران سفر بازار میں یا ابن زیاد و یزید کے دربار میں جب یہ اسراء پہنچے تو خواتین نے اپنے چہروں کو بالوں سے چھپایا ہوا تھا جبکہ جناب سکینہؑ نے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا کیونکہ آپکے بال اتنے بڑے نہیں تھے کہ ان سے چہرہ ڈھانپا جا سکتا۔ یہ قول اور اسکی منطق درج ذیل حوالوں سے باطل ہے:

(۱۔۵) ذاکرین و مقررین کا بار بار اہل حرم کے بالوں کے متعلق اس بے باکی سے ذکر کرنا روایت و درایت دونوں اعتبار سے نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ سوئے تفاہم بھی ہے۔ ان ذوات کے متعلق اس طرح کی گفتگو کرنا' ان کو بھی موجودہ دور کی بعض خواتین کی حرکات سے تشبیہ دینے کے مترادف ہے۔

(۲۔۵) اگر یہ مان لیا جائے کہ جناب سکینہؑ کی عمر اس وقت تین چار سال تھی تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ نابالغہ تھیں اور نابالغہ کے لئے شریعت میں کوئی تکلیف مثلاً حجاب وغیرہ فرض نہیں ہوتا۔ جناب سکینہؑ دختر امام ہیں' کیا انہیں اس عمر میں واجب و حرام کی تمیز نہ ہوگی؟

(۳۔۵) جناب سکینہؑ جیسا کہ ارباب مقاتل لکھتے ہیں واقعہ کربلا کے وقت بالغہ تھیں۔ فقہاء کرام حجاب اسلامی میں چہرہ اور کلائیوں سے نیچے دونوں ہاتھوں کو کھلا رکھنے کی اجازت دیتے ہیں پھر چہرہ چھپانے کی کیا منطق ہے؟

(۴۔۵) جناب سکینہؑ سے منسوب یہ جملہ: "دوسری خواتین نے اپنے چہروں کو بالوں سے چھپا رکھا تھا لیکن چونکہ میرے بال چھوٹے تھے' اس لئے میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا" خود قول جناب زینبؑ سے جھوٹے اور مردود قرار پاتا ہے۔ خطبہ زینبؑ میں یہ جملہ موجود ہے آپ نے فرمایا ہے:

"ہاں اے یزید! تو نے ہمیں اس حال تک پہنچا دیا کہ ہم بے وارثوں کا قافلہ جس جگہ پہنچتا ہے' وہاں تماشائیوں کا ٹھٹھ لگ جاتا ہے۔ ہر قسم کے لوگ' ہر طرح کے آدمی' جگہ جگہ منزل منزل' جوق در جوق'

دو راور نزدیک سے ہمیں دیکھنے کیلئے جمع ہو جاتے ہیں"۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ مخدرات عصمت کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔

۶۔ بعض مقاتل میں لکھا ہے کہ شام میں امام کی ایک بیٹی نے وفات پائی ہے۔ ایک اور روایت میں ان مرحومہ کا نام رقیہ بتایا گیا ہے۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ رقیہ کس کی بیٹی تھیں امامؑ کی یا مسلم بن عقیل کی تاہم کسی بھی مقتل میں یہ نہیں لکھا ہے کہ جناب سکینہ نے شام میں وفات پائی ہے۔

۷۔ کہتے ہیں کہ اہل بیت حرم نے اپنی ایک بچی کو یہ نہیں بتلایا تھا کہ امامؑ شہید ہو چکے ہیں بلکہ اس سے یہ کہا تھا کہ امامؑ سفر پر گئے ہوئے ہیں۔ ایک شب اس بچی نے کوئی خواب دیکھا، چیخ مار کر اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی "میرے بابا کو بلاؤ"۔ ہم یہاں یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ لڑکی جسکی عمر تین چار سال بتلائی جاتی ہے جناب سکینہ ہیں یا کوئی اور۔ اگر کوئی اور ہیں انکا نام آنا چاہئے۔ غرض ایک ایسی بچی جو کربلا میں موجود ہو، جس کی نظروں نے کربلا میں لاشوں کو دیکھا ہو، جو لاشوں کے درمیان سے گزری ہو، اس سے اس حقیقت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے؟

کیا تین چار سال کے بچوں کو اپنے گھر میں کسی عزیز کے مرنے یا جنازہ نکلنے کا احساس نہیں ہوتا؟ کیا اس عمر کے بچوں کو کسی شخص کے مجروح و زخمی ہونے اور خواتین کے رونے پیٹنے کا احساس نہیں ہوتا ہے؟ کیا اہل بیت کے بچے عام بچوں سے بھی گئے گزرے تھے؟ یا پھر جیسا کہ بعض افراد کہتے ہیں کہ آج کل کے بچوں میں یہ شعور ارتقائی منازل طے کر کے پیدا ہوا ہے، اس وقت کے بچوں میں اتنی شعوری پختگی نہیں تھی، کیا ایسا ہے؟

۸۔ کہتے ہیں جناب سکینہ نے خواب میں قصر و قصور دیکھا، جو یاقوت، و زبرجد کا بنا ہوا تھا جس میں پیغمبر اسلامؐ اور دیگر انبیائے اولوالعزم تشریف فرما تھے۔ انکے علاوہ جناب آسیہ بن مزاحم، بی بی خدیجۃ الکبریٰ اور بی بی زہراؑ بھی وہاں موجود تھیں۔ ان انبیائے کرام و خواتین ذوی الاحترام کو جناب سکینہ نے داستان کربلا سنائی، جسے سن کر پیغمبرؐ و جناب زہراؑ بیتاب ہو گئے اور بے قابو ہو کر گریہ و زاری کرنے لگے۔ یہ تمام قصہ جناب

سکینہ نے یزید کے سامنے بیان کیا۔

حیرت ہے اتنی لمبی کہانی جناب سکینہ سناتی رہیں اور یزید سنتا رہا۔ یہ تو یزید کی رحمدلی اور سکینہ سے ہمدردی و محبت کی دلیل بنتی ہے۔ دوسری طرف جنت جو آخرت سے مربوط اور عباد الصالحین کا گھر ہے، اس گھر کو خدا نے مادّے سے بنایا ہے، یہ بات خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا لہٰذا اسے دُر یا قوت اور زبرجد وغیرہ سے تعبیر کرنا، دنیا کو آخرت پر منطبق کرنے کے مترادف ہے۔

عزاداری امام حسینؑ میں مرکز و محور حسینؑ کی شخصیت کو حاصل ہونا چاہئے جبکہ جناب سکینہ اور دیگر اسیران آل محمدؐ میں مرکزیت جناب زینبؑ اور سید سجادؑ کو دی جانی چاہئے۔ یہ ذوات مقدس جرأت و دانشمندی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ فرماتے تھے۔ انہوں نے دشمن کی ہر منطق کو اپنے منطق و استدلال سے رد فرمایا۔ افسوس ان دلائل کو پس پشت ڈالتے اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی غرض سے ایسی ایسی کہانیاں اور ایسے ایسے افسانے جعل کئے گئے ہیں کہ جنکی وجہ سے نہ تو بنو امیہ کے مذموم عزائم کا پردہ چاک ہوتا ہے اور نہ ہی اہل بیت اطہارؑ کے اہداف آشکار ہو پاتے ہیں۔ یہ من گھڑت افسانے اور کہانیاں نہ تو امام حسینؑ کی مصیبت کو واضح طور پر بیان ہونے دیتے ہیں اور نہ جناب سکینہ کے مقام و منزلت میں سے کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کہانیوں میں زیادہ تر عقل و شعور اور آگاہی نام کی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔

طفلِ رضیع

کربلا میں انصار و جوانان بنو ہاشم کی شہادت کے بعد، ایک طفل صغیر کی شہادت کا ذکر تمام مقاتل میں آیا ہے البتہ نام میں فرق ہے۔ بعض کتابوں میں اس بچے کا نام عبداللہ لکھا ہے، بعض میں طفل رضیع کا ذکر ہے جبکہ بعض کتابوں میں علی اصغر لکھا ہے۔ طفل صغیر کے نام میں اختلاف بعض مؤلفین، مقررین اور خطباء کیلئے شبہ کا سبب بنا۔ اسی شبہ کی بنا پر انہوں نے امام حسینؑ کے دو بچوں کا ذکر کیا ہے۔

ان میں سے ایک کا نام عبداللہ رضیع بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ امام کا یہ بچہ روز عاشورا پیدا ہوا تھا۔ امام حسینؑ

جب میدان سے واپس تشریف لائے تو خیمے کے دروازہ سے اس بچہ کو طلب کیا اور اسے بوسہ دینا چاہتے ہی تھے کہ اسی وقت دشمن کی طرف سے ایک تیر آیا جو بچے کے حلقوم پر لگا اور یہ بچہ امامؑ کی گود میں شہید ہو گیا۔

دوسرے بچے کو حضرت علی اصغر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کتب تاریخ و مقاتل میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ اس بچہ کی عمر چھ ماہ تھی بلکہ اکثر مؤرخین نے انہیں طفل رضیع کہا ہے یعنی شیر خوار بچہ۔

کتاب ''عوالم بحرانی'' صفحہ ۲۸۹ پر ابی مخنف نے مدائنی سے' کتاب ''مجالس السنیہ'' تالیف سید محسن امین جلد اول صفحہ ۱۱۷ مجلس ۶۵' ''مقتل مقرم'' صفحہ ۳۴۴' کتاب ''مناقب شہر ابن آشوب'' صفحہ ۲۲۲' ''مثیر الاحزان'' صفحہ ۳۶' کتاب ''اللہوف'' صفحہ ۶۶' ''بدایہ والنھایہ'' صفحہ ۱۸۴' ''اخبار الطوال'' صفحہ ۱۰۸' ''مقتل الخوارزمی'' جلد ۲ صفحہ ۳۲' کتاب ''زندگانی امام حسینؑ'' از رسولی محلاتی صفحہ ۵۱۵۔ ان تمام کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ امام حسینؑ کا ایک طفل شیر خوار کربلا میں شہید ہوا ہے لیکن کسی نے بچے کی عمر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس بچہ کی مادر گرامی جناب رباب بنت امرالقیس ہیں۔

اس بچے کی شہادت کے بارے میں مقاتل میں چند موارد پر اختلاف پایا جاتا ہے جنہیں ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں:

(۱) جب امام حسینؑ کے اہل بیت اور اعوان و انصار سب شہید ہو چکے' اہل حرم اور بچوں کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا تو آپؑ نے فریاد بلند کی: آیا ہے کوئی جو حرم رسولؐ اللہ کا دفاع کرے؟ ہے کوئی خدا پرست جو ہمارا دفاع کرے؟ ہے کوئی جس سے ہم فریاد رسی کی امید رکھیں؟ امامؑ کی آواز استغاثہ سنکر خیمہ حسینؑ سے فریاد و فغاں اور گریہ و نالہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ان آوازوں کو سنکر امامؑ در خیمہ پر تشریف لائے' اہل حرم کو تسلیاں دیں اور فرمایا: میرے بچے کو میری گود میں دے دو تا کہ میں اس کو وداع کروں۔ چنانچہ طفل شیر خوار آپ کی گود میں دیا گیا۔[۱]

(۲) ''عوالم'' میں صفحہ ۲۸۹ پر شیخ مفیدؒ سے نقل ہے کہ امامؑ نے اپنے طفل صغیر عبداللہ کو طلب کیا اور اسے بوسہ

[۱] [نقل از بحار جلد ۴۵ صفحہ ۴۶]

دیا۔ بچہ ابھی امام حسینؑ کی گود میں تھا کہ حرملہ بن کاہل اسدی نے ایک تیر مارا جس سے بچہ دامن حسینؑ میں شہید ہو گیا۔ آپؑ نے اس کا خون چلو میں لیا اور آسمان کی طرف پھینک دیا۔

(۳) اسی عوالم کے صفحہ ۲۹۰ پر ابوالفرج سے نقل ہے کہ جناب عبداللہ بن حسینؑ کی ماں کا نام رباب بنت امرء القیس تھا۔ عبداللہ ایک طفل صغیر تھے جو امام حسینؑ کی گود میں شہید ہوئے۔

(۴) بعض مقاتل میں لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ اس طفل شیر خوار کو اپنی گود میں لیکر فوج اشقیاء کے سامنے آئے اور ان سے کہا کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ بچہ اس قدر پیاسا ہے کہ شدت پیاس سے اسکے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں قصوروار ہوں تو کم از کم یہ طفل شیر خوار تو قصوروار نہیں۔ لو اس بچے کو لے جاؤ اور اپنے ہاتھوں سے پانی پلا کر مجھے واپس کر دو۔ امامؑ کے اس فرمان پر لشکر عمر سعد میں کچھ دیر سکوت و خاموشی کے بعد چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لشکر میں اختلاف نظر پیدا ہو گیا۔ اس خطرہ کو بھانپتے ہوئے عمر ابن سعد نے حرملہ سے کہا: حرملہ! حسینؑ کا جواب دو۔ یہ حکم ملتے ہی دامن حسینؑ اس طفل شیر خوار کے خون سے رنگین ہو گیا۔

تاریخ مقاتل میں کوئی ایک واقعہ مختلف انداز و الفاظ میں اسلئے ملتا ہے کہ راوی اور روایتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے محترم عزادارانِ امام حسینؑ اس معاملہ میں جذباتی رویہ اختیار کئے رہتے ہیں۔ اگر انہوں نے کسی نقل کو سنا ہے تو اس سلسلہ میں دوسری نقل سننے کی ان میں تاب نہیں رہتی۔ لہٰذا یک جنبش قلم اسے غلط قرار دے دیتے ہیں۔ یہ طرز فکر دراصل انکے جمود و رکود کی علامت ہے۔ بھلا امام حسینؑ کی مظلومیت یا اُس صغیر کی شہادت میں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تیر اسے میدان جنگ میں لگا ہو یا در خیمہ پر؟ قاتل ہر حال میں مجرم ہے اور بچہ مظلوم۔

بعض مقررین یا مؤلفین مصیبت امام حسینؑ بیان کرتے وقت امام حسینؑ کے بنیادی اہداف اور آپؑ پر پڑنے والی مصیبت کو بیان کرنے کے بجائے خود ساختہ مصائب بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ شاید اسی دلچسپی کی وجہ سے ان لوگوں نے دو بچوں کا ذکر کیا ہے' ایک بچہ وہ جو خیمہ کے دروازے پر شہید ہوا جسکے

بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عاشورا کے دن ہی پیدا ہوا تھا اور دوسرا بچہ وہ جسے امام پانی پلانے کی غرض سے لشکر کے سامنے لے گئے ۔یہ بچہ چھ مہینے کا تھا اور اسکا نام علی اصغر تھا۔

کتب مقاتل میں تاریخ میں پائے جانے والے اس اختلاف کے بارے میں تحقیق کرنے کی بجائے بعض لوگوں نے روایتوں کو صحت بخشنے کی کوشش کی ہے ۔ایسے لوگ حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں حقیقت معلوم کرنے کی بجائے اپنی خواہشات کو مقدم رکھتے ہیں اور پھر خود ہی مشکل میں مبتلا بھی ہو جاتے ہیں۔

پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کے دو شیر خوار بچے کربلا میں شہید ہوئے ہیں اور دونوں کی ماں جناب رباب کو بتلاتے ہیں انہوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اگر ایک بچے کو ششماہا تسلیم کر لیا جائے تو چھ مہینے کے اندر دوسرے بچے کی ولادت کو کیسے ثابت کریں گے؟

یہ لوگ جو امام حسینؑ کی شہادت اور اہل بیت اطہارؑ کی اسارت کی مصیبت کو رلانے کیلئے ناکافی سمجھتے ہیں اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی نئی مصیبت بیان کرنے کو مل جائے ۔انہوں نے پہلے حضرت علی اصغرؑ کو چھ ماہ کا بتلایا پھر اسی ماں سے روز عاشورا ایک اور بچے کے پیدا ہونے کا ذکر کر دیا ۔بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ان دو شیر خوار شہیدوں کے علاوہ بعض لوگ امام حسینؑ کے ایک اور بچے کا ذکر کرتے ہیں جو شام جاتے ہوئے راستہ میں سقط ہو گیا ۔غرض اس طرح ان لوگوں نے امام حسینؑ کی مصیبت میں انکے ننھے بچوں کی شہادت کی ایک لمبی داستان وضع کر ڈالی ہے اور اصلِ تاریخ کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

کربلا میں ننھے بچوں کی تعداد

تمام کتب اور مقاتل میں کربلا میں ایک ہی بچے کا تذکرہ آیا ہے جسے کبھی طفل رضیع یعنی شیر خوار بچہ کہا ہے اور کبھی عبداللہ رضیع کا نام دیا ہے جو بعد میں علی اصغر کے نام سے مشہور ہوئے ۔یہ جناب رباب کے فرزند تھے اس بچہ کے شیر خوار ہونے کا ذکر تو تاریخ میں ضرور ملتا ہے لیکن اس کی عمر کا ذکر کسی مستند تاریخ و مقاتل میں نہیں ہے ۔بہر کیف بچوں کی عمر کا کم ہونا یا زیادہ ہونا مصیبت میں اضافہ کا باعث نہیں بنتا ہے۔

مجرم اپنے جرم و جنایت میں جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پھر آخری جرم کا ارتکاب کرتا ہے ۔وہ آخری جرم جو

اس نے کیا یہ تھا کہ وقت کے امام حجت خدا نبیؐ کے نواسہ کو اپنے شہر میں مہمان بلا کر قتل کر دیا ۔اب اس کے بعد جو بھی جرم ہو وہ اس بزرگ ترین جرم سے چھوٹا ہی نظر آئے گا ۔تاہم مجرمین کے جرائم کی داستان جو مستند و معتبر تاریخ کے صفحات پر رقم ہے اس کا یاد کرنا اہم بھی ہے اور رجحان بھی رکھتا ہے۔

چھوٹے بچوں کے مصائب دلوں پر جلد اثر انداز ہوتے ہیں ۔معصوم بچوں کے مصائب کے ذکر سے لوگوں کو چونکہ رلانا آسان ہوتا ہے اسلئے اس حوالے سے ذکر مصائب میں بہت سی ترمیمات عمل میں لائی گئی ہیں ۔اسی واسطے بعض بڑوں کو چھوٹا بنا دیا گیا ۔جیسا کہ حضرت سکینہ =اور جناب فاطمہ صغریٰ =کے بارے میں داستانیں گھڑی گئی ہیں جبکہ تاریخ و مقاتل کی تحقیق کے مطابق کربلا میں سنہ ۶۱ ہجری میں یہ دونوں شادی شدہ تھیں ۔اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے بچوں سے متعلق داستانیں بنائی گئی ہیں ۔یہ سب کچھ اصل واقعہ کربلائے حسینؑ کو نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی سازش کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ ان غیر معتبر کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ علی اصغر کے علاوہ کربلا میں ایک اور بچہ تھا جو جناب رباب کے بطن سے عاشورا کے دن ہی پیدا ہوا تھا ۔پھر یہیں پر بس نہیں کی بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ امام حسینؑ کا ایک اور بچہ شام جاتے وقت ماہ محرم کے آخری ایام میں سقط ہو گیا۔

کتاب ''ریاض القدس'' جلد دوم صفحہ ۲۲۴ پر کوفہ میں ورود کے احوال میں لکھا ہے کہ اس وقت چونسٹھ (۶۴) عورتیں بے کجاوہ اونٹوں یا خچر پر سوار تھیں عورتوں کی گودوں میں بچے تھے ۔بعض خطیب کہتے ہیں عصر عاشورا کوفہ سے ایک ماہر سنگ انداز دو بوریوں میں پتھر بھر کر لایا ۔جب کربلا پہنچا تو دیکھا کہ لشکر عمر سعد نے خیام حسینی کی طرف غارتگری کیلئے ہجوم کیا ہوا ہے ۔یہ شخص بھی دوڑتے ہوئے خیموں کے نزدیک پہنچا اور پتھر خیموں کی طرف پھینکے جس سے بہت سے بچے شہید ہوئے۔

یہ تمام داستانیں من گھڑت ہیں اور فقط مجلسوں میں لوگوں کو رلانے کی خاطر گھڑی گئی ہیں ۔بچوں کی اتنی بڑی تعداد کا ذکر کسی بھی مستند تاریخ میں نہیں ہے ۔ایسی باتیں آپ کو سوائے ان چند کتابوں کے کہ جو گمنام راویوں اور غلطیوں سے بھری پڑی ہیں کہیں نہیں ملیں گے۔

عزاداران امام حسینؑ جو مولا کی مظلومیت کا ذکر سننے اور رونے کیلئے آتے ہیں اور رونا اپنے لئے باعث نجات وسعادت سمجھتے ہیں، ایسی داستانوں پر انہیں غور کرنا چاہئے ۔انہیں حسینؑ کی مصیبت سے زیادہ، شہادت حسینؑ کے بعد امامؑ پر پڑنے والی اس مصیبت پر رونا چاہئے کہ کس طرح اصل مصیبت کو افسانے کی صورت دے دی گئی ہے۔آخر حسینؑ اپنے ساتھ کتنے بچے لائے تھے؟

ام ولد (بچہ والی کنیز)

وہ کنیز جس کے بطن سے کوئی بچہ جنم لیتا ہے "ام ولد" کہلاتی ہے ۔حضرت امام حسینؑ کی ازواج کی فہرست میں اُم ولد کا ذکر کرنا محققین کے نزدیک موردِ اشکال ہے ۔اگر ائمہ اطہار علیہم السلام کی زوجیت میں کبھی کوئی کنیز آتی بھی تھی تو پہلے اسکو آزاد کیا جاتا تھا، پھر اس سے عقد فرماتے تھے۔چنانچہ امام سجادؑ نے جب اپنی ایک کنیز سے عقد کا ارادہ فرمایا تو پہلے اسے آزاد کیا، پھر اپنی زوجیت میں لائے ۔جب اس واقعہ کی اطلاع ہشام بن عبدالملک کو ملی تو اس نے امام سجادؑ کے نام ایک تنقیدی خط لکھا۔امامؑ نے اسے قرآن وسنت اور سیرت پیغمبرؐ کی روشنی میں دندان شکن جواب ارسال فرمایا۔کتاب "حیات امام سجادؑ" میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔

جب آئمہ طاہرینؑ کی یہ سیرت رہی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ام ولد کے نام سے امام کی ازواج کا تو ذکر ہو لیکن کسی زوجہ کا نام نہ ہو۔بات دراصل یہ ہے کہ لوگوں کا وطیرہ رہا ہے کہ جب کبھی کسی فرضی اولاد کا تذکرہ کرنا مقصود ہوا تو کہہ دیا کہ اسکی ماں ام ولد تھی۔اس طرح سے یہ لوگ اپنے جھوٹے اور فرضی قصوں کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قیام امام حسینؑ اور افسانہ سازیٔ زواج

اجتماعی، سیاسی اور مذہبی شخصیات کے مقام ومنزلت کو گرانے اور ان کے عظیم اہداف ومقاصد سے لوگوں کو بے خبر رکھنے کیلئے کی جانے والی سازشوں میں سے ایک سازش یہ ہے کہ ان شخصیات کی ازدواجی زندگی سے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑے جاتے ہیں۔اس طرح سے لوگوں کو اصل مقاصد سے ہٹا کر ان خود ساختہ مسائل کی طرف متوجہ کردیا جاتا ہے۔یہ ایک انتہائی قدیم حربہ ہے جو نہ صرف آج تک جاری ہے بلکہ شاید آئندہ بھی دشمن اس ہتھکنڈے کو آزماتا رہے گا۔

ازدواج، انسانی زندگی کا ایک فطری تقاضا ہے۔قرآن وسنت نے اس کا فلسفہ زوجین نہیں بلکہ باہمی اُنس اور تولیدِ نسل قرار دیا ہے۔شریعت میں اس اہم انسانی ضرورت کی حدود کو متعین کردیا گیا ہے۔اگر کوئی شخص ان متعین شدہ حدود سے تجاوز کرے تو وہ ایک شہوانی انسان کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے ۔ایسا شخص کسی اعلیٰ وارفع اجتماعی، سیاسی یا مذہبی منصب کا لائق وسزاوار نہیں رہتا۔عام مشاہدہ ہے کہ جب کسی انسان کو غیر متوقع طور پر بے تحاشہ مادی وسائل حاصل ہوجاتے ہیں تو ایسا شخص اکثر آہستہ آہستہ اپنی ضروریات سے تجاوز کرنے لگتا ہے اور پھر ناپسندیدہ اعمال میں خود بخود مبتلا ہوجاتا ہے۔

دیکھا یہ گیا ہے کہ جب مخالفین کسی کو ازدواج کی اسکینڈل میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اسے مختلف بہانوں سے اس جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔اگر دشمن قوی ہو تو کبھی وہ اپنے مخالف پر اپنی مرضی کی ازدواجی زندگی کو مسلط کرتا ہے تا کہ اس بہانے اس کی نقل وحرکت سے آگاہ رہ سکے اور اسکی روزمرہ کی زندگی میں مداخلت کرسکے جیسے مامون الرشید نے اپنی بیٹی کو زبردستی امام جوادؑ کے عقد میں دیا تھا اور آپ کو بادل نخواستہ قبول کرنا پڑا تھا۔اور اگر یہ ممکن نہ ہوسکے تو دشمن اس کی حیات کے بعد جعلی ازدواجی قصے اور کہانیاں گھڑ کر، اسکی ذات سے منسوب کردیتے ہیں۔بہرحال یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ جو شخص کسی قوم کا مقتداء ہو یا منصب اقتدار پر فائز ہو یا اس مقام کے حصول کیلئے سرگرداں ہو، اس کیلئے کثرت ازدواج کوئی اچھی صفت نہیں

سمجھی جاتی۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ قائدین و رہبران کی شخصیت کو مسخ کرنے کے اس حربہ کو پہلے حضرت امام حسنؑ کے خلاف استعمال کیا گیا اور پھر حضرت امام حسینؑ کی شخصیت کو اسکا نشانہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دشمنانِ اہل بیت نے طرح طرح کے قصے گھڑے ہیں۔ چونکہ امام حسینؑ علیہ السلام تاریخ کی ایک انتہائی مقبول و محبوب شخصیت ہیں لہٰذا آپ کے عظیم اہداف سے لوگوں کو دور رکھنے کیلئے دشمنوں نے آپ کو بدنام کرنے کی ٹھانی اور اس مقصد کے حصول کیلئے آپ سے منسوب جھوٹے ازدواجی قصہ جعل کئے۔ انہی قصوں میں سے ایک قصۂ رباب اور دوسرا ہند کا قصہ ہے۔

قارئین کرام کی آنکھیں کھولنے کیلئے آئندہ صفحات میں ہم ان دونوں قصوں کی کچھ تفصیلات بیان کرینگے۔ دونوں قصوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قصۂ رباب دشمنی کے زاویہ نگاہ سے گھڑا گیا ہے جبکہ ہند کا قصہ دوستی کے زاویئے سے تراشا گیا ہے لیکن مقصد اور مشن دونوں کا ایک ہی ہے۔ امام حسینؑ نے رہتی دنیا تک ظلم و ستم اور آمریت و سامراجیت کے خلاف آواز اٹھانے کا بہترین نمونہ قائم کیا جبکہ ان قصوں کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاذ اللہ ذاتی زندگی میں آپؑ مسائل ازواج اور مسائل نسوان میں مستغرق تھے۔

قیام امام حسینؑ کا تحلیل و تجزیہ کرنے والوں نے قصۂ رباب زیادہ نقل کیا ہے جبکہ قصۂ ہند خطیب اور ذاکرین حضرات بعنوان مصیبت ابی عبداللہ الحسینؑ لوگوں کو رلانے کے لئے بڑی شد و مد سے بیان کرتے ہیں۔

ہند زوجۂ یزید

بعض کتب[1] میں یزید کی زوجہ ہند سے منسوب مختلف متضاد اور متناقض مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ خطباء و مقررین ان مصائب کو مختلف انداز و طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ انکا بیان مقررین اور سامعین دونوں کو پسند ہے کیونکہ انکا شمار انتہائی گریہ آور مصائب میں ہوتا ہے۔ ہماری اس کتاب میں اتنی گنجائش تو نہیں ہے کہ اس سلسلے میں لکھی گئی تمام کتابوں کی عبارتوں کو یہاں نقل کیا جا سکے تاہم ہماری کوشش ہوگی کہ اس داستان کے خاص خاص نکات کو ترتیب وار قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ امید ہے کہ قارئین محترم جذبات میں آکر مشتعل ہونے کی بجائے ہوشمندی اور عقل کی روشنی میں ان نکات پر غور فرمائیں گے اور اسکے نتائج و عواقب بالخصوص قیام مقدس امام حسینؑ پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

ہند زوجۂ یزید

امام حسینؑ و اہل بیت اطہارؑ کی مصیبت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور عزاداروں کو زیادہ سے زیادہ رلانے کیلئے متذکرہ کتب میں ہند زوجہ یزید سے منسوب ایک قصہ کا بیان ہے۔ ان کتابوں میں اس قصہ سے متعلق بیان کردہ واقعات میں تضاد اور پھر خود ہند کی زندگی کا پس منظر اس بات کی دلیل کیلئے کافی ہے کہ یہ ایک من گھڑت قصہ ہے جسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

امام حسینؑ اور دیگر اہل بیت اطہار کے مصائب بیان کرنے والوں کے نزدیک اس طرح کی قصہ کوئی اتنی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ یہ ثابت ہو جانے کے باوجود کہ یہ ایک ایسا بے بنیاد قصہ ہے جسکا حقیقت سے دور کا بھی رشتہ نہیں یہ لوگ ان قصوں کو بیان کرنا نہیں چھوڑتے۔ انکو بیان کرنے کا جواز پیش کرنے کیلئے کبھی العہدہ "علی الراوی" کہہ کر سہارا لیتے ہیں، کبھی یہ کہتے ہیں کہ وہ علماء و بزرگ اس کے ذمہ دار ہیں جنھوں نے ان

---

[1] [نفس المہموم ص ۴۵۹ معالی السبطین ص ۷۷ ا مجلس ۱۴ ریاض القدس اسرار الشہادۃ]

واقعات کو پہلے پہل بیان کیا ہے اور کبھی یہ عذر بھی پیش کرتے ہیں کہ اب اگر انکو چھوڑیں گے تو کربلا کے سارے واقعات ہی جھوٹ قرار پائیں گے ۔ یہ اور انہی جیسے بہانے بنا کر جواز بنانا اور ان سے سہارا لینا ان کی مجبوری ہے‘ کیونکہ اہداف حسینی سے دراصل انکو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے ۔ ان کی نظر میں تو بس مال دنیا کی اہمیت ہے ۔

اس تمہید کے بعد اب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آیا اس قصہ میں کوئی حقیقت ہے اور اگر ہے تو کہاں تک ہے اور اسکی سند کیا ہے:

۱۔ لکھتے ہیں جب اُسری اہل ابیت کو مجلس یزید میں پیش کیا گیا تو آل بنومعاویہ و آل ابوسفیان کی تمام خواتین پردے سے نکل کر باہر آ گئیں اور اہل بیتؑ کا استقبال کیا ۔

۲۔ قصر یزید میں موجود تمام خواتین خواہ وہ یزید کی بیویاں ہوں یا باہر سے آئی ہوئی خواتین ‘سب چیختی پکارتی اور فریاد کرتی ہوئی یکبارگی قصر سے باہر آئیں اور اہل بیت اطہارؑ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں ۔

۳۔ جیسے ہی اسیرانِ اہل بیت مجلس یزید میں داخل ہوئے ہند‘ زوجہ یزید چادر پھینک کر چیختی چلاتی اس مجلس میں داخل ہوئی اور بولی: اے یزید! تو نے سر مقدس حسینؑ فرزند رسول کو ہمارے دروازے پر لٹکایا ہے!

۴۔ جب زوجہ‘ یزید‘ ہند نے سنا کہ خرابہ شام میں چند خواتین اور بچوں کو اسیر کر کے لایا گیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ کہاں کے اسیر ہیں اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ اسیروں کو دیکھنے اپنی کنیزوں کی ہمراہی میں انتہائی اہتمام اور رعب و دبدبہ کے ساتھ خرابہ پہنچی ۔ ایک کنیز کرسی بھی ساتھ لیکر آئی ۔ ہند نے کرسی پر بیٹھ کر ان اسیروں سے پوچھا: تم لوگ کس شہر سے اسیر ہو کر آئیں ہو؟ جناب زینبؑ نے جواب دیا: ہم مدینہ کے رہنے والے ہیں ۔

مدینہ کا نام سنتے ہی ہند کرسی سے نیچے اُتر آئی ۔ جناب زینبؑ نے پوچھا: کرسی سے کیوں اُتر گئیں؟ ہند نے کہا: مدینہ کا نام سن کر میں وہاں موجود عظیم ہستیوں کے احترام میں اُتر آئی ہوں ۔ پھر ہند نے پوچھا: مدینہ کے کس گھرانے سے تعلق ہے ۔ اس طرح پوچھتے پوچھتے نے امام حسینؑ جناب زینبؑ و ام کلثومؑ کے

بارے میں دریافت کیا تو جناب زینبؑ نے فرمایا: دروازے پر جو سر لٹکا ہوا ہے وہ حسینؑ کا ہے اور زینبؑ میں خود ہوں ۔

۵۔ ایک دن یزید نے ہند سے کہا چلو ہم تمہاری زندان میں موجود اسیروں سے ملاقات کرواتے ہیں ۔ یہ کہہ کے وہ ہند کو زندان میں لے گیا ۔

۶۔ اسیرانِ آل محمدؑ کی شہر دمشق میں داخل ہونے کی خبر سن کر ایک عورت نے ہند سے آ کر کہا: آج کچھ اسیر آنے والے ہیں‘ چلو ہم چل کر دیکھتے ہیں کہ کہاں کے اسیر ہیں ۔ ہند نے اپنے آپ کو لباس فاخرہ سے آراستہ کیا اور کنیزوں کے حلقے میں اسیروں کو دیکھنے گئی ۔ ایک کنیز کو حکم دیا کہ اسکے لیئے کرسی بھی لیکر آئے ۔

جب جناب زینبؑ نے دور سے ہند کو آتے ہوئے دیکھا تو ام کلثوم سے فرمایا: دیکھو ہماری پرانی خادمہ ہند آ رہی ہے ۔ یہ دیکھ کر دونوں شہزادیوں نے اپنے سر کو نیچے کر لیا ۔ ہند قریب آئی اور جناب زینبؑ سے پوچھا: آپ لوگ کہاں کے اسیر ہیں؟ جناب زینبؑ نے فرمایا: ہم مدینہ کے رہنے والے ہیں ۔ یہ سن کر ہند کرسی سے اتر کر زمین پر آ گئی اور اہل بیت اطہارؑ کے متعلق پوچھنے لگی ۔ امام حسینؑ زینبؑ اور ام کلثومؑ کے بارے میں پوچھا ۔ حضرت زینبؑ نے جب اپنا نام سنا تو جواب میں فرمایا: یہ سر مقدس میرے بھائی حسینؑ کا ہے اور زینبؑ میں خود ہوں ۔ ہند نے اپنا گریبان چاک کیا‘ سر کو دیوار سے دے مارا اور اپنے آپ کو لہولہان کر لیا ۔

۷۔ یوں بھی لکھا ہے کہ ہند اپنے قصر میں سو رہی تھی کہ خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں ۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک قصر ہے جو یاقوت و زبرجد سے بنا ہوا ہے ۔ اُس قصر میں ابوالبشر حضرت آدمؑ حضرت ابرہیمؑ حضرت نوحؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ تشریف فرما ہیں ۔ پیغمبر اسلامؐ جناب زینبؑ سے کچھ پوچھتے ہیں ۔ جناب زینب اپنے اوپر گزرنے والی مصیبتوں کو بیان کرنے لگتی ہیں جسے سن کر رسول اکرمؐ بیتاب ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح کچھ پردہ دار خواتین ہیں جن میں اُم البشر حضرت حواؑ حضرت آسیہ بنت مزاحم حضرت حاجرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور جناب زہراؑ بھی

شامل ہیں۔ یہ بزرگ ہستیاں بھی غمزدہ حالت میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس طرح کے دلخراش مناظر سامنے آنے کے بعد ہند خواب سے بیدار ہو جاتی ہے اور فوراً اٹھ کر مجلس یزید میں جاتی ہے۔

۸۔ کچھ اس طرح بھی لکھا ہے کہ ہند نے جب دروازے پر حسینؑ کے سر مقدس کو دیکھا تو بے حال ہو گئی اور لاشعوری کے عالم میں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ اسی حالت میں بے مقنعہ و چادر مجلس یزید میں پہنچ گئی۔ یزید نے جب یہ دیکھا تو اسے اپنی عبا کے دامن میں چھپا لیا اور کہنے لگا جتنا رونا چاہتی ہے رو لے اور فریاد کر لے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے قتل حسینؑ کا حکم نہیں دیا تھا۔ ابن زیاد ملعون نے جلدی کی اور امام حسینؑ کو شہید کیا۔

۹۔ کتاب ریاض الشریعہ جلد ۳ صفحہ ۱۸۸ پر لکھا ہے کہ ہند زوجہ یزید نے جب مجلس میں صدائے زینبؑ سنی تو بے پردہ مجلس میں پہنچ گئی۔ یزید نے گھبرا کر اپنی عبا اس کے سر پر ڈال دی اور کہا: جاؤ حسینؑ پر گریہ کرو۔

۱۰۔ قتل حسینؑ کے بعد یزید اپنی زندگی سے تنگ آ گیا تھا۔ ہر وقت پریشان رہتا تھا اور کہتا تھا: یہ میں نے حسینؑ کے ساتھ کیا کیا؟ آخر کار ایک روز حکم دیا کہ اہل بیتؑ کو خرابہ شام سے باہر نکالو۔ اتنے میں یہ عورت فریاد کرتی ہوئی آئی اور جناب زینبؑ کا بازو پکڑ کر روتی جاتی تھی اور کہتی تھی میری آنکھیں نابینا ہو جائیں میں آپ کو پہچان نہ سکی۔ اس طرح وہ اسرائے اہل بیت کو خرابہ سے نکال کر اپنے گھر لے گئی اور آواز دی: اے ابوسفیان کی بیٹیو! اے مروان کی بیٹیو! خوشیاں نہ مناؤ، یہ خارجیہ نہیں ہیں، یہ تو رسول اللہؐ کی نواسیاں ہیں۔

نقد و تجزیہ

قارئین کرام خود ان اقوال کو پڑھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ قصے کس حد تک حقیقت سے دور ہیں تاہم سطحی فکر رکھنے والوں کی خاطر ہم اس قصے کا تجزیہ و تحلیل پیش کرتے ہیں:

۱۔ پہلی اور دوسری صورت جو اس قصے میں اہل بیت سے ملاقات کے حوالے سے بیان ہوئی ہے، اس میں ہند نامی کسی عورت کا تذکرہ نہیں ہے، صرف آل ابوسفیان و آل معاویہ کی عورتوں کا ذکر ہے۔

اسکے علاوہ جہاں خواتین کی فریاد اور آہ و فغان کا ذکر ہے، وہاں بھی اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا کہ ان خواتین میں ہند نامی کوئی عورت بھی تھی۔

۲۔ ان قصوں میں خود ہند کے بارے میں متضاد اقوال ملتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) ایک طرف کہتے ہیں کہ ہند انتہائی بے ساختگی، پریشانی اور بے حجابی کے عالم میں فریاد کرتی ہوئی اچانک مجلس یزید میں آئی۔

(ب) دوسری جانب یہ بیان ہے کہ ہند کو اہل بیت اطہارؑ کے اسیر ہو کر شام آنے سے متعلق کوئی خبر نہیں تھی۔ خود یزید نے ہند سے کہا: چلو ہم تمہیں خرابہ شام کی سیر کراتے ہیں اور اسیروں سے ملواتے ہیں۔ اس طرح سے ہند جب خرابہ پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ خرابہ میں موجود اسیر اہل بیتؑ اطہارؑ ہیں، جن میں زینبؑ و ام کلثوم بھی ہیں۔ یہاں تک تو یزید کا ذکر ملتا ہے لیکن خرابہ پہنچنے کے بعد یزید کا کوئی نام و نشان نہیں رہتا۔

(ج) ہند کو خود خبر ملی کہ خرابہ شام میں کچھ خواتین اسیر ہو کر آئی ہیں لہٰذا وہ اپنی کنیزوں کے ساتھ ان سے ملاقات کرنے کے لئے نکلی۔ ایک کنیز سے کہا کہ کرسی بھی ساتھ لیکر چلے۔ جب خرابہ پہنچی تو کرسی پر بیٹھ کر اس نے اسیروں سے سوال کیا کہ وہ کہاں کے اسیر ہیں، تب زینبؑ نے جواب میں فرمایا کہ ہم مدینہ کے رہنے والے ہیں۔

(د) ایک شامی عورت نے قصر یزید میں آ کر ہند سے کہا کہ آج کچھ اسیر خواتین شام میں داخل ہونے والی ہیں، چلیں ہم بھی ان اسیروں کو دیکھنے چلتے ہیں۔ یہاں بھی یہی بیان ہوا ہے کہ اپنی کنیزوں کو ساتھ لیکر گئی۔ ایک کنیز کو کرسی بھی ساتھ لینے کا حکم دیا اور اسیروں سے ملاقات کے موقع پر اسی کرسی پر بیٹھ کر ان سے سوالات کئے۔

(ہ) ہند اپنے قصر میں سوئی ہوئی تھی۔ عالم خواب میں اس نے دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں۔ دروازے کھلتے ہی اسے زبرجد و یاقوت سے بنا ہوا ایک قصر نظر آتا ہے جس میں حضرت آدمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان انبیائے کرام کے علاوہ جناب حواؑ، آسیہ، مریمؑ

مادر موسیٰؑ خدیجۃالکبریٰ اور جناب زہرا = بھی اس قصر میں موجود ہیں۔ اس خواب کو دیکھتے ہی ہند وحشت زدہ ہوگئی اور عالم اضطراب میں بھاگتی ہوئی مجلس یزید میں پہنچ گئی۔ دیکھا کہ یزید دیوار سے تکیہ کرکے روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ میرے اور حسینؑ کے درمیان کل حشر میں کیا ہوگا۔ خدا لعنت کرے عبید اللہ ابن زیاد پر کہ اس نے حسینؑ کو قتل کرنے میں جلدی کی۔

کبھی کہتے ہیں کہ ہند جناب زینبؑ و ام کلثوم اور دیگر اہل بیت اطہارؑ سے ملاقات کرنے از خود آئی اور کبھی کہتے ہیں کہ اسکو اطلاع دی گئی کہ کچھ اسیر آئے ہیں اور اس خبر کو سن کر وہ اسیروں سے ملنے کی غرض سے آئی۔ دونوں باتیں آپس میں متضاد ہیں۔

۳۔ جب اہل بیت کرام کو مجلس یزید میں پیش کیا گیا اس وقت سر مقدس حسینؑ بنا بر نقل تواریخ و مقاتل، یزید کے سامنے طشت میں رکھا ہوا تھا۔ کسی مقتل میں یہ نہیں لکھا ہے کہ سر مبارک قصر یزید کے دروازے پر لٹکایا ہوا تھا۔ گرچہ بعض غیر مستند مقاتل میں یہ لکھا ہے کہ آپ کا سر مبارک دروازۂ شام پر لٹکا دیا گیا تھا لیکن قصر یزید کے دروازے پر لٹکانے کا ذکر ان میں بھی نہیں ہے۔

۴۔ خرابہ شام اور بازار شام دونوں جگہ ملاقات کی داستان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہند کی کنیز اس کے حکم پر کرسی بھی ساتھ لائی تھی اور اس نے کرسی پر بیٹھ کر اسیروں سے گفتگو کی۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ دنیا کا کوئی شخص، خواہ وہ بادشاہ یا سربراہ مملکت ہی کیوں نہ ہو، دورے پر جاتے وقت کرسی بھی ساتھ لیکر چلتا ہو؟ کیا ہند فالج زدہ یا اپاہج تھی کہ تھوڑی دیر کھڑی نہ رہ سکتی تھی؟ اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی تو ایسے لوگوں کیلئے پہلے سے وہاں انتظام ہوتا ہے، نہ کہ گھر سے کرسی ساتھ لے کر جایا جاتا ہے۔

۵۔ دونوں مقامات کے بارے میں لکھا ہے کہ ہند نے کرسی پر بیٹھ کر جناب زینبؑ سے احوال پرسی کی، لیکن جیسے ہی سنا کہ انکا تعلق مدینہ سے ہے، فوراً اہل بیت کے احترام میں کرسی سے نیچے اتر آئی۔

اہل بیت حسینؑ کا اس طرح احترام کرنے والی خاتون جو مدینہ کا نام سننے کے بعد کرسی پر بیٹھنا بھی خلاف آداب سمجھتی ہو، یزید جیسے فاسق و فاجر اور دشمن اہل بیت کی زوجیت میں کیسے آئی؟ چلئے فرض کرتے

ہیں کہ شاید کسی وقت طمع و لالچ کے دھوکے میں آکر اس کی زوجیت میں آئی ہو، لیکن اہل بیت پیغمبرؐ اور اپنے محسنوں پر گزرنے والے ان لرزہ خیز مظالم کا علم ہونے کے بعد اس نے صرف سر پیٹنے یا زیادہ سے زیادہ سر کو زخمی کرنے یا یزید کو برا بھلا کہنے پر اکتفا کیوں کیا اور اس سے جدائی اختیار کرنے اور طلاق لینے کی حد تک اقدامات کیوں نہ کئے؟

۶۔ ہند کے بازار میں پہنچنے کے قصہ میں لکھتے ہیں کہ جب جناب زینبؑ نے ہند کو آتے دیکھا تو ام کلثوم سے فرمایا کہ دیکھو ہماری خادمہ، ہند آرہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہند نے ایک عمر اہل بیتؑ کی خدمت میں گزاری تھی جس نے ایک طویل عرصہ اس گھرانے میں خدمت گزاری کی ہو بھلا کیسے ممکن ہے کہ وہ چند سالوں کے بعد زینب و ام کلثوم کو بھی نہ پہچان سکے۔ مانا کہ مصیبتوں کی وجہ سے جناب زینبؑ کے بال سفید اور چہرۂ مبارک پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوگئے ہونگے لیکن صدائے زینبؑ میں تو اتنی تبدیلی نہیں آئی تھی کہ پہچانی نہ جاسکیں۔

۷۔ جناب زینبؑ نے فرمایا: ہماری خادمہ ہند آرہی ہے۔ ہند، جس نے اہل بیت کے گھرانے میں بطور خدمت گزار زندگی گزاری ہو، یزید جیسے فاسق و فاجر کو اس گھرانے کی کنیز یا خادمہ کو اپنی زوجیت میں لینے کی کیسے خواہش ہوئی؟ یہ بھی اپنی جگہ ایک سوال ہے۔

۸۔ جناب زینبؑ کا یہ فرمانا کہ ہماری خادمہ ہند آرہی ہے، یہ جملہ بجائے خود تفسیر طلب ہے۔ خادمہ سے یہاں کیا مراد ہے؟

(الف) کیا ہند عام کنیزوں کی طرح ایک کنیز تھی، جو کسی کے عنایت کرنے یا خریدنے سے اس گھرانے میں پہنچی تھی؟

(ب) یا اہل بیت کے چاہنے والے کسی خاندان کی بیٹی تھی اور والائے اہل بیت اور عشق اہل بیت کی وجہ سے اس گھرانے میں اپنے لئے افتخار و اعزاز سمجھ کر آئی تھی یعنی ایک آزاد فرد تھی جو خود اپنی مرضی سے خدمت کیلئے آئی تھی۔

(ج) یا ہند اہل بیت کے گھرانے میں کسی ہستی کی زوجیت میں تھی جسکی وجہ سے جناب زینبؑ نے کہا ہو کہ ہماری خادمہ آرہی ہے اور یہاں خادمہ سے مراد لونڈی یا کنیز نہ ہو۔

جن کتب و مقاتل میں قصہ ٔ ہند نقل ہوا ہے اُن میں ہند کے اہل بیت سے لگاؤ اور ربط کے بارے میں مختلف اور متضاد تفاسیر و توجیہات نقل کئے گئے ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لئے کچھ نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

(۱) دورِ خلافتِ حضرت عمر میں؛ ابوعبیدہ جراح نے قلعہ ابی القدس؛ جہاں نصاریٰ رہتے تھے لشکر کشی کی۔ ہند وہاں کے بادشاہ کی بیٹی تھی جو ابھی نوبیاہتا تھی وہ بھی اسیر ہوگئی۔ عبداللہ بن جعفر طیار ابوعبیدہ کے رکاب میں اس جنگ میں شریک تھے۔ انہوں نے ابوعبیدہ سے درخواست کی کہ اس لڑکی کو ان کے مال غنیمت میں شامل کردیا جائے لیکن ابوعبیدہ نے اس معاملہ کو حضرت عمر پر چھوڑا۔ حضرت عمر سے پوچھا گیا تو انہوں نے اجازت دے دی۔ اس طرح یہ لڑکی عبداللہ ابن جعفر کے قبضے میں آ گئی اور انہی کے گھر میں رہنے لگی۔ اس بیان کے مطابق ہند جناب زینبؑ کے گھر میں ایک اسیر عورت کی حیثیت سے پہنچی تھی۔

کہتے ہیں یہ لڑکی بہت حسین وجمیل تھی۔ اسکے حسن و جمال کی خبر جب معاویہ کو پہنچی تو اس نے عبداللہ بن جعفر سے اس لڑکی کی خواستگاری کی اور اس کے عوض ایک بڑی رقم کی پیش کش کی۔ عبداللہ بن جعفر بڑی جود وسخا کے مالک تھے لہٰذا بغیر کسی معاوضہ کے اس کنیز کو معاویہ کے حوالے کردیا۔

(۲) دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہند عبداللہ بن عامر بن کریز بن ربیعہ قریشی کی بیٹی تھی۔ باپ کے قتل ہونے کے بعد ہند حضرت علیؑ کے گھر آئی۔ امیرالمومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کے پاس رہنے لگی۔ جب اس کی خبر معاویہ کو ہوئی تو اس نے اسے اپنے بیٹے یزید کے عقد میں دے دیا۔

(۳) ایک کہانی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ پہلے یہ امام حسینؑ کے عقد میں تھی۔ امام حسینؑ کے طلاق دینے کے بعد یزید کے عقد میں آئی۔

نقد و تجزیہ

(۱) ہند اہل بیت کے گھرانے میں کیسے پہنچی؟ اس سے متعلق موجود روایات آپس میں متضاد و متصادم ہیں۔ کسی بھی نقل کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

(۲) معاویہ کی خواہش پر اہل بیت کا ہند سے دستبردار ہونا قابل فہم نہیں ہے۔ ایسے جود وسخا کا مظاہرہ کرنا کہ جس سے اہل بیت کے گھرانے کی تربیت شدہ خاتون کو ایک ایسے گھرانے میں منتقل ہونا پڑے جو دین و مذہب کو مسخ کرنے بلکہ دفن کرنے کا مرکز ہو؛ کیا انسانی نفس پر ظلم نہیں ہے؟ بظاہر ایسا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

(۳) کہتے ہیں کہ ہند عبداللہ بن عامر گریز کی بیٹی تھی۔ عبداللہ کس جنگ میں قتل ہوئے؟ کس کے رکاب میں جنگ کررہے تھے؟ باپ کے قتل ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ زندگی کے لئے اہل بیت کے گھرانے کو منتخب کرنے کی کیا منطق تھی؟ ان سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔

(۴) عبداللہ بن عامر بن کریز بن ربیعہ بن عبدالشمس بن عبد مناف حضرت عثمان کا خالہ زاد بھائی تھا۔ عثمان کی ماں؛ عروہ بنت قریش اور عبداللہ کی ماں؛ دجانہ آپس میں بہنیں تھیں لہٰذا یہ قریشی و عثمانی تھے۔ عثمان نے عبداللہ کو ابوموسیٰ اشعری کے بعد بصرہ کا والی بنایا پھر اس کو فارس کی حکومت دی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص عثمان کا خالہ زاد بھائی ہو؛ عثمان کے توسط سے گورنری جیسے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو رہا ہو؛ اس کی بیٹی اہل بیت کے گھر کیسے پہنچی اور امام حسینؑ نے اسے اپنے عقد میں کیسے لیا۔

(۵) طلاق شریعت میں ایک مذموم اور قبیح عمل ہے۔ اس کی مذمت کثیر روایات میں وارد ہوئی ہے۔ طلاق کی نوبت اس وقت آتی ہے جب زوجین کے درمیان نفرت؛ عداوت اور ناچاقی پیدا ہوتی ہے۔ حلم وصبر اور رحم وکرم کی مالک ذوات میں بیویوں کو طلاق دینے کی کوئی مثال نہیں ملتی؛ گرچہ وہ بدترین سلوک کی حامل ہی کیوں نہ ہوں لہٰذا قرآن کریم میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی خیانتوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن ان حضرات نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہو؛ اس کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح جعدہ بنت اشعث حضرت امام حسنؑ کے عقد میں تھی کہ جس کے ہاتھوں آپؑ شہید ہوئے۔ طلاق دل شکستگی کا سبب بنتا ہے۔ رحم وکرم

کی حامل کسی شخصیت سے ایسے فعل کا سرزد ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام حسینؑ کے ہند کو اگر وہ انکی زوجیت میں تھی' طلاق دینے کی کوئی منطق نظر نہیں آتی۔ آخر کس بنیاد پر امام حسینؑ نے طلاق دی؟

(۶) اگر یہ فرض کریں کہ طلاق خود ہند کی خواہش پر ہوئی تھی تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ ہند کے دل میں امام حسینؑ کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا ہوئے ہونگے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی اور کی محبت نے اسکے دل میں گھر کرلیا ہے۔ ایسی صورت میں طلاق کے بعد حسینؑ اور حسینؑ کے اہل بیت پر اس حد تک بے ساختگی اور پریشانی کا اظہار چہ معنی دارد؟

(۷) جب یزید ازدواجی زندگی کے قابل ہوا' اُس وقت ہجرت کا پچاسواں سال تھا کیونکہ یزید سنہ ۲۶ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ اس طرح سنہ ۴۵ ہجری میں اس کی عمر تقریباً بیس سال بنتی ہے جبکہ امام حسینؑ کی عمر اس وقت بیالیس سال تھی۔ ایک عورت جو بیالیس سالہ شخص کی زوجیت میں ہو' عمومی حالت میں وہ خود بھی عمر رسیدہ ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کوئی نوخیز جوان کسی عمر رسیدہ خاتون پر اس طرح فریفتہ ہو جائے۔ آخر اس میں کیا خاص منطق و فلسفہ ہوسکتا ہے جس کی بنیاد پر ہند نے یزید کی زوجیت اختیار کی ہو یا یزید نے ہند کو پسند کیا ہو؟ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

(۸) تواریخ میں لکھا ہے کہ یزید ایک زانی' شرابی اور شہوتی شخص تھا۔ اپنی خواہشات کو ناجائز طریقوں سے پورا کرنے کا عادی تھا۔ ان عورتوں کے نام تو تاریخ میں نہیں ملتے جن سے وہ اپنی خواہشات کو پورا کرتا تھا۔ لیکن جو عورتیں اس کی زوجیت میں تھی' انکے نام تاریخ میں ہیں۔ تاریخ میں یزید کی دو بیویوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک اُم خالد ہے کہ جس سے معاویہ پیدا ہوا اور دوسری اُم کلثوم۔ ہند نامی کسی بیوی کا ذکر کتب تواریخ میں نہیں ہے۔

(۹) معتبر و موثق مؤرخین اور مقتل نگاروں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اسیرانِ آلِ محمدؐ کو قصر یزید کے ایک حصہ میں ٹھہرایا گیا تھا کسی خرابہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جب خرابہ میں ٹھہرے ہی نہیں تھے تو وہاں ہند کے جانے کا کیا سوال؟

(۱۰) یزید کی ایک بیوی کا نام ام کلثوم تھا۔ ام کلثوم عبداللہ بن عامر کی بیٹی تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ زوجہ تھی اور یزید اس سے عشق و محبت کرتا تھا۔ ''تاریخ دولۃ اموی'' تالیف محمد عثمانی' صفحہ ۲۶۵ پر بھی عبداللہ بن عامر کی بیٹی کا نام ام کلثوم ہی لکھا ہے۔ محبت وولائے اہل بیت کے اس کے دل میں ہونے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے لہٰذا اس حوالے سے بھی ہند نامی عورت کا یزید کی زوجیت میں ہونا غیر مستند ہو جاتا ہے۔

(۱۱) اسیران آل محمدؐ کے شام میں داخل ہونے کے تین دن پہلے سے شہر کو سجایا اور بارونق بنایا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے قافلہ' اہل بیتؑ کو دروازۂ شام پر روکا گیا تھا۔ پورے شہر میں اہل بیتؑ کے ورود کے سلسلے میں شور شرابہ تھا۔ اس کے باوجود یہ ظاہر کرنا کہ یزید کے گھر والے' اہل بیت کی آمد اور ان کی شناخت سے بے خبر تھے' یہاں تک کہ انہیں اس حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے کسی خرابہ میں جانا پڑا' بعید از قیاس ہے۔

(۱۲) کتاب ''ناسخ التواریخ'' میں احوال امام حسنؑ کے ذیل میں لکھا ہے کہ ہند سہیل ابن عمرو کی بیٹی اور عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید کی بیوی تھی۔ عبدالرحمٰن کے مرنے کے بعد عبداللہ بن عامر کے عقد میں آئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد عبداللہ نے اسے طلاق دے دی۔ جب یہ خبر معاویہ کو پہنچی تو اس نے ابوہریرہ کو خط لکھا کہ ہند کو یزید کے نکاح میں لے آئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس من گھڑت قصہ کو افسانوی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ البتہ افسانے جس ترتیب و تنظیم کا تقاضہ کرتے ہیں' یہ اس سے بھی عاری ہے۔ اس قصے کو اور قصہ اسنب کو حیات ائمہ میں جن مذموم عزائم کے تحت جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے ہم آئندہ صفحات میں ان پر سے پردہ اٹھائیں گے۔

اُرینب

دنیاو مافیھا سے بلند و بالا' امام حسینؑ کی شخصیت اور آپ کا محیر العقول قیام' جہاں دنیا بھر میں آزادی کی خواہاں قوموں کے بنیان گزاروں کیلئے نمونہ عمل اور مشعل راہ بنا ہوا ہے' وہاں اس نور ہدایت کو مختلف شکلوں میں بجھانے کی ناپاک کوششوں کا بھی ایک سلسلہ جاری ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی اس قیام مقدس کے پس منظر کو ازدواجی معاملات سے منسلک و مربوط کرنا ہے۔ قصہ اُرینب انہی ناپاک عزائم کا حصہ ہے۔

اس قصے کو ابن قتیبہ دینوری (متولد سنہ ۲۱۳ھ متوفی سنہ ۲۷۶ھ) نے اپنی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' جلد اول صفحہ ۲۱۵ تا ۲۲۲ پر بغیر کسی سند کے "وذکروا" (یعنی انہوں نے ذکر کیا) کہہ کر نقل کیا ہے۔

کچھ اہل غرض حضرات نے اس سند کو غنیمت جانا کیونکہ انکے خیال میں فریق مخالف کے کیمپ سے کسی کا دشمن کے خلاف بیان' بجائے خود ایک سند ہے لہٰذا اگر ان کے ہاں سے دشمن کی تنقیص کا کوئی پہلو مل جائے تو بغیر تحقیق کے ہی بعض دوست اسے نقل کر دیتے ہیں۔ قصہ اُرینب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ قصہ بھی بغیر کسی تحقیق کے متعدد مؤرخین نے نقل کیا ہے۔ چنانچہ ذہبی نے اپنی کتاب ''تاریخ اسلام'' ...... میں صفحہ ۱۵۵ پر اسے ذکر کیا ہے اسی طرح کتاب ''نھایۃ العرب'' صفحہ ۱۸۰ اور کتاب ''الاتحاف بحب الاشراف'' صفحہ ۷۹ میں اس داستان کا بیان ہے۔ عماد زادہ نے ''زندگانی امام حسینؑ'' جلد اول میں' حتیٰ مرحوم آیت اللہ محسن امین نے اپنی کتاب مجالس السنیہ (مجلس نمبر ۲۲۴) میں اسے نقل کیا ہے۔

ابن قتیبہ اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۱۵ پر لکھتا ہے:

''یزید ابن معاویہ نے ایک رات بیداری میں گزاری۔ اس کے پاس ایک شخص جو معاویہ کا رفیق و وصیف تھا' بیٹھا ہوا تھا۔ یزید نے اس سے کہا' خدا امیر المومنین (معاویہ) کو باقی رکھے انہیں عافیت دے۔ میں جانتا ہوں امیر المومنین میرے بارے میں اچھے خیالات رکھتے ہیں اور میرے تمام مسائل پر توجہ کرتے ہیں۔ لیکن جو بات

میرے دماغ میں گھوم رہی ہے اور جس نے مجھے مصروف رکھا ہے' اس کے اظہار سے مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اس فکر نے مجھے ہر چیز سے باز رکھا ہے۔ امیر المومنین معاویہ میری اس حالت سے' میری خواہش اور حاجت سے اچھی طرح واقف بھی ہیں لیکن اس کے باوجود اس کو اہمیت نہیں دیتے ہیں' اس جانب توجہ نہیں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھاتے ہیں' حتیٰ میری پریشانی کے متعلق مجھ سے پوچھتے بھی نہیں کہ کیا ہوا ہے' کیا مسئلہ ہے؟ رفیق نے یزید سے پوچھا: آخر وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو اتنا پریشان کر رکھا ہے؟ خدارا اپنے آپ کو ان باتوں میں ضائع نہ کریں' اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ معاویہ کو آپ سے کس قدر محبت ہے' اپنی خواہش کا اظہار کر کے تو دیکھیں۔ یہ سن کر یزید نے خاموشی سے سر نیچے کر لیا۔ رفیق سمجھ گیا کہ یزید اپنی خواہش کا اظہار کرنے میں شرمندگی محسوس کر رہا ہے۔ لہٰذا وہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا معاویہ کے پاس گیا۔ معاویہ کے پاس جانے کے لئے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی' جب چاہے جا سکتا تھا۔ رفیق کے اس طرح بے وقت آنے پر معاویہ نے اس سے پوچھا: اس وقت آنے کا کیا سبب ہے؟ رفیق نے کہا: خدا امیر المومنین کو سلامت رکھے! میں آپ کے بیٹے یزید کے پاس بیٹھا تھا کہ انہوں نے باتوں میں اس طرح کی بات کہی ہے' اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہ سن کر معاویہ کو بہت غصہ آیا' کہنے لگا: افسوس کی بات ہے' میں نے تو کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی' اس کا پورا پورا خیال رکھا' کبھی اس کی خواہشات کی مخالفت نہیں کی جاؤ اسے میرے پاس بلا کے لاؤ۔ کہتے ہیں جب کبھی معاویہ کو مشکل پیش آتی تھی' ہمیشہ یزید سے مشورہ کیا کرتا تھا لہٰذا جب یزید کو معاویہ کا پیغام ملا تو اس نے سمجھا کہ معاویہ کو کسی مسئلے میں مشکل پیش آئی ہو گی' اس لئے مجھے بلایا ہے۔ وہ فوراً حاضر ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ معاویہ نے کہا: یزید! ہم نے تیرے کاموں میں کونسی کوتاہی کی ہے یا تیری سرپرستی میں کونسی کسر چھوڑی ہے جو تو اس طرح کی باتیں کر رہا ہے؟ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں اور تیرا کتنا خیال رکھتا ہوں؟ میں تو تیرے سوچنے سے پہلے تیری خواہش پوری کر دیتا ہوں۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو ان عنایات کے لئے میرا شکر گزار ہو گا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ تُو تو کفران نعمت کرتا ہے۔ ابھی یہ بات سننے میں آئی ہے کہ تو یہ کہ میں تیری حق تلفی کر رہا ہوں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے

میرا خوف نہیں آیا' اس خوف نے تجھے ایسی باتیں کرنے سے روکا نہیں' نہ حق پدری کا ہی تجھے کچھ خیال آیا؟ تو ایک عاق اولاد ہے۔ کیا تو نہیں جانتا ہے کہ میں نے تجھے تمام لوگوں پر' حتیٰ پیغمبر پر فضیلت دی' تجھے ان سب کا امام بنایا۔ ان میں جو ہستیاں ہیں کیا تو انہیں نہیں پہچانتا' کون ہیں؟

معاویہ کی باتیں سن کر یزید پسینہ میں ڈوب گیا اور بولا: آپ مجھ پر کفران نعمت کی تہمت نہ لگائیں' مجھے اپنے عقاب کا نشانہ نہ بنائیں۔ میں آپ کے احسانات کا مشکور و ممنون ہوں۔ میرا ہر قدم آپ کی خوشنودی کے لئے اٹھتا ہے۔ بہر حال پہلے آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے پھر بتاؤں گا کہ میں کس پریشانی میں مبتلا ہوں' جو میرے سر پہ سوار ہے اور میرے لئے عذاب بنی ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے اپنی اس پریشانی کو آپ سے پوشیدہ رکھا ہے بلکہ بار بار اس بات کی طرف آپ کو متوجہ بھی کیا ہے مجھے یقین تھا کہ آپ میری خواہش پوری کرینگے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ آج ایک بار پھر وہ مسئلہ آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں جس نے مجھے اس قدر پریشان کر رکھا ہے اور وہ ہے حسن و جمال اُرینب بنت اسحاق۔ اس عورت کا حسن و جمال زبان زد خاص و عام ہے۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے' اس کی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اسی روز سے میری آرزو تھی کہ اس سے شادی کروں۔ مجھے پوری امید تھی کہ آپ اس سلسلے میں ضرور کچھ کرینگے' لیکن آپ نے توجہ ہی نہیں دی۔ یہاں تک کہ اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ اسکے باوجود اس کی محبت میرے دل سے نہ نکل سکی۔ اس وقت سے میں بے صبری کے عالم میں زندگی گزار رہا ہوں۔ اب میرا راز فاش ہو گیا ہے۔

بہر حال اتنا تو میں ضرور کہوں گا کہ آپ نے میرے حق میں کوتاہی کی ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر عطا کرے معاویہ نے کہا: اچھا اب خاموش ہو جاؤ۔ یزید نے کہا: کیسے خاموش ہو جاؤں! میری تو آرزو ٹوٹ گئی ہے۔ اس پر معاویہ نے کہا: تمہاری عقل و مروّت کو کیا ہو گیا' تقویٰ کہاں گیا؟ یزید نے جواب دیا: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواہشات' صبر و عقل پر غالب آجاتی ہیں۔ معاویہ بولا: تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں کی۔ یزید نے جواب دیا: میں بالکل مطمئن تھا کہ آپ ضرور کچھ کریں گے۔ اس پر معاویہ نے کہا: تم سچ کہتے ہو لیکن ابھی اس بات کو چھپا کر رکھو' اپنی خواہشات پر صبر کو غلبہ دو اور خدا سے دعا کرو' اس کا اظہار سود مند نہیں۔ خدا تمہاری آرزو پوری کرے گا۔ جو کچھ ہونا ہے' وہ ہو کر رہے گا۔"

اُرینب بنت اسحٰق اپنے دور کی ایک مال دار خاتون اور کمال و شرافت اور حسن و جمال کا نمونہ تھی۔ اس نے اپنے چچا کے بیٹے عبداللہ بن سلام سے شادی کی تھی جسے معاویہ کے نزدیک بڑا مقام حاصل تھا۔ لیکن اسکے دل میں یزید کا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند تھا۔

یزید کی گفتگو سننے کے بعد معاویہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح اُرینب تک رسائی ممکن ہو تا کہ یزید کی خواہش پوری کی جا سکے۔ عبداللہ بن سلام اس دور میں عراق کا گورنر تھا۔ چنانچہ معاویہ نے اس کو لکھا کہ خط ملتے ہی میرے پاس حاضر ہو جاؤ' کسی اہم مسئلے پر تم سے مشورہ کرنا ہے۔ عبداللہ بن سلام جب شام پہنچا تو معاویہ نے اس کو الگ کمرے میں بٹھایا۔

معاویہ کے پاس اس وقت ابو ہریرہ اور ابو درداء' دو اصحاب رسول بھی موجود تھے اس نے ابو ہریرہ اور ابو درداء سے کہا کہ خدا نے اپنے بندوں میں نعمتوں کو تقسیم کیا اور ہمیں ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس ذات پاک نے ہماری تمام خواہشات کو پورا کیا۔ بس میری ایک بیٹی ہے میں اس کی شادی ایک ایسے شخص کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جو میری ہدایت پہ چلے اور میری پیروی کرے۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بعد اس حکومت پر کوئی ایسا شخص قابض نہ ہو جائے جو غرور سلطنت میں مبتلا ہو، اپنی عورتوں کے ساتھ مصروف رہے اور میری اس بیٹی کے کفو کا خیال نہ کرے لہٰذا میں نے عبداللہ بن سلام کا انتخاب کیا ہے' کیونکہ وہ دیندار بھی ہے اور صاحب فضل و مروّت بھی۔ معاویہ کی باتیں سن کر ابو ہریرہ اور ابو درداء نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کیجئے' آپ صحابی رسول اللہ بھی' ہیں اور کاتب وحی بھی۔ خدا آپ کی یہ آرزو بھی پوری فرمائے گا۔

معاویہ نے ان دونوں صحابیوں سے کہا کہ آپ لوگ جا کر عبداللہ بن سلام کو میری طرف سے پیغام دیں کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دختر ان کے عقد میں دے دوں۔ البتہ آخری فیصلہ کرنے کا اختیار خود لڑکی کو ہے' تا ہم مجھے امید ہے کہ میری بیٹی میری رائے سے اختلاف نہیں کرے گی۔

اِدھر ابو ہریرہ اور ابو درداء' معاویہ کا پیغام لیکر عبداللہ بن سلام کے پاس آئے اُدھر معاویہ اپنی بیٹی کے پاس

گیا۔ اس سے کہا اگر ابوہریرہ وابودرداتمہارے پاس آئیں اور تم سے عبداللہ بن سلام کے ساتھ شادی کرنے کی بات کریں اور کہیں کہ خود میں نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا ہے تو ان سے کہنا کہ عبداللہ بن سلام تو اچھا کفو ہے‘ قریش بھی ہے اور رشتہ دار بھی لیکن وہ تو پہلے سے شادی شدہ ہے‘ ارینب بنت اسحٰق اس کی زوجیت میں ہے۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے ساتھ بھی وہی نہ ہو جو عام طور پر عورتوں کے ساتھ ایسی صورت میں ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خدا مجھ سے ناراض ہو کر عذاب نازل نہ کر دے۔ لہٰذا جب تک وہ ارینب سے علیحدگی اختیار نہ کرلیں میں ان سے شادی نہیں کرسکتی۔

اُدھر ابوہریرہ ابودرداء کی زبانی معاویہ کا پیغام سنکر عبداللہ بن سلام خوش ہوگیا۔ خدا کا شکر ادا کیا اور معاویہ کے حق میں دعا کی‘ خدا امیر کی حکومت کو ترقی عطا کرے۔ اس کے احسانات کا ذکر کیا‘ اس کی تعریفیں کیں‘ پھر انہی دونوں کے ذریعہ معاویہ کے پاس اسکی بیٹی کی خواستگاری کا پیغام بھیجا۔ لیکن معاویہ نے خود کوئی جواب دینے کے بجائے ان سے کہا کیا تم دونوں نہیں جانتے کہ اس بات کا اختیار میں نے اپنی بیٹی کو دے رکھا ہے۔ میری تو خواہش یہی ہے کہ ایسا ہو جائے۔ اب تم دونوں جا کر خود اس سے بات کرو۔ چنانچہ ابوہریرہ وابودرداء دونوں معاویہ کی بیٹی کے پاس گئے‘ اپنا مدعا بیان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ جہاں تک اسکے والد کا تعلق ہے وہ پہلے ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر چکے ہیں۔ بیٹی نے وہی جواب دیا جو باپ نے پہلے سے سکھا رکھا تھا۔

جب عبداللہ بن سلام کو پتہ چلا کہ معاویہ کی بیٹی سے شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں‘ سوائے اسکے کہ وہ اپنی پہلی بیوی ارینب کو طلاق دیدے تو اس نے فوراً ہی ان دونوں کو گواہ ٹھہرا کر ارینب کو طلاق دیدی اور ان سے کہا کہ آپ دونوں سیدھے معاویہ کے پاس جائیں اور انہیں بتادیں کہ میں نے ارینب کو طلاق دے دی ہے۔

جب معاویہ کو یہ خبر ملی تو اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ کہنے لگا کہ عبداللہ بن سلام نے بیوی کو طلاق دے کر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ میں یہ تو نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ جلدبازی کرنے کے بجائے صبر سے کام لیتے تو شاید ہم اسکا کوئی بہتر حل نکال لیتے۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا‘ اب کیا ہوسکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بندے کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں کیونکہ تقدیر کا مالک خدا ہے‘ جو کچھ ہونے والا تھا وہ پہلے ہی خدا کے علم میں تھا۔ بہرحال فی الحال

آپ دونوں یہاں سے جایئے‘ بعد میں کسی وقت آجائیں‘ انشاءاللہ ہماری رضا آپ کو مل جائے گی۔ اس کے بعد معاویہ نے فوراً یزید کو خط لکھا کہ عبداللہ بن سلام نے ارینب بنت اسحٰق کو طلاق دے دی ہے۔

ابوہریرہ وابودرداء دوبارہ معاویہ کے پاس گئے تاکہ اسکی رضامندی حاصل کرسکیں۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ میں بیٹی کو مجبور نہیں کرسکتا‘ وہ خود مختار ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ایک بار پھر اسکی بیٹی کے پاس آئے اور بولے کہ تمہارے والد راضی ہوگئے ہیں‘ صرف تمہاری رضامندی چاہیئے۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے‘ عبداللہ بن سلام نے تمہاری خوشی کی خاطر اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اسکے بعد انہوں نے عبداللہ بن سلام کے فضل ومروّت اور ادب کا ذکر کیا۔ یہ سننے کے بعد لڑکی نے جواب دیا: جو کچھ ہونا تھا ہوگیا‘ قلم کی سیاہی سوکھ گئی۔ میں مانتی ہوں کہ قریش میں وہ ایک بلند مرتبہ پر فائز ہیں لیکن خداوند عالم اپنی مخلوق کے فیصلے خود کرتا ہے‘ وہ اپنی نعمتوں کو خود تقسیم کرتا ہے اور ہر چیز کو مناسب جگہ پر رکھتا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ ہر شخص کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ شادی کا معاملہ عجیب ہے۔ بسا اوقات مذاق حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ سب مقدر کا کھیل ہے اور انسان کا مقدر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں‘ میں خود بھی سوچوں گی اور خدا سے دعا کروں گی۔

معاویہ کی بیٹی کا جواب سنکر یہ دونوں یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ: ”خدا تمہیں نیک ہدایت دے“۔ ادھر لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ آخر کیا بات ہے عبداللہ بن سلام نے بغیر کسی سبب کے اپنی بیوی کو کیوں طلاق دے دی؟ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ضرور اس میں معاویہ کی کوئی چال ہے۔ ادھر ابوہریرہ‘ ابودرداء اور عبداللہ نے مسئلہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اس کام سے جلد از جلد فارغ ہو جانا چاہیئے۔

چنانچہ ابوہریرہ اور ابودرداء ایک مرتبہ پھر معاویہ کی بیٹی کے پاس آئے اور کہا: ہم آپ کے وعدہ کے تحت یہاں آئے ہیں۔ اب بتایئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اگر آپ خدا سے خیر چاہتی ہیں تو یقیناً آپ کو خیر عطا فرمائے گا کیونکہ جو خدا سے ہدایت طلب کرتا ہے خدا اسے ہدایت دیتا ہے۔ معاویہ کی بیٹی بولی کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے خیر عطا کیا‘ کسی دوسرے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا۔ اسی طرح بہت سی عذر خواہیاں کرتے

ہوئے کہنے لگی کہ میں نے عبداللہ کے متعلق مختلف ذرائع سے تحقیق ومشورہ کیا ہے۔ اس مسئلہ پر لوگوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے اس شادی سے منع کیا ہے جبکہ بعض دوسرے اسکے حق میں ہیں۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے میں نے یہی سمجھا ہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ یہ شادی ہو۔ جب یہ لوگ اس جواب کولیکر عبداللہ بن سلام کے پاس پہنچے تو وہ سمجھ گیا کہ اسے دھوکہ ہوا ہے اور پریشانیوں نے اسے گھیر لیا ہے بہر حال اس کو ہوش آیا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا' اپنے آپ کو تسلی دی اور کہنے لگا خدا جو چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے' کوئی اسے روکنے والا نہیں۔ جو کچھ خدا کی مشیت میں تھا' وہی ہو کر رہا۔

رفتہ رفتہ خبر عام ہوگئی۔ بات شہر' شہر' قریہ' قریہ میں پھیل گئی۔ لوگ خلوت وجلوت میں' اپنی محفلوں اور تنہائیوں میں' اس سلسلے میں گفتگو کرنے لگے۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ یہ سب معاویہ کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے دھوکہ دے کر عبداللہ بن سلام سے اس کی بیوی کو طلاق دلوائی ہے۔ لوگ معاویہ کی مذمت کرنے لگے' کہنے لگے کہ کیسا بدترین انسان ہے جو لوگوں کا امیر بنا بیٹھا ہے۔ جب یہ باتیں معاویہ تک پہنچیں تو بولا یہ سب باتیں بالکل غلط ہیں۔ میں نے کسی دھوکہ نہیں دیا' اس معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

طلاق کی عدت پوری ہوگئی تو معاویہ نے ارینب کے لئے یزید کی خواستگاری کا پیغام دے کر ابو درداء کو عراق بھیجا۔ جب وہ عراق پہنچے تو معلوم ہوا کہ حسینؑ بھی وہاں موجود ہیں۔ امام حسینؑ اپنے تقویٰ اور جود وسخا کے لئے مشہور تھے۔ ابو درداء نے سوچا کہ صاحب عقل ومعرفت کیلئے سزاوار ہے کہ اپنے امور کا آغاز واجبات کی ادائیگی سے کرے۔ حسینؑ فرزند فاطمہؑ ہیں' جوانان جنت کے سردار ہیں۔ میرے لئے مناسب نہیں کہ ان کی ملاقات پر کسی اور کام کو ترجیح دوں لہٰذا فیصلہ کیا کہ پہلے ان کی زیارت کروں گا' ان کا حق ادا کروں گا' پھر اپنی مہم کی طرف جاؤں گا۔ چنانچہ پہلے وہ حسینؑ سے ملنے کے لئے آئے۔ جب امام حسینؑ نے ان کو آتے دیکھا تو اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا' ان کا احترام کیا۔ چونکہ ابو درداء صحابیٔ رسولؐ تھے' اسلئے رسول اللہؐ کی خاطر آپؑ نے انکے مقام ومنزلت کا پاس ولحاظ رکھا۔

حسینؑ نے ابو درداء سے فرمایا: اے صحابیٔ رسولؐ آپ کے دیدار نے میرے اندر شوق دیدار رسول اللہ کو پھر

سے ابھار دیا ہے' میری سرد شدہ حزن کی آگ کو بھڑکا دیا ہے۔ جب مجھے رسول اللہؐ کا کوئی ساتھی نظر آتا ہے تو میری آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ حسینؑ کی ان باتوں سے ابو درداء کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' انہیں بھی رسول اللہؐ یاد آ گئے۔ کہنے لگے خدا کا شکر ہے اس نے آپ تک پہنچایا' آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ سن کر امام حسینؑ نے فرمایا: میں بھی تم سے ملنے کی تمنا رکھتا تھا' تمہارے دیدار کا شائق تھا۔

اس گفتگو کے بعد ابو درداء نے عراق آنے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا: مجھے معاویہ نے ارینب بنت اسحٰق کے ساتھ اپنے بیٹے یزید کی خواستگاری کے واسطے بھیجا ہے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ آپ بھی یہاں موجود ہیں تو میں نے سوچا کہ سب سے پہلے آپ کی زیارت کروں۔ حسینؑ نے ادائے تشکر کے بعد فرمایا: اس کے ساتھ نکاح کا خیال تو مجھے بھی تھا۔ اس کی عدت ختم ہونے کا انتظار تھا' سو وہ ہوگئی۔ اب اس سلسلے میں آپ سے بڑھ کر موزوں ومناسب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے خدا نے آپ کو اسی کام کیلئے یہاں بھیجا ہے آپ انہیں میرا پیغام بھی دیں اور ان سے کہیں کہ خدا نے جسے انکے لئے منتخب کیا ہے' اسی کو انتخاب کریں۔ یہ باتیں آپ کے پاس میری امانت ہیں جنہیں آپ ان (ارینب) تک پہنچا دیں۔ جہاں تک مہر کا تعلق ہے تو جتنا وہ دینگے' میں بھی اتنا ہی ادا کروں گا۔ ابو درداء نے وعدہ کیا کہ وہ انشاءاللہ اس فریضہ کو انجام دینگے۔

جب ابو درداء ارینب بنت اسحٰق کے پاس پہنچے تو اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے عورت! خدا نے ہر چیز کو اپنی قدرت سے خلق کیا ہے۔ ہر چیز کی ایک قدر ومنزلت ہے۔ یہ دنیا دارالاسباب ہے' اس سے فرار ممکن نہیں۔ علم خدا سے کوئی شے باہر نہیں نکل سکتی' جو کچھ تیرے ساتھ ہوا' سو ہوا۔ عبداللہ بن سلام سے جدائی کو تقدیر کا لکھا سمجھو۔ ہو سکتا ہے یہ تمہارے لئے زیادہ نقصان دہ نہ ہو بلکہ اس میں تمہارے لئے خدا نے خیر کثیر رکھا ہو۔ دیکھو خداوند عالم کے فضل سے اس امت کے امیر نے تم سے زوجیت کی خواہش کی ہے۔ ایک طرف شہزادہ بلکہ ولی عہد سلطنت نے' اس خلیفہ کے بعد بننے والے خلیفہ' یعنی یزید ابن معاویہ نے خواہش کی ہے اور دوسری طرف فرزند فاطمہؑ وعلیؑ جو پیغمبر اسلامؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں' جوانان جنت کے سردار ہیں' انہوں نے تم سے منگنی کی درخواست کی ہے۔ دونوں حضرات کے فضل ومقام تمہارے لئے آشکار وروشن ہیں' تم سب

کچھ جانتی ہو۔میں دونوں طرف سے ولی بن کے آیا ہوں۔تمہیں اختیار ہے' دونوں میں سے جسے چاہے انتخاب کرو۔ارینب خاموشی سے یہ باتیں سنتی رہیں۔جب گفتگو ختم ہوگئی تو اپنی جگہ سے اٹھیں اور بولیں:

اے ابو درداء! اگر یہ مسئلہ مجھے پیش آتا اور آپ یہاں نہ ہوتے' تب بھی میں مشورہ کیلئے کسی کو آپ کے پاس بھیجتی۔دور ہونے کے باوجود مشورہ آپ ہی سے لیتی۔اب یہ میری خوش نصیبی ہے کہ جس سے مشورہ کرنا تھا وہ خود ہی یہاں موجود ہے۔میں اپنے تمام اختیارات آپ کے سپرد کرتی ہوں۔خدا کے بعد آپ کو اپنا ولی سمجھتی ہوں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ آپ خود میرے لیے ان دونوں میں جو بہتر ہو اُس کا انتخاب کریں۔ اس امر پر خدا کو شاہد و گواہ قرار دیتی ہوں۔ایک پاکباز و متقی شخص جس طرح فیصلہ کرتا ہے' آپ اسی طرح فیصلہ کریں۔اپنی خواہشات کو اس معاملہ میں بالکل شامل نہ کریں۔ان دونوں شخصیتوں سے آپ اچھی طرح واقف ہیں' کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں۔ابو درداء نے جواب دیا: اے عورت! میری ذمہ داری آپ کو آگاہ کرنا تھا' سو میں نے کردیا۔جہاں تک انتخاب کا تعلق ہے' وہ آپ خود کریں۔ارینب بولیں: خدا آپ کو بخش دے۔میں آپ کے بھائی کی بیٹی ہوں' مشورہ لینے میں آپ سے بے نیاز نہیں ہو سکتی اور نہ حق بات کرنے میں کسی سے خوفزدہ ہوں۔جو مسئلہ میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے' آپ خود ہی بتلایئے' یہ آپ کی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ خدا خوب جانتا ہے کہ میرے اندر کیا چیز ہے۔وہ خبیر و لطیف ہے۔جب ابو درداء نے دیکھا کہ اس مسئلہ سے پہلو تہی کرنے کا کوئی چارہ نظر نہیں آتا تو سوچا کہ اب تو حقیقت بتانی ہی پڑے گی۔آخر کار انہوں نے کہا: اے میری بیٹی! فرزند فاطمہ میرے نزدیک زیادہ لائق و سزاوار ہیں۔خدا سب سے زیادہ جانتا ہے کہ کون بہتر ہے۔میں نے خود رسول اللہؐ کو اپنی زبان حسینؑ کے منہ میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔لہٰذا بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اپنا منہ اس ہونٹ پر رکھو' جسے رسول اللہؐ نے بوسہ دیا ہے۔یہ سن کر ارینب نے کہا: میں نے بھی انہی کا انتخاب کیا تھا' میں ان پر بالکل راضی ہوں۔اس طرح ارینب بنت اسحٰق حسینؑ ابن علیؑ کے عقد میں آگئیں جسکے عوض انہیں بہت مہر ادا کیا گیا۔

جب یہ خبر معاویہ کو ملی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ارینب سے نکاح کر لیا ہے اور اسے کثیر رقم بطورِ مہر

عنایت کی ہے تو اسے بہت برا لگا۔ابو درداء کی ملامت کرتے ہوئے بولا' اگر کسی احمق اور اندھے ہی کو اس کام کیلئے بھیجا جاتا تو وہ بھی اپنی خواہش کے مطابق ایسا ہی کرتا۔میری رائے اس کی رائے سے بدتر ہے' لہٰذا مجھے اس کی ملامت کرنے کی بجائے اپنی ہی ملامت کرنا چاہئے کیونکہ میں نے ہی اسے اس کام کیلئے منتخب کیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد معاویہ نے عبداللہ بن سلام کو نظر انداز کرنا شروع کردیا۔اس کے رواتب بند کردئے اور اسے عہدہ سے بھی ہٹا دیا' کیونکہ اس نے معاویہ کو برا بھلا کہا تھا اور اس پر دھوکہ دینے کا الزام عائد کیا تھا۔اب عبداللہ بن سلام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔مدت گزری' اس کے ہاتھ میں جو کچھ تھا سب ختم ہو گیا تھا اپنے نفس کی ملامت کی وجہ سے وہ شام چھوڑ کر عراق کی طرف نکل کھڑا ہوا۔اس وقت اسے یاد آیا کہ جدا ہونے سے پہلے اس نے ارینب کے پاس جواہرات کی کچھ تھیلیاں چھوڑی تھیں' جو اسکی دولت کا بڑا حصہ اور اسکی پسندیدہ دولت تھی۔دل میں خیال پیدا ہوا کہ معلوم نہیں ارینب نے اس دولت کا کیا حشر کیا ہوگا۔اب اسے فکر لاحق ہو گئی کہ کیسے اپنی اس دولت تک پہنچا جا سکتا ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ ارینب سرے سے انکار ہی کردے' کیونکہ اس کے ساتھ برا سلوک کیا گیا تھا بغیر کسی قصور کے اسے طلاق دی گئی تھی۔

عراق پہنچنے پر اسکی ملاقات امام حسینؑ سے ہوئی۔امامؑ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے بعد اس نے کہا: کیا آپ جانتے ہیں کہ میں آپ پر فدا ہوں؟ جو کچھ ارینب کے طلاق کے حوالے سے تقدیر الٰہی میں تھا' اس سے تو آپ واقف ہی ہیں۔عرض یہ ہے کہ اس سے جدا ہونے سے پہلے میں ایک عظیم دولت اس کے پاس چھوڑ گیا تھا۔آج تک کسی قسم کی برائی یا خیانت میں نے اس سے نہیں دیکھی ہے' اچھائی ہی دیکھی ہے۔آپ اسے یاد لا کر کہئے کہ میری امانت واپس کردے۔خدا اسے جزائے خیر اور اجر عظیم عطا کرے گا۔عبداللہ بن سلام یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

امام حسینؑ گھر میں تشریف لے گئے اور ارینب سے کہا: عبداللہ بن سلام آیا ہے' تمہاری بہت تعریف کر رہا ہے۔کہتا ہے کہ تم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے اور ہمیشہ امانت داری کے ساتھ رہی ہو۔یہ بات مجھے پسند آئی اور ساتھ تعجب بھی ہوا کہ پھر ایسی نیک خاتون کو طلاق کیوں دی۔وہ کہتا ہے کہ جدائی سے پہلے کوئی مال

اس نے تمہارے پاس چھوڑا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس کی امانت اسے واپس لوٹا دو۔

ارینب نے کہا: جو کچھ اس نے کہا ہے' سچ ہے۔ اس نے میرے پاس امانت چھوڑی تو تھی' لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے کیونکہ اس پر مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ سن کر امام حسینؑ نے ارینب کی تعریف کی اور اس سے کہا میں اسے تمہارے پاس لاتا ہوں' تم خود اس کی امانت اسے واپس لوٹا دو۔ پھر آپؑ عبداللہ بن سلام کے پاس واپس آئے اور فرمایا کہ ارینب نے تمہارے مال سے انکار نہیں کیا ہے' جس حال میں تم نے وہ مال اس کے سپرد کیا تھا وہ اسی حالت میں ہے' جا کر اس سے لے لو۔ پھر آپ عبداللہ بن سلام کو لیکر خود ارینب کے پاس آئے اور کہا: یہ عبداللہ بن سلام ہے، اسکی امانت اسے اسی طرح واپس کر دو، جس طرح اس نے تمہارے سپرد کی تھی۔ ارینب نے وہ تھیلیاں اس کے سامنے رکھ دیں اور بولیں یہ رہا تمہارا مال۔ عبداللہ نے ارینب کا شکریہ ادا کیا اور تعریف کی۔ اسی اثنا میں امام حسینؑ وہاں سے باہر نکل گئے۔ عبداللہ بن سلام نے تھیلیاں کھولیں' کچھ اشرفیاں نکال کر ارینب کو دیں اور کہا یہ مختصر سا تحفہ تم لے لو۔ اس پر دونوں رونے لگے اور کہنے لگے کس مصیبت میں ہم مبتلا ہو گئے۔ جب امام حسینؑ دوبارہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا دونوں رو رہے ہیں۔ انکو روتا ہوا دیکھ کر امام پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ آپ نے فرمایا: خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ارینب کو میری طرف سے ''تین مرتبہ طلاق'' ہے۔ خداوندا! تو شاہد ہے کہ میں نے ارینب سے نہ دولت کی خواہش میں نکاح کیا تھا اور نہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر۔ بلکہ اسے لئے نکاح میں لایا تھا تا کہ عبداللہ بن سلام کیلئے محفوظ رکھوں۔ اسکے بعد آپ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی' اے خدا! یہ کام میں نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیا ہے اور تجھ ہی سے اجر و ثواب کا طالب ہوں۔

امامؑ نے طلاق دینے کے بعد ارینب سے مہر بھی واپس نہیں لیا۔ عبداللہ بن سلام نے ارینب سے کہا کہ امام حسینؑ کو کچھ معاوضہ ادا کرو۔ لیکن امامؑ نے کسی قسم کا معاوضہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ صرف خدا سے اس سلسلے میں ثواب کی توقع رکھتا ہوں' میرے لئے وہی کافی ہے۔ اس طرح عبداللہ بن سلام نے ارینب سے دوسری مرتبہ عقد کیا اور دونوں ایک مرتبہ پھر محبت اور خلوص کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔"

یہ قصہ قتیبہ دینوری نے اپنی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' میں "و ذکــروا" کے لفظ سے شروع کیا ہے اور کوئی سند نہیں پیش کی ہے۔ اسکے علاوہ عماد زادہ اصفہانی نے ''زندگانی امام حسینؑ'' میں محسن امین نے ''مجالس السنیہ'' میں اور عبداللہ علائلی نے ''الامام الحسینؑ'' میں اسے ذکر کیا ہے۔ ان حضرات نے اس قصے کو حیات امام حسینؑ اور قیام امام حسینؑ میں ذکر کرنے کے بعد اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاویہ نے لوگوں کی گھریلو و خاندانی زندگی میں بھی مداخلت شروع کر دی تھی۔

اہل تحقیق و نظر اس وقت تک کسی معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے' جب تک اس سے متعلق تمام کرداروں کا مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تفصیلی تجزیہ و تحلیل نہ کر لیں اور یہ نہ دیکھ لیں کہ اس واقعہ یا قصہ میں کس کا کردار زیادہ ہے یا کس کو زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بعض مؤلفین و مصنفین یا عام طور پر قاری حضرات کسی واقعہ کی صحت اور سند کے حوالے سے یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں انکے مخالفین کی مذمت کی گئی ہے یا کم از کم ان کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ یہ سب کچھ خواہ من گھڑت اور خود ساختہ ہی کیوں نہ ہو' اسے معتبر سمجھا جاتا ہے کیونکہ دشمن کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر کسی واقعہ میں ائمہ اہل بیت کی شان میں کسی زاویئے سے فضیلت کا پہلو نکلتا ہو تو اسے بھی من و عن قبول کر لیتے ہیں' خواہ اس میں کسی دوسرے زاویئے سے (نعوذباللہ) انکی تنقیص و مذمت کا پہلو ہی کیوں نہ نکلتا ہو۔ مروج قصے' کہانیوں کی نوعیت کچھ اسی طرح ہے۔

نقد و تجزیہ

افسانۂ ارینب کے تجزیہ و تحلیل اور اس پر وارد اشکالات پیش کرنے سے پہلے قارئین کرام کی خدمت میں ایک نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جس طرح کسی حادثے کے وجود میں علت تامہ کے ساتھ بعض علل ناقصہ کا بھی ذکر ہوتا ہے' اسی طرح اس قصے میں بھی بنیادی و اساسی نقد و اعتراض کے علاوہ کچھ غیر اساسی و غیر بنیادی اعتراضات بھی شامل ہوں گے۔ ہم اپنا نقد و تجزیہ پیش کرتے وقت' ایسے تمام اعتراضات کو ایک ساتھ خلاف قیاس و قرینہ قرار دے کر پیش کرینگے تا کہ یہ ان اہم اور بنیادی نقد و اعتراض کیلئے معاون و مددگار ثابت

ہوسکیں لہٰذا ہمارے نقد پر یہ کہہ کر تنقید کرنا کہ ان کا انتقاد کمزور ہے' مناسب نہیں ہوگا۔ گرچہ اس کمزوری کا ہمیں خود بھی اعتراف ہے' اسکے باوجود اس طرح پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مذکورہ حالات و واقعات کے پیش نظر' ایسی چیزیں عام طور پر رونما نہیں ہوا کرتیں۔ ایسے واقعات کے رونما ہونے کیلئے استثنائی ماحول و تقاضہ کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ کوئی واقعہ خود قابل فہم و ادراک ہے' اس پر ایک اور بنیاد کھڑی کرنا مناسب نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ آیا حقیقت میں ایسا کوئی واقعہ پیش بھی آیا ہے' یا یہ سب محض افسانہ تراشی ہے۔ اس بات کی تہہ تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں بیان کردہ تمام کرداروں کا قصے کی مناسبت سے جائزہ لیا جائے۔ لہٰذا ہم پہلے اس قصے میں بیان کردہ شخصیات اور دیگر عناصر کو ترتیب وار پیش کرینگے اور پھر ان میں سے ہر ایک کے بارے میں گفتگو کریں گے:

۱۔ سب سے پہلا کردار خود ابن قتیبہ دینوری کا ہے جو کتاب ''الامۃ والسیاسۃ'' کے مؤلف ہیں۔ دیگر مصنفین اور مؤرخین نے اس واقعہ کو انہی سے نقل کرنے کے بعد اپنے زاویۂ نگاہ سے اس پر تجزیہ و تبصرہ کیا ہے۔

۲۔ یزید ابن معاویہ جس سے قصہ کا آغاز ہوتا ہے۔

۳۔ ایک شخص رفیق و وصیف جسے یزید و معاویہ کا محرم راز بتایا گیا ہے۔

۴۔ خود معاویہ ابن ابی سفیان

۵۔ ارینب نامی خاتون جو حسن و جمال اور دیگر صفات میں اپنی مثال آپ تھی۔ کہتے ہیں دنیا بھر کے شہزادوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

۶۔ عبداللہ بن سلام جو اس رقابت میں یزید پر سبقت لے گیا' ارینب اس کے عقد میں آ گئی۔

۷۔ ابو درداء اور ابو ہریرہ جنہوں نے معاویہ کی خواہش پر ارینب کو عبداللہ بن سلام سے طلاق دلوائی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے انہوں نے عبداللہ کو معاویہ کی دامادی کا سبز باغ دکھایا۔

۸۔ دختر معاویہ جس نے پہلے مرحلے میں رضائیت' دوسرے مرحلے میں مشروط رضائیت اور تیسرے مرحلے

میں انکار کر کے عبداللہ بن سلام کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

۹۔ امام حسینؑ جنہوں نے بقول قصہ ساز معاویہ و یزید کی اس گھناؤنی سازش کو نا کام بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

۱۰۔ افسانہ کا جغرافیہ۔ اس قصے میں دو جگہوں کا ذکر آیا ہے ایک شام اور دوسرے عراق۔

۱۱۔ زمان قصہ۔ سنہ ۵۴ ہجری سے سنہ ۶۰ ہجری کا دورانیہ۔

۱۲۔ فقہ ازدواج و طلاق۔ مکتب اہل بیت میں۔

اپنی بات شروع کرنے سے قبل ایک بات یہ بتاتے چلیں کہ ہم اس واقعہ کی بنیاد پر نہ تو کسی برائی' سازش اور جرم و جنایت کو ثابت کر سکتے ہیں' نہ اس سے ہمارے کسی مقتدا و پیشوا کی مدح و صفت بیان ہو سکتی ہے اور نہ ہی انکی انسان دوستی کے کردار کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس قصے کے بیان سے نہ تو اس کے کرداروں کی امانت داری ثابت ہو سکتی ہے اور نہ ہی خیانت کاری۔

یہ سب کچھ صرف اسی صورت میں منطقی و عقلی ہو سکتا ہے جب اصل واقعہ کی تاریخ میں ایک مسلمہ حقیقت ہو' اس کے تمام زاویے اور گوشے کلی طور پر ناقابل تردید ہوں' یا کم سے کم اس کی زیادہ تر باتیں حقائق پر مبنی ہوں۔ اگر کوئی واقعہ ان تمام شرائط پر پورا اترے تب کہیں جا کر اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر قصہ کی بنیاد ہی من گھڑت اور جعلی ہو' کسی بھی زاویے اور سمت سے اس کو سہارا دینا ممکن نہ ہو تو ایسے قصے سے نہ کسی کی تعریف ممکن ہے اور نہ مذمت۔ غلط بنیادوں پر دشمن کی مذمت کرنا' درحقیقت اس کو بہت سے جرائم و برائیوں سے بری کرانے کے مترادف ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے ان سے دشمنی برتنے میں کسی اصول و ضابطہ کا خیال نہیں رکھا۔ ایسی صورت میں دوسروں کی نظر میں آپ کے الزامات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی لہٰذا اس قصہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام نکات کا غیر جانبدارانہ اور محققانہ انداز میں تحلیل و تجزیہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

۱۔ کتاب **''الامامۃ والسیاسۃ''**

تالیف: مؤرخ ابی محمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ دینوری متولد ۲۱۳ھ متوفی سنہ ۲۷۶ھ

۱۔ اپنی قدامت کی بنا پر یہ کتاب مصادر تاریخ میں شمار ہوتی ہے کیونکہ کسی کتاب کی قدامت بھی ایک سند سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے مؤلفین و مؤرخین بغیر کسی نقد و تجزیہ کے اس سے نقل کرتے ہیں۔ لیکن کسی مؤرخ، فیلسوف یا محقق نے اس بات کو تاریخ کے ایک مسلمہ اصول کے طور پر تسلیم نہیں کیا ہے کہ کسی واقعہ کی صحت کیلئے اسکا قدیم ترین مصادر تاریخ سے مل جانا ہی کافی ہے۔ اگر کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' میں ابن قتیبہ کے ترتیب شدہ تمام تاریخی واقعات اوروں کیلئے بھی مسلمہ حقیقت ہوتے تو طبری، کامل ابن اثیر، مسعودی، یعقوبی و دیگر بزرگ مؤرخین بھی اپنی اپنی تواریخ میں اسے نقل کرتے۔ جبکہ انہوں نے اس کو نقل کرنے سے گریز کیا۔ کیوں؟

۲۔ خود ابن قتیبہ نے اس قصے کو بیان کرتے وقت "وذکروا" کہہ کے نقل کیا ہے۔ "وذکروا" کا فاعل کون ہے؟ ان سے پہلے کونسی تاریخ چلتی تھی؟ کس راوی سے نقل کیا ہے؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ "وذکروا" کہہ کر فاعل کا ذکر نہ کرنا، اس قصے کے مخدوش ہونے کی بذات خود دلیل ہے۔

۳۔ ابن قتیبہ کی ولادت بنو عباس کے دور میں ہوئی جب مامون خلیفۂ وقت تھا۔ اس دور کو جہاں مختلف علوم میں تحقیقات کا دور سمجھا جاتا ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لوگوں کو مصروف رکھنے کیلئے بے مقصد بحث و گفتگو بھی چلتی رہتی تھی مثلاً قرآن خالق ہے یا مخلوق، انسان اپنے افعال میں آزاد ہے یا مجبور (یعنی نظریہ جبر و غیرہ وغیرہ)۔ بعید نہیں یہ قصہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔

۴۔ خلفائے بنو عباس ہمیشہ طالبین کی زد میں رہتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ نبرد آزمائی میں مصروف رہتے اور فرزندان ابوطالب پر طرح طرح کے اتہام لگاتے رہتے تھے تاکہ یہ باور کراسکیں کہ یہ لوگ منصب خلافت کے لئے زیادہ سزاوار رہیں۔ انہوں نے حضرت امام حسنؑ کو کثرت ازدواج کے حوالے سے متہم کیا۔ لوگوں میں یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کی کہ امام حسنؑ کو عورتوں سے زیادہ شغف تھا حتی اسکی وجہ سے انہیں خلافت سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اور بھی بہت سے قصے کہانیاں اور من

گھڑت احادیث سبط اکبر رسولؐ سے منسوب کی ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں نے قیام مقدس ابی عبداللہ الحسینؑ کے اصل مقصد یعنی بازیابی خلافت کے مسئلہ سے لوگوں کی نظروں کو ہٹانے کیلئے، امام حسینؑ اور یزید کے مابین اختلاف کے سبب کو ازدواجی مسئلہ سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمنان اہل بیت نے امام حسینؑ کو بھی نسوانی مسائل میں مبتلا دکھانے کی خاطر یہ من گھڑت قصہ آپؑ سے منسوب کیا ہے اور ابن قتیبہ انکے جال میں پھنس کر بے سوچے سمجھے اپنی کتاب میں درج کر بیٹھا۔ یہ احتمال بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ قصہ خود اس کا وضع کردہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

البتہ تعجب یہ ہے کہ جہاں طبری، کامل ابن اثیر، مروج الذہب اور یعقوبی وغیرہ جیسے جید علماء اور مؤرخین نے اسے نظر انداز کیا ہے وہاں بعض اہل سنت مؤلفین مثلاً عبداللہ علائلی، عباس محمود عقاد وغیرہ نے صرف اس قصے کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے بلکہ اس پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ایک اور محقق، بزرگ عالم دین اور مصلح عزاداری امام حسین - آیت اللہ محسن امین نے اپنی کتاب ''مجالس السنیہ'' میں اس قصہ کو جگہ دی ہے۔

۲۔ یزید:

۱۔ علی ابن محمد جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) اپنی کتاب "**المنتظم فی التاریخ الملوک والامم**" میں سنہ ۶۰ ہجری اور سنہ ۶۱ ہجری میں پیش آنے والے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یزید کی کنیت ابو خالد ہے۔ وہ سنہ ۲۶ ہجری میں پیدا ہوا اور سنہ ۶۴ ہجری میں اسکی موت واقع ہوئی۔ یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ابن یزید تخت نشین ہوا۔ چالیس روز تک منصب خلافت پر فائز رہنے کے بعد معاویہ ابن یزید خود کو اور بنو امیہ کو اس منصب کا غاصب قرار دے کر اس سے الگ ہو گیا اور تخت خلافت سے دستبردار ہونے کے چند دن بعد ہی اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ اسکی عمر جیسا کہ مروج الذہب اور تاریخ یعقوبی میں لکھا ہے ۲۱، ۲۲ سال تھی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یزید کی شادی تقریباً سنہ ۴۳، یا ۴۴ ہجری میں ہوئی ہوگی؟

پس معلوم ہوا کہ جس زمانہ میں ارینب کے عقد کی داستان بیان کی جاتی ہے' یزید اس وقت شادی شدہ تھا۔

۲۔ اس قصہ میں ارینب بنت اسحٰق کو ایک نوخیز لڑکی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے' ایک ایسی لڑکی جو ابھی ابھی سن ازدواج کو پہنچی ہے۔ اطراف واکناف سے خواہش مندوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ مجملہ اوروں کے عبداللہ بن سلام اور یزید ابن معاویہ کے نام بھی امیدواروں کی فہرست میں شامل تھے۔ عبداللہ بن سلام نے اس معاملہ میں یزید پر سبقت حاصل کر لی۔

۳۔ قصے میں جیسا کہ وصیف یا رفیق کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ یزید پوری پوری رات اس فکر میں جاگ کر گزار دیتا تھا۔ وہ غمگین ومخزون' بے تابی وبیقراری کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس بیقراری و بے تابی کو دیکھ کر رفیق نے اس سے پوچھا: کس بات نے تمہاری یہ حالت کر دی ہے؟ یزید نے جواب دیا: میری نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں جو میرے باپ کی سستی اور کوتاہی کے نتیجے میں ہاتھ سے نکل گئی اور میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس گفتگو سے تو ایسا لگتا ہے کہ اس وقت تک یزید ایک غیر شادی شدہ جوان تھا اور اس کی نظریں اس لڑکی پر لگی ہوئی تھیں جبکہ قبل ازیں ثابت ہو چکا ہے کہ یزید نہ صرف یہ کہ شادی شدہ بلکہ صاحب اولاد بھی تھا۔

۴۔ قصے میں مذکور ہے کہ جب معاویہ نے یزید کو بلایا تو اس نے سمجھا کہ کسی اہم مسئلے پر مشورہ کیلئے طلب کیا ہوگا کیونکہ بقول یزید اہم ترین مسائل میں معاویہ اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو خود کو سربراہ مملکت کا مشیر ومعاون گردانتا ہو' کیسے ممکن ہے کہ ایسی بے خبری کی زندگی گزارے کہ شکار ہاتھ سے نکل جائے اور اسے خبر تک نہ ہو۔

درج بالا نکات کے تحت یہ قصہ حقیقت کے بہ نسبت افسانہ پردازی سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

(۳) رفیق

اس قصے میں ایک کردار رفیق نامی شخص کا ہے۔ یہ شخص جیسا کہ بیان ہوا ہے بیت معاویہ کا محرم راز تھا۔ معاویہ کے حضور حاضر ہونا اس کیلئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جب چاہے اپنے مسائل اس کے سامنے جا کے پیش کر

سکتا تھا۔ مؤرخ کا اتنے اہم شخص کا نام لینے سے گریز کرنا اور ''رفیق'' کہہ کر ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک فرضی کردار ہے۔

رفیق صفت ہے' کسی انسان کا نام نہیں۔ جب دوسروں کا ذکر نام لیکر کیا جا سکتا ہے تو اس کا نام لینے میں مورخ کیلئے کیا چیز مانع تھی؟

(۴) ارینب بنت اسحٰق

اس قصے کا بنیادی کردار ارینب بنت اسحٰق کا ہے۔ حسب قصہ' ارینب ایک دوشیزہ کا نام ہے۔ جو اپنے حسن و جمال اور مال ودولت کی وجہ سے مشہور تھی شہزادیوں کی مانند بہت سے شہزادوں کی مطمع نظر بنی ہوئی تھی۔ لیکن آخر میں معاویہ کے قریبی دوست اور عراق کے والی عبداللہ بن سلام کی قسمت نے تمام طامعین کو مایوس کر دیا۔ یہاں تک کہ ولی عہد سلطنت شہزادہ یزید جیسے مقتدر شخص کو بھی اس نے پیچھے چھوڑ دیا۔

یزید سمیت تمام طامعین کی مایوسی اور قسمت آزمائی کے اس مقابلے میں عبداللہ بن سلام کے سبقت لے جانے کے اسباب وعلل کا تجزیہ وتحلیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی نکتہ دولہا ودلہن کا کفو ہے جو کہ دور جاہلیت سے لے کر دور حاضر تک چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک بنیادی شرط ہے جو آج تک منسوخ نہیں ہوئی۔ استثنائی حالات کے علاوہ کفو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر جوتے کا ایک پیر دوسرے سے چھوٹا یا بڑا ہو تو چلنے میں ضرور دشواری پیش آئیگی۔ یہ اور بات ہے کہ خود کفو کی تفسیر ہمیشہ اختلاف نظر کا شکار رہی ہے لہٰذا ہم پہلے کفو کے مصادیق وانواع بیان کریں گے اور پھر اس بات کا تجزیہ کرینگے کہ عام طور پر کس قسم کے کفو کو ترجیح دی جاتی ہے۔ معاشرہ میں کفو کے جو مصادیق رائج ہیں' وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ کفو فزیکی:

دونوں کے قد وقامت میں تناسب ہونا چاہئے' جسمانی طور پر زیادہ فرق نامناسب سمجھا جاتا ہے۔ سابق زمانے میں اس طرف زیادہ توجہ ہو یا نہ ہو' دور حاضر میں بہت حد تک اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر خیال نہ رکھا جائے تو مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔

۲۔ کیمیائی کفو:

اس سے مراد جسمانی خلیوں اور ترکیب خون میں ہم آہنگی ہے۔ آج میڈیکل سائنس اس بات پر شاہد ہے کہ رشتہ طے کرتے وقت کیمیائی کفو کا لحاظ نہ رکھنا آئندہ نسلوں میں ایسی جان لیوا بیماریوں کا باعث بنتا ہے جو تا حال نا قابلِ علاج ہیں اور بسا اوقات ایسی صورت میں جدائی کی نوبت آجاتی ہے۔

۳۔ کفو مال ودولت:

اگر کوئی فقیر کسی دولت مند لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش رکھے تو اسے جرأت نہیں ہوگی او اس طرح ایک دولت مند لڑکی کسی فقیر لڑکے سے شادی کرنا پسند نہیں کرے گی۔

۴۔ کفو خاندانی:

لڑکی اور لڑکے کا ایک ہی خاندان یا برادری یا ایک ہی علاقے یا ملک سے تعلق ضروری سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے خاندانوں یا دوسری برادریوں یا غیر ملکی لوگوں میں شادی کسی حد تک نا ہم آہنگی کا سبب بن سکتی ہے۔

۵۔ کفو شکل وصورت:

ایک بد شکل لڑکی اور خوبصورت لڑکے میں یا ایک خوبصورت لڑکی اور بد شکل لڑکے میں ہم آہنگی پیدا ہونا مشکل ہے۔

۶۔ کفو تعلیم:

پڑھے لکھے لڑکے اپنے لئے تعلیم یافتہ شریک حیات طلب کرتے ہیں اور انہی کو اپنا کفو سمجھتے ہیں۔ یہی حال تعلیم یافتہ لڑکیوں کا ہے۔

۷۔ کفو ایمانی وفکری

مذہبی اور آئیڈیالوجیکل بنیادوں پر ہم آہنگی سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اگر باقی تمام شرائط موجود ہوں لیکن اس میدان مین کفو نہ ہو تو معاملہ خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ آسمان الفت ومحبت میں وقتاً فوقتاً اتفاقی کے بادل نمودار ہوتے رہیں گے۔

عقل وشرع کے حوالے سے لڑکی اور لڑکے کا خدا ورسول پر ایمان او ر اصول وفروع کی پابندی لازمی ہے۔ فرقے کے لحاظ سے بھی ہم آہنگی ہونا مستحسن ہے گرچہ فقہی اعتبار سے ضروری نہیں ہے۔

۸۔ کفو عمری:

قدیم زمانے سے دورِ جدید تک دولہا دلہن میں کفو عمری کا خیال رکھا جاتا رہا ہے۔ شاذو نادر ہی اگر یہ حالات میں ہی کفو عمری کو نظر انداز کیا جاتا ہے جیسے پیغمبر اسلامؐ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو عمر میں پندرہ سال کے فرق کے باوجود نہ صرف آپ کی حیات میں بلکہ ممات میں بھی بہترین کفو قرار دیا۔ اسی طرح ام المومنین عائشہ کو نو سال کی عمر میں پچاس سال کی عمر کے پیغمبرؐ کا کفو قرار دیا گیا۔ لیکن ایسی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ باقی شرائط تو نظر انداز ہوتی رہتی ہیں لیکن کفو عمری کو عموماً نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

اقسام کفو بیان کرنے کے بعد اب ہم ان اسباب وعوامل کو تلاش کرینگے جن کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ اپنے وقت کی حسن وجمال اور مال ومنال کی مالکہ ہشل شہزادی ٔ ارینب سے شادی میں ناکامی نے یزید جیسے ولی عہد سلطنت کو یاس وحسرت میں مبتلا کر دیا۔ جبکہ عبداللہ بن سلام جو کہ اسکے باپ کا دوست اور اس کی حکومت کا ایک ملازم تھا، اس دوڑ میں اس پر سبقت لے گیا۔

اس قصے کو پڑھنے کے بعد درج ذیل احتمالات ذہن میں آتے ہیں۔ ہر احتمال اس قصے کو حقیقت سے دور اور افسانے سے قریب کرتا ہے:

۱۔ پہلا مفروضہ:

یزید کی طرف سے خواستگاری میں تاخیر اور تساہل برتنے کی وجہ سے اسے ارینب سے محروم ہونا پڑا۔ یہ مفروضہ درست نہیں ہے کیونکہ حسب قصہ یزید بے قراری، دکھ اور حسرت کی زندگی گزار رہا تھا اسے کبھی اپنے اوپر اور کبھی اپنے باپ پر غصہ آتا تھا کیونکہ اپنی پسندیدہ محبوبہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا اسے بہت غم تھا۔

۲۔ دوسرا مفروضہ:

یزید کی خواستگاری اور طلب کے باوجود ارینب نے اسے مسترد اور عبداللہ بن سلام کو منتخب کیا ہو۔

اس صورت حال میں ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ کیا وجہ یا وجوہات تھیں جنکی بنا پر ارینب نے یزید کو اپنا کفو تسلیم نہیں کیا۔ وہ نقص آیا شکل وصورت میں تھا' مال ودولت کے حوالے سے تھا یا عمر کے حوالے سے تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو عبداللہ بن سلام میں ہو اور یزید میں نہ ہو۔

۳۔ تیسرا مفروضہ

جیسا کہ قصے میں بیان ہوا ہے کہ بالآخر ارینب کی شادی اسکے چچا زاد عبداللہ بن سلام قریشی سے ہو گئی لہٰذا خیال پیدا ہوتا ہے ممکن ہے کفو خاندانی کے باعث ارینب کے والد نے اسے شادی کے لئے مجبور کیا ہو۔ لیکن یہ احتمال بھی غلط ہے کیونکہ قصے میں لکھا ہے کہ اگر چہ کہ عبداللہ بن سلام نے ارینب کو طلاق دے کر بے وفائی کا مظاہرہ کیا لیکن جب وہ دوبارہ گھر آیا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رو پڑے۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ارینب نے کسی کے دباؤ میں آ کر عبداللہ سے شادی نہیں کی تھی بلکہ اپنی رضا و رغبت سے عبداللہ کی زوجیت قبول کی تھی۔

۴۔ چوتھا مفروضہ:

اگر چہ کہ یزید خلیفۂ وقت کا ولی عہد تھا لیکن فسق وفجور میں مبتلا رہتا تھا اور معنویت سے خالی انسان تھا۔ ارینب کے عبداللہ بن سلام کو یزید پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔

یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ اگر علم ومعرفت کی بنیاد پر عبداللہ بن سلام کو ترجیح دی ہوتی تو امام حسینؑ جیسا شوہر ملنے کے بعد امامؑ سے طلاق لیکر دوبارہ عبداللہ کے عقد میں جانے پر کبھی راضی نہ ہوتی۔

۵۔ پانچواں مفروضہ:

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شادی سنہ ۵۴ ہجری میں ہوئی۔ یزید کی عمر اس وقت تقریباً تیس سال تھی جبکہ عبداللہ بن سلام کی عمر ستر سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک نوخیز کنواری لڑکی نے کیوں کر تیس سال کی عمر کے جوان کو مسترد کر کے اس ستر سال کے بوڑھے سے شادی کرنے کو پسند کیا؟

۶۔ چھٹا مفروضہ:

ہم نے کتب تاریخ ورجال کے معاجم میں تلاش کیا کہ اس زمانے میں عبداللہ بن سلام نامی کوئی شخص جو

قریشی بھی ہو مل جائے لیکن کہیں نہیں ملا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عبداللہ بن سلام نامی کوئی شخص وجود ہی نہیں رکھتا تھا جس سے ارینب نے شادی کی ہو۔

۷۔ ساتواں مفروضہ:

کہتے ہیں یہ واقعہ سنہ ۵۴۔۵۶ ہجری کے دوران وقوع پذیر ہوا ہے جبکہ ہم نے آئندہ سطور میں فریقین کی تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام نامی شخص سنہ ۴۱۔۴۳ ہجری میں وفات پا چکا تھا۔ تو کیا ارینب نے ایک ایسے انسان سے شادی کی تھی جو چندہ سال پہلے اس دنیا سے گزر چکا تھا؟

۸۔ آٹھواں مفروضہ:

ارینب کے والد اسحاق جسے عبداللہ بن سلام کا چچا بتایا جاتا ہے' اس نام کی بھی کوئی شخصیت تاریخ میں نہیں ملتی پس ثابت ہوا کہ یہ بھی ایک فرضی کردار ہے۔

۹۔ نواں مفروضہ:

ابو درداء نے جب یزید اور امام حسینؑ دونوں کی طرف سے ارینب کی خدمت میں خطبہ (منگنی) کی خواہش کیا تو ارینب نے کہا کہ اگر یہ مسئلہ آپ کی غیر موجودگی میں پیش آتا' تب بھی میں آپ سے ہی مشورہ لیتی اور اس پر عمل کرتی' اب تو الحمدللہ آپ یہاں موجود ہیں لہٰذا جو مشورہ آپ دینگے میں اسی پر عمل کروں گی۔ اسپر ابو درداء نے کہا میں تو آپ کیلئے حسینؑ کو بہترین کفو سمجھتا ہوں کیونکہ یزید کے ساتھ صرف مال دنیا ہے' جبکہ حسینؑ کے ساتھ سعادۃ الدارین ہے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ ابو درداء کا ارینب کے ساتھ کیا رشتہ تھا کہ ان کی غیر موجودگی کی صورت میں بھی کسی نہ کسی کے ذریعے ان ہی سے مشورہ لینا ضروری تھا۔

(۲) ارینب بنت اسحٰق نہ صرف مال ودولت کے حوالے سے بلکہ عشرو عشیر کے حوالے سے بھی شہزادیوں کی مانند تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کیلئے صرف ابو درداء ہی رہ گئے تھے جن سے مشورہ طلب کرتا تھا۔ اسکے اپنے تمام عزیز و اقارب ختم تو نہیں ہو گئے تھے' لاوارث تو نہیں ہو گئی تھیں؟!

۱۰۔ دسواں مفروضہ:

اریب نے عبداللہ بن سلام سے شادی کفو مال و دولت کی مناسبت سے کی تھی یا عبداللہ بن سلام اریب کو مال و دولت کی طمع میں اپنی زوجیت میں لایا تھا' یہ دونوں ہی مفروضے اس قصے کے متن کے حوالے سے غلط ہیں۔ عبداللہ بن سلام جب شام پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ معاویہ نے اسکے ساتھ دغا کیا ہے' اب وہ اس کی درگاہ سے مردود ہو چکا تھا اور اسکے رواتب بند ہوگئے تھے لہٰذا وہ دوبارہ کوفہ آیا تا کہ اریب سے اشرفیوں کی ان تھیلیوں کو واپس لے سکے جو اس نے بطور امانت رکھوائی تھیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک شخص جو عراق کا والی رہا ہو' صاحب ثروت ہو جب وہ عراق واپس آیا تو اس کے پاس بچی ہوئی دولت میں فقط اشرفیوں کی دو تھیلیاں تھیں۔ اس کی کیا حیثیت ہے؟

اشرفی سونے کے ایک سکے کا نام ہے یہ سکہ ایران کے بادشاہ اشرف نے رائج کیا تھا۔ ایک اشرفی کا وزن اٹھارہ چنے یعنی تقریباً ساڑے تین گرام ہوتا ہے۔ ایک تھیلی میں زیادہ سے زیادہ دو ہزار اشرافیاں ہو سکتی ہیں تو دو تھیلی میں چار ہزار۔

اگر یہ کہا جائے کہ اریب بذات خود ایک مالدار عورت تھی اور عبداللہ بن سلام مال و دولت کی لالچ میں اسے اپنے عقد میں لایا تھا تو قصے میں موجود متن کے حوالے سے یہ بات بھی غلط ہو جاتی ہے' کیونکہ جب عبداللہ غربت کے عالم میں عراق آیا اور اریب سے تھیلی واپس لینے کے بعد مٹھی بھر اشرفیاں' جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی نکال کر اریب کو دیں تو اس نے فوراً اسکو قبول کر لیا۔ ان حالات میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک امیر عورت تھی۔

(۵) عبداللہ بن سلام:

اس افسانے کا ایک اہم کردار عبداللہ بن سلام قریشی ہے جو معاویہ ابن ابی سفیان کی طرف سے عراق میں والی تھی۔

معاویہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یزید' اریب کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اور انتہائی بیقراری و بیتابی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اریب کو عبداللہ بن سلام سے طلاق دلوا کر

یزید کے عقد میں لے آئے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے اس نے عبداللہ بن سلام کو عراق سے بلانے کا حکم نامہ جاری کیا۔ لکھا کہ اس خط کے ملتے ہی ہماری طرف روانہ ہو جاؤ' کسی اہم مسئلہ میں مشورہ لینا ہے۔ جب وہ شام پہنچا تو دارالخلافہ کی بجائے اسے ایک خاص مقام پر قیام کرنے کا حکم جاری کیا۔ دوسری طرف ابو درداء اور ابو ہریرہ' جن کے کردار کے متعلق بعد میں بیان ہوگا' کہ عبداللہ بن سلام کے پاس یہ حکم دیکر بھیجا کہ اسے معاویہ کی دامادی کا طمع و لالچ دیا جائے۔ معاویہ کی بیٹی کی طرف سے اس کی زوجیت کو قبول کرنے کی یقین دہانی کرا کے عبداللہ بن سلام سے اریب کو طلاق دلوائی جائے۔ یہ قصہ گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ اب ہم عبداللہ بن سلام کے قریشی ہونے اور معاویہ کی طرف سے عراق پر حاکم مقرر ہونے کی حقیقت سے پردہ اٹھائیں گے۔

کتاب ''فی التاریخ والاسلام'' تالیف مرتضیٰ عاملی کتب تاریخ و رجال میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی جلد اول کے صفحہ ۱۵۵ پر عبداللہ بن سلام نام کے تین آدمیوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے دو کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے جبکہ ایک نام پہلی صدی میں مذکور ہے۔

علاوہ ازیں کتاب ''الثقات'' تالیف ابی حاتم تمیمی جلد سوم صفحہ ۸ پر عبداللہ بن سلام کے نام سے دو آدمیوں کا ذکر آیا ہے' ان میں سے ایک کا ذکر پہلی صدی ہجری میں ہوا ہے یہ عبداللہ بن سلام حارثی اسرائیلی کے نام سے مشہور تھے جبکہ ان کا اصلی نام حصین تھا۔ قبول اسلام کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔ انکی کنیت ابو یوسف تھی۔ وہ اولاد حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ میں سے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ یہودی تھے۔ بنو قینقاع سے تعلق تھا اور بنو عوف بن خزرج کے حلیفوں میں سے تھے۔ جب پیغمبر اسلامؐ مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو وہ یہودیوں میں سب سے پہلے شخص تھے جو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ علمائے یہود میں سے تھا۔ انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں تین سوالات کئے۔ ایک سوال قیامت کے بارے میں تھا' دوسرا اہل جنت کے کھانے سے متعلق اور تیسرا سوال یہ تھا کہ بچہ کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے شباہت رکھتا ہے' اس کی کیا وجہ ہے۔ ان سوالات کا شافی جواب ملنے پر وہ پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لے آئے۔

اسکے بعد انہوں نے پیغمبر اسلامؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے کہیں چھپالیں اور پھر یہود سے میری حیثیت، صداقت اور امانت داری کے بارے میں سوال کریں تو وہ لوگ یقیناً میری صداقت اور امانت داری کی گواہی دینگے۔ اس کے بعد آپ ان سے پوچھیں کہ اگر ابو یوسف حصین میری نبوت کی تصدیق کر دے تو کیا تم بھی ایسا کرو گے؟ عبداللہ بن سلام تورات و انجیل سے آشنا تھے اور ان کتب میں مذکور پیغمبر کی آمد سے متعلق بشارتوں سے واقف تھے۔ لہٰذا فریقین کے مفسرین اپنی کتب تفاسیر میں درج ذیل آیات کے مصادیق میں سے ایک مصداق عبداللہ بن سلام کو بتاتے ہیں۔:

سورۂ رعد آیت ۴۳، انعام ۲۰، یونس ۹۶ اور سورۂ بقرہ آیت ۱۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے کہ علمائے یہود آپ کو اپنے بچوں کے مانند پہچانتے ہیں یا یہ کہ بعض اہل کتاب حق کو چھپاتے نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ عبداللہ بن سلام یہودی تھے اور بنوقینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرا ئیلی تھے، نہ کہ قریشی۔ عبداللہ بن سلام قریشی نامی کوئی شخص تاریخ میں نہیں ملتا۔ یہ پہلی غلطی ہے۔

۲۔ کتب تاریخ میں عراق کے دونوں صوبوں کوفہ و بصرہ میں سنہ ۶۰ ہجری تک متعین تمام حکمرانوں کے نام موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کا نام بھی عبداللہ بن سلام نہیں ہے۔

۳۔ عبداللہ بن سلام پیغمبر اسلامؐ کی مدینہ آمد کے موقع پر شرف بہ اسلام ہوئے اس وقت تک وہ جید علمائے یہود میں شمار ہوتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر کم از کم ۲۵، ۳۰ سال کے درمیان رہی ہوگی۔ اس طرح سنہ ۵۴ یا ۵۶ ہجری میں ان کی عمر کم از کم ستر اسی سال کے لگ بھگ بنتی ہے۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر حسن و جمال میں مشہور و بے مثال اریبنب نے تمام نوجوانوں کو ٹھکرا کر عبداللہ بن سلام جیسے بوڑھے انسان سے شادی کرنے کا فیصلہ کیوں کیا۔

۴۔ یزید ولی عہد سلطنت تھا، معاویہ نے ہر طرح کے مسائل سے نمٹنے کے لئے اسے کلی اختیار دے رکھا تھا لہٰذا وہ معاویہ کے اقدامات کا انتظار کئے بغیر کسی شخص کے توسط سے اریبنب کو اپنی زوجیت میں لانے کیلئے

پیشکش کر سکتا تھا مشہور ہے کہ پیاسا خود پانی تلاش کرتا ہے۔ اس طرح جب اسکی رضامندی حاصل ہو جاتی تو معاملہ کو انجام تک پہنچانے کے لئے معاویہ سے رجوع کر لیتا ہے۔

۵۔ اس قصے میں عبداللہ بن سلام کو ایک سنجیدہ اور پختہ و برجستہ شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو حکمت کے ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ کیا ایسی شخصیت کے مالک انسان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عمر کے اس حصہ میں وہ معاویہ کی نوعمر لڑکی سے شادی کرنے کا خواہشمند ہو؟

۶۔ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن سلام اریبنب سے جدا ہونے اور معاویہ کی بیٹی کے ساتھ شادی سے مایوس ہونے کے بعد فقر و محرومیت کی زندگی گزارنے لگا تھا۔ ناچار اپنی کچھ امانتیں جو اریبنب کے پاس رکھوائی تھیں، اسے لینے کیلئے عراق پہنچا، یاددہانی کرائی اور ان سے وہ امانت لے لی۔ کیا حسن و جمال کی ملکہ سے شادی کرنے والے حاکم عراق عبداللہ بن سلام کی کل متاع فقط یہی اشرفیوں کی دو تھیلیاں تھیں، کچھ اور نہیں تھا اسکے پاس؟

۷۔ کتاب "**اضواء علی السنة المحمدیه**" صفحہ ۱۵۶، کتاب "**البدایه و النهایة**" جلد ۸ صفحہ ۲۷، کتاب "**اسدالغابة**" جلد ۳ صفحہ ۱۷۷، کتاب "**الاصابه فی معرفة الصحابه**"، کتاب "**صفة الصفوة**" اور کتاب "**الثقات**" تالیف ابی حاتم تمیمی جلد ۸ صفحہ ۳۵۸ میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن سلام سنہ ۴۱، ۴۳ ہجری میں وفات پا گئے، سنہ ۵۸ ہجری تک وہ زندہ نہیں تھے۔

۸۔ کسی تاریخ میں یہ نہیں لکھا ہے کہ عبداللہ بن سلام سرزمین عراق آئے تھے۔

ان تمام نکات کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبداللہ بن سلام نامی جس شخص کا ذکر اس قصہ میں آیا ہے، محض ایک مفروضہ ہے کیونکہ کتب تاریخ و رجال سے اسکا وجود ثابت نہیں ہے۔

(۶) معاویہ ابن ابی سفیان

اس افسانے کے تسلسل ترتیبی میں تیسرا کردار معاویہ ابن ابی سفیان کا ہے۔ یزید نے غرور جوانی اور شہوت جنسی کے طغیان و غلیان میں، اپنی آرزوؤں اور امنگوں کی برآوردگی میں اپنے باپ سے امیدیں منقطع ہونے

کے بعد کھل کر اظہار ناراضگی کیا۔ادھر معاویہ نے سمجھ لیا کہ اپنے چہیتے بیٹے کی امنگوں میں سستی اور تساہل برتنے کی وجہ سے اسکی ناراضگی مول لے چکا ہے ۔زندگی کے نشیب وفراز اور اجتماعی وسیاسی مشکلات میں آسانی سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کے مالک' معاویہ نے اپنے بیٹے کو مایوسی کے چاہ سے نکال کرا سے دوبارہ اپنی خواہشات کی برآوری کا امیدوار بنایا۔اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک خاص حکمت عملی وضع کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاویہ کا سیاسی طرۂ امتیاز اور حکمت عملی رہی ہے کہ مسائل کو جتنا ہو سکے آسان اور سہل طریقے سے حل کیا جائے ۔لہٰذا یہاں بھی وہی طریقہ استعمال کیا گیا۔لیکن افسانہ ساز کے نقطۂ نظر کے تحت اس کا تمام مکروفریب اور اسکی ساری چاپلوسیاں اور چالاکیاں امام حسینؑ کی حکمت عملی کے مقابلے میں نقش برآب ثابت ہوئیں اور وہ کچھ نہیں کر سکا۔

قصہ ساز کے داخلی اہداف ومقاصد سے صرف نظر کرتے ہوئے اور ان مسائل میں سطحی انداز فکر رکھنے والوں کو خیرباد کہنے کے بعد اب ہم معاویہ کے اس دور سے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں جسے قصہ ساز نے معاویہ کی ناکامی کے بعد پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے مرحلے میں ناکام ہونے کے بعد وہ سخت اقدامات سے گریز کرکے کس حد تک شریف النفس ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے ۔اگر معاویہ کی تاریخ اور بنوامیہ کے دور کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے اور اہل بیت اور ان سے وابستہ افراد سے دشمنی کے سلسلے میں اس نے جو قدم اٹھائے ہیں' ان صفحات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اسکے شریف النفس اور صاحب تحمل ہونے سے متعلق ایک سطر تو کجا' ایک کلمہ بھی نہیں ملتا۔آیئے ذرا تاریخ کے ان صفحات کا مرحلہ وار جائزہ لیتے ہیں۔

معاویہ وہ شخص ہے کہ جس نے اپنی مکاریوں کے ذریعہ جنگ صفین میں علیؑ کی فتح وکامیابی کو شکست میں تبدیل کر دیا۔اسی معاویہ نے آپؑ کے دست وبازو مالک اشتر کو ایک دہقان کے ذریعے شربت میں زہر دلا کر شہید کرنے کے بعد کہا "خدا کے لئے شہد کے اندر بھی ایک فوج ہے" یہ معاویہ ہی تھا جس نے امام حسنؑ کو جھوٹے پروپیگنڈے' رشوت ستانی' تملق اور رحم دلی جیسے تمام حربوں کو بروئے کار لا کر اور ہر طرف سے گھیر کر

صلح پر مجبور کر دیا۔یہ معاویہ ہی کی سفاکی تھی کہ حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کو علیؑ سے برأت کا اعلان نہ کرنے کے جرم میں دروازہ شام پر اجتماعی طور پر قتل کرنے کا حکم دیا۔جب معاویہ نے دیکھا کہ اہل شام عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو مسند خلافت کے لئے اہل وسزاوار گردانتے ہیں تو اس نے انہیں یزید کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر ابن اثیال کے ذریعے قتل کروا دیا۔معاویہ ہی نے امام حسنؑ اور آپ کے شیعوں کو تحفظ فراہم کرنے کا عہدو پیمان کرنے کے باوجود شہید کیا۔معاویہ وہ شخص ہے کہ جس نے جب دیکھا کہ سعد ابن ابی وقاص کہ جو فاتح عراق تھے اور شوریٰ حضرت عمر میں شامل تھے' یزید کی ولی عہدی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں تو انہیں قتل کرنے میں جھجک تک محسوس نہ کی۔کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسے شخص کیلئے ارینب کو یزید کے عقد میں لانا اتنا مشکل ہو گیا کہ اس کے بیٹے کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا اور اسے اپنے بیٹے کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑی؟ کیا اس کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے اس افسانے کو قبول کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات غور طلب ہیں:

۱۔کیا عبداللہ بن سلام کے ارینب کو طلاق دینے کے بعد معاویہ ارینب کو عراق کے اندر محاصرے میں نہیں رکھ سکتا تھا یا دوبارہ عبداللہ بن سلام کی زوجیت میں جانے پر اسے (عبداللہ بن سلام کو) زہر دے کر قتل نہیں کر سکتا تھا؟ کونسی طاقت تھی جو معاویہ کو ایسا کرنے سے روک سکتی تھی؟

۲۔اس کے اور اس کے بیٹے کی تمام منصوبہ بندیوں پر پانی پھیرنے والے امام حسینؑ کے خلاف بعد میں معاویہ نے کیا اقدامات کیے؟

۳۔ابو درداء جو ہمیشہ دمشق ہی میں رہتے تھے اور معاویہ کے نمک خوار رہے' انہوں نے معاویہ اور اس کے بیٹے یزید کے ساتھ خیانت کی ۔کہتے ہیں معاویہ کی طرف سے بھیجی گئی رقم تک حسینؑ کی طرف سے مہر میں دے دی۔

ارینب کو یزید کے ساتھ منگنی کرنے کے بجائے امام حسینؑ کو انتخاب کرنے کا مشورہ دیا۔ابو درداء کو ان خلاف ورزیوں پر کیا سزا ملی؟

متذکرہ بالا نکات اور تاریخ میں کہیں سے بھی اس قصہ کے بارے میں کسی قسم کی سند کا نہ ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قصہ حقیقت سے عاری ایک ذہنی اختراع کے سوا کچھ نہیں۔

(۷) ابوہریرہ اور ابودرداء

اس افسانے میں دو اصحاب رسولؐ ابوہریرہ اور ابودرداء کا ایک خاص کردار بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ان دونوں صحابیوں کا مختصر سا تعارف پیش کرینگے:

ابوہریرہ

''کتاب الکنی والالقاب'' جلد اول صفحہ ۱۷۹ پر بیان ہے کہ ابوہریرہ ایک معروف صحابی تھے۔ آپ نے ہجرت کے ساتویں سال اسلام قبول کیا تھا۔ فیروز آبادی نے قاموس میں عبدالرحمٰن بن صخر سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ ان کی کنیت تھی، نام نہ تھا۔ ان کو ابوہریرہ کہنے سے متعلق بہت سے اقوال مشہور ہیں۔ بعض نے ان اقوال کی تعداد بیس تک بتائی ہے۔ ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلامؐ نے ان کی آستین میں ایک بلی دیکھی، جس کے بعد سے وہ ابوہریرہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

حضرت عمر کے دور خلافت میں ابوہریرہ بحرین کے والی تھے۔ ان کے زمانہ میں بیت المال مسلمین میں گڑبڑ ہوئی، جس کی پاداش میں حضرت عمر نے ان کو تازیانہ مارا تھا۔

ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ کے شروع میں اپنے استاد ابوجعفر سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ ان صحابیوں میں سے ہیں جنہیں معاویہ نے حضرت علیؑ کی مذمت میں حدیث جعل کرنے پر مامور کیا تھا۔ انکے علاوہ عمر ابن عاص اور مغیرۃ ابن شعبہ نے بھی اس سلسلے میں معاویہ کی بہت مدد کی ہے۔

حضرت ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ ابوہریرہ، بنوامیہ و معاویہ نوازی میں انکی حکومت کے استحکام کی خاطر اور علیؑ کی مذمت میں احادیث جعل کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اصحاب رسولؐ میں سب سے زیادہ احادیث انہی سے مروی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت ابوحنیفہ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کا فتویٰ کتاب خدا کے خلاف ہو تو کیا کریں؟ آپ نے

فرمایا: میرے قول کو چھوڑ دو، کتاب خدا پر عمل کرو۔ پھر پوچھا اگر اصحاب رسول کے اقوال سے ٹکرائے تو کیا حکم ہے؟ کہا میرے قول کو چھوڑ دو، اصحاب کے اقوال کو مقدم رکھو سوائے تین کے جنکے قول کو میرے قول پر ترجیح مت دینا۔ پھر فرمایا وہ تین صحابی ابوہریرہ، انس بن مالک اور سمرۃ ابن جندب ہیں۔ لہٰذا ابوہریرہ کا معاویہ کی ہر خواہش پر پورا اترنا چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن سوال یہ ہے:

۱۔ وہ ابوہریرہ جس نے معاویہ کے کہنے پر عبداللہ بن سلام کو ارینب کو طلاق دینے پر راضی کیا، معاویہ کی بیٹی کو عبداللہ بن سلام کی زوجیت میں لانے کیلئے راضی کیا، ارینب کی منگنی کے موقع پر اس کا نام بالکل غائب ہو جاتا ہے، یہ کیسے ہوا؟ وہاں صرف ابودرداء رہ جاتے ہیں جبکہ اس سے پہلے دونوں اصحاب ساتھ ساتھ ہوتے ہیں!

۲۔ کتاب تاریخ اسلام صفحہ ۳۵۷ پر لکھا ہے کہ ابوہریرہ سنہ ۵۷، ۵۸ یا ۵۹ ہجری کے دوران مدینہ میں رہتے تھے اور اسی دوران مدینہ میں ہی انہوں نے وفات پائی تھی۔

ابودرداء

ان کا اصلی نام عویمر، عامر بن زید یا ابن عامر ہے اور کنیت ابودرداء ہے۔ ''کتاب الکنی والالقاب'' جلد اول، صفحہ ۶۶ پر لکھا ہے کہ ابودرداء کا نام عامر بن زید انصاری ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ ابودرداء، ابوہریرہ کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ یہی دونوں حضرات معاویہ کی طرف سے نمائندہ بن کر علیؑ کے پاس آئے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آپ کی فضیلت و شخصیت کا کوئی منکر نہیں۔ لیکن معاویہ کا کہنا ہے کہ قاتلین عثمان آپ کے پاس ہیں۔ آپ ان قاتلین کو معاویہ کے حوالے کر دیں۔ اگر اسکے بعد بھی معاویہ نے آپ کے ساتھ جنگ کی تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ حضرتؑ نے دریافت فرمایا: کیا تم دونوں قاتلین عثمان کو جانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم جانتے ہیں۔ حضرتؑ نے ان سے فرمایا: تو پھر جاؤ ان کو گرفتار کر لو۔ یہ دونوں محمد ابن ابی بکر، عمار یاسر اور مالک اشتر کے پاس آئے اور کہا تم لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں حکم ملا ہے کہ تم لوگوں کو گرفتار کیا جائے۔ جیسے ہی انہوں نے یہ کہا وہاں موجود دس ہزار آدمیوں نے کہا:

ہم سب عثمان کے قاتل ہیں۔ جب انہوں نے یہ حالت دیکھی تو کہنے لگے: پھر تو ہمارے لئے مشکل ہے۔ یہ کہتے ہوئے دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور شہر حمص میں جا کر رہنے لگے۔

نصر بن مزاحم لکھتے ہیں کہ ابو درداء ابو ہریرہ دونوں صفین میں شریک نہیں ہوئے۔ شیخ صدوق نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

(۸) معاویہ کی بیٹی

اس قصے کا چوتھا اہم کردار معاویہ کی بیٹی ہے۔ اس افسانے میں لکھا ہے کہ معاویہ نے ابو ہریرہ اور ابو درداء سے کہا کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کا شکر ہے' تاہم میں اپنی جوان' رشیدہ بیٹی کے مستقبل کے سلسلہ میں فکرمند رہتا ہوں جو سن ازدواج کو پہنچ چکی ہے۔ خود بیٹی کی بھی خواہش یہ ہے کہ جلد از جلد کسی معقول شخص کے حبالۂ زواج میں چلی جائے۔ لیکن ایک مناسب اور لائق وسزاوار کفو نہ ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ہی پریشان ہیں۔ حال ہی میری نظر عبداللہ بن سلام پر پڑی جو ایک معقول انسان ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ بیٹی کو عبداللہ بن سلام کے عقد میں دے دیا جائے۔ تاہم انہوں نے آخری فیصلہ عبداللہ بن سلام کی رضائیت کے بعد لڑکی پر چھوڑا کیونکہ وہ خود رشیدہ و عاقلہ ہے۔ کہتے ہیں معاویہ نے ان باتوں کو ابو ہریرہ و ابو درداء تک پہنچانے کے بعد اپنی بیٹی کو تمام گفتگو سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں پوچھیں تو کیا جواب دینا ہے۔

ادھر ابو ہریرہ و ابو درداء عبداللہ بن سلام کی رضائیت حاصل کرنے کے بعد معاویہ کی بیٹی کے پاس اسکی خواستگاری کا پیغام لیکر آئے۔ لڑکی نے جواب دیا کہ عبداللہ بن سلام کفو تو مناسب ہے لیکن اس راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور وہ ہے انکی موجودہ زوجہ ارینب۔ اگر یہ رکاوٹ دور ہو جائے تو مجھے ان کی زوجیت میں جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چنانچہ عبداللہ بن سلام کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے ارینب کو فوراً طلاق دے دی۔

ابو ہریرہ اور ابو درداء یہ خبر لیکر معاویہ کی بیٹی کے پاس پہنچے اور اسکی رضائیت طلب کی۔ لیکن اس نے فوراً

جواب دینے کے بجائے اس مسئلے پر سوچنے کیلئے مہلت طلب کی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد جب دوبارہ رابطہ کیا گیا تو پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے جواب دیا کہ خدا نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لوگوں سے مشورہ کرنے اور خدا کی رہنمائی کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ رشتہ مناسب نہیں رہے گا۔

کہانی کے اس حصے میں بھی درج ذیل نکات غور طلب ہیں:

۱۔ تاریخ کی کوئی بھی شخصیت ہو' حتی انبیاء وائمہ ہی کیوں نہ ہوں انکی بیٹیوں کے لئے بالخصوص جب وہ سن زواج کو پہنچتی ہیں' نام کے لحاظ سے مشہور ومعروف ہونا اچھا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب مسئلہ زواج ہو تو نام لینا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس قصہ میں معاویہ' ابو ہریرہ' ابو درداء' عبداللہ بن سلام یا کسی اور کی طرف سے معاویہ کی اس لڑکی کا نام کہیں پر بھی نہیں آیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک فرضی کردار ہے۔

۲۔ عبداللہ بن سلام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی عمر کم از کم اسی سال تھی جبکہ معاویہ کی بیٹی زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاویہ نے عبداللہ بن سلام کو کن وجوہات کی بنا پر پسند کیا تھا؟ اگر یہ وجہ دولت تھی تو بعد میں پتہ چلا کہ اسکی کل پونجی اشرفیوں کی چند تھیلیاں تھیں۔ اگر مقام ومنصب تھا تو وہ خود اس کو ہٹانے اور رکھنے پر متوقف تھا' جوانی بھی نہیں تھی' اگر یہ انتخاب علم وایمان کی بنا پر تھا تو معاویہ کی نظر میں ابو ہریرہ و ابو درداء کہیں زیادہ عالم وبا ایمان تھے۔

۳۔ لڑکی نے بھی عبداللہ کو بہترین کفو قرار دیا ہے۔ اسے بھی عبداللہ بن سلام میں کوئی اور عیب نظر نہیں آیا' سوائے وجود ارینب کے۔ لہٰذا صرف اسی کو مانع کفو قرار دیا۔

۴۔ عبداللہ بن سلام کے پیغام کو مسترد کرنے کیلئے مجمل جواب دینے کی بجائے آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ جس شخص نے حسن وجمال کی مالک' پہلے سے موجود بیوی کو بغیر کسی غلطی کے میری خاطر طلاق دے دی' کل مجھے بھی کسی اور کی خاطر طلاق دے سکتا ہے۔ یہ بہترین توجیہ ہو سکتی تھی' لیکن ایسا نہیں کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اصلاً معاویہ اور اس کی بیٹی سے متعلق نہیں ہے کیونکہ وہ تو اس قسم کی باتوں میں بڑے ماہر تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قصہ گھڑنے والے کی عقل میں یہ باتیں نہیں آ سکیں۔

۵۔ عماد زادہ اپنی کتاب ''زندگانی امام حسینؑ'' میں لکھتے ہیں کہ بعد میں پتہ چلا کہ معاویہ کی کوئی بیٹی ہی نہیں تھی
تعجب اس بات پر ہے کہ ابو ہریرہ ابو درداء جیسی محرم راز شخصیات بھی' جو اس کی طرف سے اعلیٰ مناصب پر
فائز رہ چکے تھے کیا وہ بھی نہیں جانتے تھے؟ چلئے ممکن ہے ان سے چھپایا ہو' لیکن عبداللہ بن سلام جو گورنر تھا'
اس سے یہ بات کیسے چھپی رہی؟

۶۔ تاریخ میں موجود ہے کہ معاویہ کی چار بیویاں تھیں جن میں ایک بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ میثون نامی
بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی لیکن وہ چھوٹی عمر میں ہی وفات پا گئی تھی۔ لہٰذا کسی تاریخ میں اسکی کسی بیٹی کا
ذکر نہیں ملتا۔

(۹) حسین ابن علی ۔

اس واقعہ کے آخری کردار حسین بن علیؑ کی ذات برکات ہیں۔ آپ کے کردار کو قصہ ساز نے یا تو مذموم
عزائم کے تحت شامل کیا ہے یا احمقانہ دوستی کے پیش نظر یا پھر یہ فن افسانہ سازی کا تقاضہ تھا۔ لکھا ہے کہ امام
حسینؑ کہ جو عرب کے سیاسی میدان کے نابغۂ روزگار سمجھے جاتے تھے اور اجتماعی اور سیاسی مشکلات میں خوش
اسلوبی سے کشتی کو ساحل تک لے جانے میں مہارت رکھتے تھے' انہوں نے معاویہ کی تمام امیدوں پر اپنی
حکمت عملی سے پانی پھیر دیا اور اسطرح اسے حیران و مبہوت کر دیا۔

ابو درداء جو یزید سے اُرینب کا خطبہ (منگنی) کرانے آئے تھے اُرینب کے پاس جانے سے پہلے امام
حسینؑ سے ملنے چلے گئے۔ امامؑ کو جب انکے ارادے کا علم ہوا تو انہی کے ذریعے اپنا پیغام بھی بھجوا دیا۔ اُرینب
نے یزید کی پیشکش کو مسترد کیا امامؑ کے پیغام کو قبول کر لیا۔ اس طرح آپؑ نے اُرینب کو اپنے حبالہ نکاح میں
لے لیا لیکن ان سے ازدواجی مراسم بجا لانے سے گریز کیا۔ بالآخر مروت و کرم کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُرینب
کو تین طلاقیں دے کر دوبارہ عبداللہ بن سلام کے عقد میں دے دیا۔ حسینؑ کا یہ کردار معاویہ اور اس کے بیٹے
کے لئے انتہائی گراں اور نہ مٹنے والا داغ تھا جسے خون حسینؑ کے علاوہ کسی اور چیز سے دھونا ناممکن تھا۔

امام حسینؑ کے حوالے سے اس قصے میں کچھ نکات دیگر زاویوں سے بھی آئے ہیں' جنہیں فی الحال ہم

نہیں چھیڑیں گے۔ اس مقام پر ہم صرف ان نکات پر مختصر تبصرہ کرینگے جنہیں کردار حسینؑ سے منسوب کرنے کی
کوشش کی گئی ہے:

۱۔ جب امام حسینؑ کو معاویہ اور اس کے بیٹے یزید کی جانب سے ایک مسلمان میاں بیوی کے درمیان جدائی
کروانے جیسے ناروا سلوک کا علم ہو گیا تھا تو آپؑ کو چاہیے تھا کہ عدت پوری ہوتے ہی بلا تاخیر اقدام
کرتے۔ معاویہ کی طرف سے یزید کی منگنی کا پیغام آنے تک انتظار کیوں کیا؟

۲۔ امام حسینؑ اس کام کیلئے خود اپنی طرف سے کسی شخص کا انتخاب کر سکتے تھے۔ ابو درداء ہی کو اپنا نمائندہ اور خطبہ
کا وکیل کیوں قرار دیا' جبکہ وہ یزید کا پیغام لیکر آئے تھے؟

۳۔ کیا اس قصہ سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ امام حسینؑ کو اسلامی مملکت میں اس قسم کے مسائل ناگوار
گزرتے تھے اور آپ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا تھا۔ جہاں کہیں بھی اس قسم کے مسائل پیدا ہوتے
کیا امام ایسا ہی اقدام کرتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو مؤرخ کو اس قسم کے کچھ اور نمونے بھی پیش کرنا چاہیے
تھے تا کہ اس سے معاویہ و یزید کی ملامت ہو سکتی اور حسینؑ کے شرافت کی شہرت۔

۴۔ کیا امام حسینؑ کو عبداللہ بن سلام سے کوئی محبت تھی جس کی وجہ سے اس کے ساتھ ہونے والی سازش اور
جنایت کو آپؑ برداشت نہ کر سکے؟ اور آپؑ نے یہ قدم اٹھایا۔ خود قصہ کا متن اس احتمال کو مسترد کرتا ہے
لکھا ہے کہ عبداللہ بن سلام معاویہ کا قریبی دوست اور اس کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ ایسا شخص بھلا
حسینؑ کا دوست کیسے ہو سکتا تھا؟ بالفرض محال اگر دوستی ہوتی تو اپنی گورنری کے دور میں اس نے کوئی
کردار پیش کیا ہوتا۔

۵۔ کیا ایسا ہے کہ چونکہ اُرینب اہل بیتؑ سے بہت زیادہ ولایت و محبت رکھتی تھی لہٰذا اسے اس مصیبت سے
نکالنے اور افتخار و اعزاز بخشنے کیلئے امام حسینؑ نے اقدام کیا؟ قصے میں موجود فقرات اس خیال کو بھی مسترد
کرتے ہیں کیونکہ جب اُرینب نے عبداللہ بن سلام کو دیکھا تو بے اختیار اپنے سابقہ دور کو یاد کر کے رونے
لگی۔ جب امام حسینؑ نے اسے طلاق دے دی تو بغیر کسی کراہت کے انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ

دوبارہ عبداللہ بن سلام کی زوجیت اختیار کی ۔لہٰذا کسی بھی زاویے سے امام حسینؑ کے اس عمل کی سوائے یزید و معاویہ کے ساتھ ضد کے کوئی عقلی و منطقی تفسیر نظر نہیں آتی اور ایسا کرنا امامؑ کی ذات سے بعید ہے۔

۱۰۔ زاویۂ مکانی:

یہ قصہ شام سے شروع ہوتا ہے اور عراق پر اختتام کو پہنچتا ہے۔عراق کو حسب قصہ عبداللہ بن سلام ٗ ارینب اور امام حسینؑ کی جائے سکونت بتایا گیا ہے۔

اس زاویے سے بھی چند نکات قابل غور ہیں:

۱۔عراق دو صوبوں پر مشتمل تھا ٗ ایک کوفہ دوسرے بصرہ۔دونوں صوبوں کیلئے الگ الگ گورنر ہوتے تھے۔لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ عبداللہ بن سلام کوفہ میں رہتا تھا یا بصرہ میں۔

۲۔عبداللہ بن سلام قریشی نامی کسی شخص کا وجود کتب رجال میں نہیں ملتا۔ایک اور شخص تھا ٗ عبداللہ بن سلام اسرائیلی ٗ جس کا تفصیلی ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں لیکن اس کے عراق کے والی بننے یا عراق آنے کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا۔

۳۔ معاویہ کے ساتھ صلح طے پانے کے بعد ٗ امام حسنؑ کے ساتھ امام حسینؑ بھی سنہ ۴۱ ہجری میں عراق سے مدینہ تشریف لے آئے تھے اور پھر آخر تک یہیں رہے۔جبکہ قصے میں امام حسینؑ کو عراق کا باشندہ قرار دیا گیا ہے۔

۱۱۔ زاویۂ زمانی:

اس قصے میں لکھا ہے کہ جب معاویہ کو اطلاع ملی کہ یزید کو اس سلسلہ میں اس سے شکایت ہے تو اس نے وصیف یا رفیق اور خود یزید سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں نے تمہیں تمام اصحاب و یاران رسول اللہ صلعم اور امت کی دیگر برجستہ شخصیات پر فضیلت دی ہے ٗ ان کی گردنوں کو تمہارے سامنے جھکا دیا ہے اور تمہیں سب پر مقدم رکھا ہے''۔

اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ یزید کی ولیعہدی کے اعلان کے بعد رونما ہوا ہے جبکہ ولیعہدی کا واقعہ سنہ ۵۵۔۵۶ ہجری کے دوران پیش آیا تھا۔اس وقت تک یزید کی شادی ہو چکی تھی اور وہ صاحب اولاد بھی تھا۔

۱۲۔ زاویۂ فقہی:

اس قصہ میں چند ایسے فقہی زاویے بھی ہیں ٗ جو اسے مردود و جعلی قرار دینے کیلئے کافی ہیں۔لکھا ہے کہ جب عبداللہ بن سلام ٗ امام حسینؑ کے پاس آیا تو امام اسے ارینب کے پاس لے گئے اور پھر اسے وہاں چھوڑ کر خود باہر نکل آئے۔اس دوران وہ دونوں اپنی سابقہ زندگی کو یاد کر کے رونے لگے۔ان کی یہ افسردگی اور مایوسی امام حسینؑ کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی اور امامؑ نے تین طلاقیں جاری کر دیں۔اس حوالے سے قصہ میں دو نکات قابل انتقاد ہیں:

۱۔ طلاق واقع ہو جانے کے بعد ارینب کے لئے عبداللہ بن سلام ایک اجنبی مرد تھا اور اجنبی مرد کی نظر حرام ہے پھر اگر کوئی عورت پہلے اس مرد کی زوجیت میں بھی رہ چکی ہو ٗ تب تو اس کی حرمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں شہوت کی نظر سے دیکھنے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ان حالات میں امام حسینؑ جیسی شخصیت کیلئے آیا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ارینب کو ٗ جو انکی زوجیت میں ہے ٗ عبداللہ بن سلام کے پاس چھوڑ کر خود باہر نکل جائیں؟

۲۔ فقہ اہل بیتؑ میں ایک نشست میں تین طلاقیں جائز نہیں جبکہ اس قصہ کے مطابق امامؑ نے ایک ہی نشست میں تین طلاقیں جاری کیں۔کیا امام حسینؑ کوئی ایسا کام کر سکتے ہیں جو شریعت میں جائز نہ ہو؟ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قصہ ساز فقہ حسینی سے نا آشنا تھا اور اسی لئے اس نے اپنی فقہ کے زاویے سے قصہ سازی کی ہے۔

اسلام میں ازدواج اور اسکے قوانین

ازدواجی زندگی بھی بعض دیگر ضروریات زندگی کی مانند بنیادی اور ناگزیر ضروریات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ضرورت' دین ومذہب یا علاقائی قوانین ورسومات کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ فطری طور پر انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔

شریعتِ اسلام نے کہ جس کا مصدر و مآخذ قرآن وسنت ہے' ازدواجی زندگی کے فلسفہ کو انسان کیلئے سکون و اطمینان کا ذریعہ اور نسلِ انسانی کی بقاء کیلئے تولیدِ مثل قرار دیا ہے۔

یہ سلسلہ نسلِ انسانی کے مصدر آدم صفی اللہ اور حوا سے چلا آرہا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ رشتہ ازدواج میں مرد وعورت دونوں کے لئے ویسے ہی کشش وخواہش پائی جاتی ہے' جیسا ایٹم کے اندر الیکٹران اور پروٹان کے مابین کشش ہوتی ہے۔ زن وشوہر کے درمیان پائی جانے والی کشش کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿جعل بینهما مودة ورحمة﴾ "ہم نے ان دونوں کے درمیان مودت ورحمت پیدا کی ہے"۔

مرد اور عورت میں پائی جانے والی یہ کشش فطری ہے۔ اسکے لئے کسی تعلیم وتربیت اور آگاہی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب انسان سن بلوغت کو پہنچتا ہے تو یہ کشش اپنے جوش وخروش کے مراحل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس فطری تقاضے کو کسی بھی طریقہ سے دبایا نہیں جاسکتا۔ ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ ناممکن ہے' بلکہ ناجائز بھی ہے۔ لہٰذا جن جن فرقوں اور گروہوں نے اس کو دبانے اور اس پر پابندی عائد کرنے کوشش کی ہے' وہ انحرافات کا شکار ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ عمل غیر قانونی اور ناجائز طریقوں سے انجام پاتا رہا ہے۔

ادیان ومذاہب کے ماننے والوں اور منکرین دین ومذہب' دونوں نے اپنے اپنے عزائم کے مطابق' ازدواجی زندگی سے متعلق مختلف قسم کے قوانین وضع کئے ہیں۔ اسلام چونکہ ایک دائمی' فطری اور عالمی دین ہے لہٰذا اس

نے اس سلسلے میں قوانین وضع کرتے وقت کسی خاص رنگ ونسل' قوم وقبیلہ' قدیم وجدید دور' علاقائی رسومات' وغیرہ کو مدنظر نہیں رکھا ہے بلکہ اس مسئلہ کو صرف اور صرف انسانی بنیادوں پر پیش کیا ہے۔ ان قوانین کے نفاذ اور اجراء کیلئے جو دائرہ کار مقرر ہے' وہ دنیا بھر کے کلمہ گو مسلمانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسلام کے وضع کردہ یہ قوانین دنیا بھر کے مردوں اور عورتوں کی سعادت ونیک بختی کے ضامن ہیں۔

اسلام مغرب کے پیدا کردہ بے لگام' جنگلی' وحشی اور حیوانی آزادی کے نظریہ کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ ایسی بے لگام اور غیر محدود آزادی انسانیت کی فنا اور نابودی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس طرز عمل کے رشتہ سے اجتماع کے پارہ پارہ ہونے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا لہٰذا اسلام نے ایسے نظریہ کو سرے سے مسترد کیا ہے۔

مسیحیت کے پیروکار اس فطری تقاضے کو سرے سے دبانے کے حامی ہیں لہٰذا ان کے یہاں جب اس عمل کو ایک جرم اور خلافِ مذہب فعل قرار دے دیا گیا تو مرد اور عورت اسے ناجائز طریقوں سے انجام دینے پر مجبور ہوگئے۔ اسلام اس خلاف فطرت نظریہ کو بھی مسترد کرتا ہے۔

اسلام نے رشتہ ازدواج کے قانون کو وضع کرتے وقت نہ صرف یہ کہ مرد اور عورت کی تمام اصناف کو' بلکہ اجتماعی' سیاسی' اقتصادی اور آفاقی طور پر پیش آنے والے تمام حالات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ اس حق عمومی سے مستفید ہونے کے لئے موقع فراہم کرنے کی خاطر مختلف ومتعدد مراتب کا خیال رکھتے ہوئے قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ قوانین وضع کرتے وقت اُن مسلّمہ حقائق کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ جن سے چشم پوشی ممکن نہیں کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں ناانصافی ہوگی۔ وہ حقائق یہ ہیں:

۱۔ جنسی خواہشات: یہ خواہش ہر مرد اور عورت' سیاہ سفید' عرب وعجم' سب میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مرد و عورت دونوں کو اس فطری خواہش کو پورا کرنے کا حق ملنا چاہئے۔

۲۔ رشتہ ازدواج ایک دائمی اور باقی رہنے والا عمل ہے لہٰذا طغیان جنسی کے ٹھنڈا ہونے کے بعد بھی مرد اور عورت دونوں کو اسی رشتہ میں باقی رہنا ہے۔ علاوہ بریں اس رشتہ کے ساتھ کچھ مادّی تقاضے بھی وابستہ ہوتے ہیں مثلاً جائے سکونت' لباس' کھانا پینا وغیرہ' وغیرہ۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کیلئے انسان کو اپنی

طبیعت سے جنگ کرنا پڑتی ہے' طبیعت کے سینے کو چاک کرنا پڑتا ہے جو ایک مشکل امر ہے۔ چونکہ مرد کو اللہ نے قوی بنایا ہے اس لئے ان ذمہ داریوں کو مرد کے کندھے پر ڈالا گیا ہے اور قانون وضع کرتے وقت اس صورت حال کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

۳۔ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد مرد اور عورت کے درمیان جو محبت و الفت پیدا ہو جاتی ہے' اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ والدین' اعزاء و اقرباء' جاہ و منصب' وغیرہ سے محبتیں جو پہلے سے دلوں میں ہوتی ہیں' وہ سب اس محبت کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہیں اور یہ محبت دوسری محبتوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ مرد اور عورت اپنے تئیں سوچتے ہیں کہ دوسرے سب لوگ ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے جائینگے' بس ہم دونوں ہی کو آخری دم تک ایک ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ لہٰذا بیوی چاہتی ہے کہ اسکے شوہر کی محبت میں کوئی اور شریک نہ ہو۔ اسی طرح شوہر چاہتا ہے کہ کوئی اور اس کی بیوی سے محبت نہ کرے اور بیوی خود اسکے علاوہ کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہو۔ چنانچہ تعدد ازدواج نہ تو خود مرد اور عورت کے نزدیک کوئی پسندیدہ عمل ہے اور نہ ہی معاشرے میں اسکی پذیرائی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں تو اس سلسلہ میں قانونی رکاوٹیں بھی حائل ہیں۔ ان تمام ناگزیر حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شریعتِ اسلام نے رشتہ ازدواج سے متعلق جو قوانین وضع کئے ہیں' وہ اپنے حسن و خوبی کے حوالے سے رہتی دنیا تک تمام ادیان و مذاہب اور تمام ملل و اقوام کیلئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شریعت اسلام' اپنے قوانین کی رد میں قوانین مرتب کرنے والوں کو یا ان کے مساوی قوانین بنانے والوں کو ﴿قل هاتوا برهانكم یا وادعوا شهداء كم﴾" (ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو دلیلیں لے آؤ) کے الفاظ میں چیلنج دیتا ہے"۔

رشتہ ازدواج سے متعلق جو قوانین اسلام نے پیش کئے ہیں' انکی نوعیت ہمہ گیر اور دوامی ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ کہیں اور سے کوئی ایسا مثالی نمونہ نہیں ملے گا جس کا احاطہ قوانین اسلام میں نہ کیا گیا ہو۔

ہم درج ذیل سطور میں ازدواج سے متعلق اسلامی قوانین کو بالترتیب آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

ا۔ عقدِ دائم

عقد دائم اُس عہد او ر معاہدے کا نام ہے جو مرد اور عورت کے درمیان دائمی رشتہ ازدواج قائم کرتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس معاہدہ میں عورت مقررہ مہر کے عوض اپنے آپ کو مرد کی زوجیت کیلئے پیش کرتی ہے اور مرد اس عورت کو اپنی زوجیت میں قبول کرتا ہے۔ یہیں سے ازدواجی نظام کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ اس نظام کے تحت' حسب توفیق و حیثیت ایک دوسرے پر حقوق و فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔

"عقد" سے مراد معاہدہ ہے۔ دائم اس لئے کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ ما دام العمر کیلئے ہوتا ہے۔ جب تک ان دونوں کے درمیان تلخ و ناگوار حالات پیدا نہ ہوں' ایک دوسرے کو برداشت نہ کر سکنے کی صورت پیدا نہ ہو' یہ رشتہ باقی رہتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر الفت و محبت اور اُنس و غمخواری کیلئے وجود میں آنے والا یہ رشتہ نفرت و انجار کا شکار ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ایک دوسرے کیلئے اس مصیبت سے جان چھڑانے کا راستہ ضرور ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایسے حالات سے چھٹکارا پانے کیلئے جو قانون وضع کیا گیا ہے اسے "طلاق" کہتے ہیں۔ اس طلاق میں ناگوار حالات کا علاج بھی موجود ہے اور دوبارہ رشتہ کو بحال کرنے کی گنجائش بھی ہے۔

حسبِ روایاتِ معصومینؑ و فتاوائے فقہاء یہ بات عیاں اور روشن ہے کہ طلاق کوئی مستحسن عمل نہیں بلکہ بدترین صورتحال سے نکلنے کی ایک چارہ جوئی ہے۔ یہ چارہ جوئی چند حقیقتوں اور فلسفوں کے تحت مرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جبکہ جیسا کہ فارسی مقولہ ہے "چشم کور دشمن" عورت کو بھی اس حق سے کلیتہ محروم نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اسے بھی اس اختیار کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق دیا گیا ہے۔

عقد دائم' عقل اور قرآن و سنت سے ماخوذ دلائل کی روشنی میں بنیادی طور پر مرد اور عورت دونوں کیلئے دیگر ضروریات زندگی کی مانند ایک اہم ضرورت ہے' نہ کہ کوئی تعبدی عمل۔ لہٰذا اگر مشکلات و مسائل درپیش ہوں تو اسے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ضرورت اسی وقت تک ضرورت کہلانے کی مستحق ہے' جب تک اپنی حدود میں رہے۔ حد سے گزرنے کے بعد اسکا شمار تعیش ہونے لگتا ہے۔ ہر وہ چیز جس

کا شمار تعیش میں ہوتا ہے یعنی جو کفایت شعاری کی حد سے تجاوز کر جائے' عقلاء اور اہل شرع اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے' گرچہ ایک حد تک اسے جائز ہی کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔

ازدواجی زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ گرچہ حکیم مطلق نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے' لیکن یہ کوئی مستحسن عمل نہیں ہے اور ایک پر اکتفا کرنے ہی کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔ از روئے قرآن اس ضرورت سے استفادہ کرنا کوئی تعبدی عمل نہیں اور نہ ہی اس کو مکمل طور پر ترک کرنے میں کوئی گناہ ہے' جبکہ ضرورت پر اکتفا کرنا ایک مستحسن عمل ہے۔ آیاتِ الٰہی میں ان تینوں نکات کو بطور واضح و روشن بیان فرمایا گیا ہے:

۱۔ اگر ازدواجی زندگی اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہو یا اسکو ترک کرنے میں ہی مصلحت ہو' جیسا کہ حضرت یحییٰ نے کیا تو اسلام اسکی اجازت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی سورۂ آل عمران آیت ۳۹ میں انکی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿ان اللہ یُبشرک بیحییٰ مُصدقاً بکلمۃٍ من اللہ وسیداً وحصوراً﴾ "اللہ تعالیٰ تجھے (زکریاؑ سے خطاب ہے) یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا' سردار اور ضابط (عورتوں سے پرہیز کرنے والا) ہے۔"

چنانچہ اس حوالہ سے ہمارے امام زمانؑ بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مانند زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۲۔ جیسا کہ بیان ہوا ازدواجی زندگی اختیار کرنا کوئی تعبدی عمل نہیں ہے۔ اسکے بغیر بھی رہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے سورۂ نور آیت ۳۳:

﴿ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحاً حتی یغنیھُم من فضلہِ﴾

"اور لوگوں کو پاک دامن رہنا چاہئے' جو اپنا نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی بنا دے"

۳۔ سورۂ نساء آیت ۳:

﴿.....فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃً......﴾

"اگر تمہیں ڈر ہو کہ عدالت نہ کر سکو گے تو صرف ایک پر اکتفا کرو"۔

اس آیت سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایک پر قانع ہونے ہی کو مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

عقد دائم ایک تنگ گلی سے گزرنے کی مانند ہے:

(الف) اگر جنسی طغیان و طوفان پر عادی طریقے سے قابو پانا اور اس کو کنٹرول میں رکھنا ممکن نہ ہو تو دوسرے جائز ذرائع سے اس پر قابو کر لو جیسا کہ سورۂ نساء آیت ۲۵ میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ومن لم یستطع منکم طولاً اَن ینکح المحصنٰت المؤمنت فمن ماملکت ایمانکم من فتیٰتکم المؤمنت ......﴾ "اگر تم میں سے کوئی آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی وسعت و طاقت نہ رکھتا ہو تو مسلمان لونڈیوں سے جن کے تم مالک ہو (نکاح کرے)........"۔

(ب) رشتہ ازدواج میں لائی جانے والی عورت کی زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کرنا مرد کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ جب وہ اسکی ضمانت فراہم کرے تب ہی رشتہ ازدواج وجود میں آتا ہے۔

۲۔ متعہ یا عقد انقطاعی

متعہ اس عہد یا معاہدے کا نام ہے جس کے تحت مرد اور عورت ایک معینہ مدت کیلئے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ معاہدہ مادام العمر کے لئے نہیں ہوتا اور اسکی مدت باہمی رضامندی سے طے پاتی ہے۔ چونکہ معینہ مدت مکمل ہونے کے بعد معاہدہ ختم ہو جاتا ہے' اس لئے اسکو عقد انقطاعی کہتے ہیں۔ قانون ازدواج میں اس عقد کی حیثیت ثانوی ہے۔

عقد انقطاعی کی ضرورت پیش آنے کی بنیادی وجوہات بھی وہی ہیں' جو عقد دائم کی ہیں۔ چنانچہ اگر کہیں پر بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر عقد دائم ممکن نہ ہو تو ایسے حالات گناہ سے بچنے کی خاطر عقد انقطاعی یعنی متعہ کی اجازت دی گئی ہے۔

جب مرد اور عورت حد بلوغت کو پہنچتے ہیں تو ان کے اندر جنسی خواہشات کا ایک طوفان سا اٹھتا ہے۔ شریعت مقدس نے اس طوفان کو صحیح رخ پر رکھنے کے لئے ازدواجی زندگی کا تصور پیش کیا ہے۔ لیکن اگر ایک طرف

خواہشات کی طغیانی ہو اور دوسری طرف اسکی تسکین کے تمام جائز راستے بند ہوں تو ایسی صورت میں قانون ساز اور قانون شناس اداروں کے نزدیک تین قسم کے امکانات جنم لیں گے:

(الف) اس خواہش کو جبری طور پر دبا دیا جائے اور اسے ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے، جیسا کہ حیوانات کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔

(ب) مرد اور عورت کو انکی مرضی پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ وہ جس طرح چاہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کریں۔ لادین و سیکولر افراد یا وہ فرقے جن کا قبلہ مغرب ہے' اسی فکر کے حامل ہیں جبکہ عرف شریعت میں یہ فعل قبیح ہے اور اسے زنا کہتے ہیں۔

(ج) تیسرا امکان یہ ہے کہ اگر بعض وجوہات کی بناء پر مرد اور عورت عقد دائمی کے ذریعہ رشتہ ازدواجی میں منسلک نہیں ہو سکتے مثلاً یہ کہ دونوں حالتِ سفر میں ہیں اور ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں لیکن جائے خلوت میں دونوں کو سکون پذیر ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بعض والدین اپنی انا پرستی' من مانی اور معاشرتی یا گھریلو مسائل کی وجہ سے اپنی جوان اولاد کے جنسی طوفان کی جنونی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہیں' حالانکہ وہ خود ان مراحل سے گزر چکے ہوتے ہیں لیکن اپنی کیفیت کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسی صورتوں میں ایک ثانوی قانون کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے یہ بات قابل قبول نہ ہو۔ ایسی صورت میں ضرورت اس امر کی ہے کہ تعصب کی عینک اتار کر بحث و تحقیق کی جائے تا کہ حقیقت حال واضح اور مسئلہ حل ہو سکے۔ لیکن ہمارے بعض برادران اسلامی عقل و منطق اور دلیل و برہان سے کام لینے' مسئلہ کا تجزیہ و تحلیل کرنے اور اسپر دقت سے غور کرنے کے بجائے مسائل کو دوسرے فریقوں کی ضد میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات سے ہماری مراد کوئی خاص فرقہ نہیں بلکہ ہر فرقہ کا یہی حال ہے۔

چنانچہ بعض فرقے زنا اور متعہ میں فرق نہیں کرتے۔ کہتے ہیں متعہ یا عقد انقطاعی کی کوئی شرعی حیثیت نہیں بلکہ یہ زنا کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ زنا میں نسل کشی ہے' عمل جنسی کے بعد ایک دوسرے سے جدائی ہے۔ جبکہ

متعہ او رعقد انقطاعی میں ازدواجی زندگی کے تمام قوانین لاگو ہوتے ہیں' صرف مدت محدود ہوتی ہے۔

دوسری طرف اس قانون کے بعض حامیوں نے بھی اس چہرے کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور مخالفین کے اعتراضات سے چڑ کر اس کو عقد دائم سے بھی بہتر و افضل قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اسے ایک منفور و مذموم رسم ازدواج سمجھنے لگے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عقد ازدواج میں اسکی حیثیت ایک ثانوی قانون کی ہے اور یہ بات سنت اور احادیث فریقین سے ثابت ہے۔ یہاں ہمارا مقصد بہر حال اس کے اثبات پر گفتگو کرنا نہیں ہے۔

۳۔ کنیز سے ازدواج

کنیز سے مراد وہ خاتون یا خواتین ہیں جنہیں لشکر اسلام کے سپاہی میدان جنگ میں دشمن کو شکست دینے کے بعد اسیر کر کے لاتے ہیں۔ یہ اسیر اگر مرد ہوں تو عبد (غلام) کہلاتے ہیں۔

جنگ کے اختتام پر مفتوح لشکر یا اسیروں کے وارثین اگر اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کر دیں تو انہیں رہائی مل جاتی ہے' بصورت دیگر یہ لوگ کنیز یا غلام بنالئے جاتے ہیں۔ وہ اسیر خواتین جن کے شوہر لشکر کفر میں ہوں' انہیں ''اِماء'' کہتے ہیں۔ اسیر ہونے کے بعد یہ خواتین بھی اسیر کنندہ کیلئے محرم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایسی کنیز جو پہلے سے شادی شدہ ہو' اس کے ساتھ ہمبستر کیلئے ضروری ہے کہ اسیر ہونے کے بعد ایک طُہر سے گزرے۔ ان ایام مخصوص سے پاک ہونے کے بعد بغیر کسی مقدمہ اور عقد و معاہدہ کے یہ اپنے مالک کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ مزید برآں یہ کنیز کسی دوسرے شخص کو ہبہ بھی کی جا سکتی ہے۔ اسکے بعد اگر اس سے واپس لے لیا گیا' تو ایک طُہر گزرنے کے بعد وہ اپنے مالک کے لئے دوبارہ حلال ہو جاتی ہے۔

سورۂ مبارکہ نساء کی آیت ۲۵ میں لوگوں کو جو آزاد عورت سے شادی نہیں کر سکتے' کنیزوں سے شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کیونکہ کنیز سے شادی کرنے کی صورت میں ان تمام ضروریات و لوازمات کو پورا کرنا ضروری نہیں ہوتا جو ایک آزاد عورت سے شادی کرنے پر عائد ہوتی ہیں۔ جس طرح بعض گروہ متعہ کے معاملہ میں طنز و تشنیع سے کام لیتے ہیں' اسی طرح اس قانون کا بھی دورِ جدید کے نام نہاد بین الاقوامی اداروں کے خود

ساختہ قوانین کی آڑ لیکر مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق یہ قانون خواتین کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ انسانی حقوق کے علمبردار یہ نام نہاد دارے اس وقت اپنی آنکھ کیوں بند کر لیتے ہیں جب ظالم و جابر حکومتیں ہزاروں انسانوں کو بلکہ پورے پورے ملک کو یرغمال بنا کر انکی تمام آبادی کو غلام بنا لیتے ہیں اور ان کی ساری کمائی ہوئی دولت کو لوٹ لیتے ہیں۔ یہ وحشیانہ مظالم تو ان نام نہاد اداروں کو نظر نہیں آتے لیکن میدان جنگ سے اسیر ہونے والی ان کنیزوں پر ان کو بڑا رحم آتا ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ انکو انسانیت سے کوئی محبت ہے بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ان تمام اعتراضات کی بنیاد اسلام دشمنی ہے۔ ان لوگوں نے اسلام دشمنی میں تعصب کی ایسی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے جو حقائق کی روشنی کو انکی نظروں تک پہنچنے ہی نہیں دیتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ بات انکی سمجھ میں آسانی سے آجاتی اسلام کا یہ قانون دراصل اسیر شدہ کنیز کو دو جہتوں سے نیکی و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے:

۱۔ یہ خواتین گرچہ اسیر ہیں لیکن انسان تو ہیں۔ اسیری کی وجہ سے انسانی تقاضے ختم تو نہیں ہو جاتے۔ جس طرح کھانے پینے کی حاجت باقی رہتی ہے، جنسی خواہشات بھی اپنی جگہ موجود ہوتی ہے۔ اگر غلام ہو تو اس کیلئے عورت کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر کنیز ہو تو اس کیلئے مرد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا کنیزوں کے ساتھ مقاربت درحقیقت خود ان کی خواہشات کی بر آوری ہے۔ اسلام کے قوانین چونکہ ہمہ گیر ہیں، لہٰذا اس نے ان خواہشات کا بھی خیال رکھا ہے۔

دورانِ اسیری انکی تمام ضروریات کو پورا کرنا لازمی ہے۔ چونکہ جنسی خواہشات بھی ایک انسانی ضرورت ہے، اس لئے اسکا خیال رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا دیگر ضروریات زندگی کا۔

۲۔ اگر اسیر کنیزوں کو ان کے قوم و قبیلہ والے فدیہ دے کر آزاد نہیں کراتے تو مجاہدین اسلام کو حق حاصل ہے کہ چاہے انکو اپنے گھر میں رکھیں یا فروخت کر دیں۔ دونوں صورتوں میں ان خواتین کو عمر بھر اسیری میں رہنا پڑیگا جبکہ انکے ساتھ شب بستری کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوگی، اُسے فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں آقا کے مرنے کے بعد یہ بچہ خود بخود آزاد شمار ہوگا۔ چنانچہ یہ اسلامی قانون رہائی کا پیش خیمہ ثابت

ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسانی زندگی کی ضروریات میں ایک ضرورت رشتۂ ازدواج ہے۔ مختلف حالات و شرائط اور اجتماع کے نشیب و فراز کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام نے قانون ازدواج کی یہ تین صورتیں وضع کی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر عمل کرنے سے زندگی کے مشکل مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر کہیں ایک شق پر عمل کرنے سے مسائل حل نہ ہوتے ہوں، پیچیدگیاں اور پریشانیاں پیش آرہی ہوں تو اس صورت میں قانون اسلام نے تعدد کی اجازت بھی دی ہے۔ آزاد خواتین کے ساتھ عقد دائمی کی صورت میں یہ حد چار تک معین کی ہے جبکہ عقد انقطاعی اور کنیزی کی شکل میں کوئی بندش نہیں ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں قانون تعدد ازدواج کے بنیادی فلسفے کو قارئین کی خدمت میں پیش کرینگے۔

تعدُّدِ زواج اور زوجات ائمہ طاہرین %

یہاں ہمارا موضوع تعدد زواج ہے لہٰذا ہم تعدد کی ان تمام صورتوں کو موردِ بحث ٹھہرائیں گے، جن کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا، اگرچہ فقہی اصطلاح کے حوالے سے ان میں آپس میں فرق ہی کیوں نہ ہو۔
جہاں تک زوجیت سے حاصل شدہ فوائد و نتائج کا تعلق ہے، مرد کیلئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عقد دائمی ہے، انقطاعی ہے یا کنیز گیری ہے۔ البتہ عورت کیلئے اس بات سے فرق پڑتا ہے کیونکہ عقد دائمی سے حاصل شدہ زوجہ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر پہلے ہم اپنی بحث و گفتگو کے عنوانات کو ترتیب دیں گے:

۱۔ ایک سے زائد عورتوں کو اپنے حبالے میں رکھنے کیلئے قانونی و شرعی جواز اور اس کے مصادر و مآخذ۔

۲۔ بر فرض جواز، اس عمل میں حسن و قبح کے حوالے سے گفتگو یعنی یہ عمل خود اپنی جگہ حسن رکھتا ہے یا اس میں قباحت ہے۔

۳۔ استثنائی حالات میں سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی بنیادوں پر تعدُّد زواج کی ضرورت۔

۴۔ تعدد زواج کے نفی و اثبات میں اس کے مصادر و مآخذ پر گفتگو۔

فقہی اصطلاح میں تعدُّد زواج کے زمرے میں وہ عورتیں آتی ہیں۔ جو عقد دائمی میں ہوں جبکہ عرف عام میں عقد دائم، متعہ اور کنیز گیری، غرض زواج کی تمام صورتوں کو تعدد میں شامل کیا جاتا ہے۔
مغرب والے تعدُّد زواج کی مخالفت میں تو خوب آواز اُٹھاتے ہیں لیکن خود ان کے یہاں بیک وقت کئی کئی خواتین کو دوست بنانے اور ان کے ساتھ شب گزاری کرنے کا رواج عام ہے۔ کیا یہ بات ان کی بیویوں کو ناگوار نہیں گزرتی ہوگی؟ سوال یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کیا فرق ہے، ایک مستحسن اور دوسری قابل نفرین

کیسے ٹھہری؟

تعدُّد زواج کا مصدر و مآخذ بھی وہی ہے جو ازدواجی زندگی کا ہے۔ جب انسان حد بلوغ کو پہنچتا ہے تو جنسی خواہشات اپنے عروج کو پہنچتی ہیں لہٰذا وہ ان خواہشات کی تکمیل کیلئے راستہ تلاش کرتا ہے۔ اگر دریا کو صحیح سمت میں بہنے سے روکنے کی کوشش کی جائے تو پانی غلط رخ میں بہے گا۔ انسان کی اس فطری خواہش کو آسانی سے دبایا نہیں جا سکتا۔ ایسا کرنے میں نہ حسن ہے اور نہ ہی اس کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اس خواہش کو جائز طریقوں سے پورا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس فطری خواہش کی حکمتیں، فلسفے اور تقاضے ہیں۔ خدا نے انسان کی تخلیق کے کسی بھی پہلو کو حکمت سے خالی اور بے مقصد نہیں رکھا ہے۔ جب انسان غذا کھاتا ہے تو اس سے جسم میں نئے نئے خلیئے بنتے ہیں، یہ خلیے پرانے خلیوں کی جگہ لیتے ہیں اور یوں انسانی جسم کو دوام بخشتے ہیں۔ جس طرح قوۂ شہویہ انسان کے غذا کھانے کا سبب بنتی ہے اور غذا کھانے سے انسان کا جسم باقی رہتا ہے، اسی طرح قوت جنسیہ سے انسان کو اس خدا داد فطری خواہش کو پورا کرنے کا موقع ملتا ہے اور اسے امن و سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ عمل تولید مثل کا سبب بنتا ہے۔
اگر یہ تینوں مقاصد ایک ہی زوجہ سے بطریق احسن حاصل ہو جائیں تو ایسی صورت میں تعدد زواج کا تقاضا کرنے میں کوئی حسن نہیں بلکہ قباحت ہے۔ اگر پہلی زوجہ کسی معذوری کی وجہ سے یا عناد و سرکشی کے سبب، حکمت و فلسفے کے ان تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو تو اس وقت دوسری زوجہ کی ضرورت محسوس ہوگی۔ جس حکمت و فلسفے کے تحت مرد کیلئے ازدواجی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے، عورت کی ضروریات بھی وہی ہیں لہٰذا ازدواجی زندگی کے معاملہ میں صرف مرد کو مدنظر رکھنا صحیح نہیں ہے بلکہ عورت کے فائدے کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔
انبیاءؑ اور آئمہؑ کو بھی انہی ازدواجی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جن سے عام انسان دوچار ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں چنداں کوئی فرق نہیں ہے۔ آیات قرآنی اور فرامین معصومینؑ کے علاوہ، عقل و تجربے سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ یہ حضرات بھی بشر تھے، چنانچہ انبیاء و ائمہ طاہرین میں بھی تمام تقاضائے بشر بطور اتم موجود تھے، تاہم فرق یہ تھا کہ انبیاء و ائمہؑ ان تقاضوں کی تکمیل سے زیادہ رضایت خدا، مصلحت شریعت اور مصلحت امت و

رعیت کو مقدم رکھتے تھے۔

یہاں ہمارا موضوع گفتگو مسائل زواج و ازدواج یا ان سے متعلق اشکالات و شکوک و شبہات کا بیان نہیں بلکہ کتب تاریخ میں بعض ائمہ طاہرین سے منسوب کثرت زوجات و اولاد کی حقیقت کے بارے میں تحقیق و جستجو ہے۔ کثرت اولاد کا ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ لیکن اس کا سبب اگر کثرت زواج ہو تو اس میں قباحت اور سوال و استفسار کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً ائمہ طاہرین کے مخالفین اور آئمہؑ کے متعلق شکوک و شبہات رکھنے والوں کو اس بہانے اُنگلی اُٹھانے کا موقع ملتا ہے۔

کتب تاریخ میں بعض ائمہ طاہرینؑ کے ناموں کے ساتھ زوجات کی جو ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے؛ اس کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ آئمہ طاہرین ؑ کے مخالفین بالخصوص خلفائے بنی عباس خود کو بیت نبوت سے قربت کی بنیاد پر خلافت کا مستحق گردانتے تھے۔ اُن کے مقابلے میں اولاد امام حسنؑ خود کو اس منصب کیلئے زیادہ سزاوار جانتی تھی کیونکہ ان حضرات کا؛ بالخصوص جناب حسن مثنٰی کی اولاد کا؛ نسل امام حسنؑ اور نسل امام حسینؑ دونوں سے براہ راست تعلق تھا۔ عبداللہ محض؛ فرزند حسن مثنٰی؛ فاطمہ بنت الحسینؑ کے بیٹے تھے۔

اولاد امام حسنؑ جو تاریخ میں سادات حسنی کے نام سے مشہور ہیں بنی اُمیہ کے خلاف نبرد آزما رہتی تھی۔ ان کے برخلاف بنی عباس ''رضائے آل محمدؐ'' کا نعرہ بلند کر کے مسند خلافت پر قبضہ کرنے میں؛ اولاد امام حسنؑ پر سبقت لے گئے۔ اقتدار پر قابض ہوتے ہی بنو عباس نے اولاد امام حسنؑ پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑنا شروع کر دیا ایک طرف ظلم و ستم اور قتل و غارتگری کا سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف فکری و نظریاتی محاذ پر اُن کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا تھا تا کہ انھیں خلافت سے دُور رکھا جا سکے۔ اس سلسلے میں ایک کام انھوں نے یہ کیا کہ حضرت امام حسنؑ پر عورتوں سے لگاؤ رکھنے اور کثرت ازدواج کی تہمت لگائی۔

اسکے علاوہ انھوں نے آل حسنؑ کے خلاف یہ زہر افشانی بھی کی کہ خواتین سے زیادہ لگاؤ رکھنے کی وجہ سے امام حسنؑ منصب خلافت کو سنبھالنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے؛ اسی لئے خلافت خود ہی معاویہ کے سپرد کر دی تھی۔ اس

بات کو ثابت کرنے کیلئے کہ حضرت امام حسنؑ کے حبالہ عقد میں عورتوں کی ایک کثیر تعداد رہا کرتی تھی؛ تواریخ میں نقل ہے کہ آپ کی شہادت کے بعد اسی (۸۰) سے زائد بچوں کو جھولے میں ڈالکر لایا گیا تھا۔ اس بات کا دعوٰی کرنے والے مؤرخین میں سرفہرست صاحب ''قوۃ القلوب'' ہیں اور دوسرے مدائنی ہیں۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ازواج کی اتنی طویل فہرست کو ثابت کرنا ممکن نہیں تو اسکو کم کرتے کرتے پندرہ تک لے آئے۔ پھر جب اُن میں سے بھی سب کے نام بتانے سے قاصر رہے تو کہہ دیا کہ ایک عورت کا تعلق فلاں قبیلہ سے تھا اور ایک کا فلاں سے۔ اور جب اس طرح بھی خانہ پری مکمل نہ ہو سکی تو بعض کو ام ولد قرار دے دیا۔

غرض ان تمام کوششوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کیا جا سکے کہ حضرت امام حسنؑ نعوذ باللہ عورتوں سے بے حد لگاؤ رکھنے کی وجہ سے کثرت ازدواج میں مبتلا رہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ان دشمنان اہلبیت نے حضرت علیؑ؛ امام حسینؑ؛ امام سجادؑ؛ امام موسیٰ ابن جعفرؑ سبکو کثرت ازدواج سے متہم کیا۔

پس معلوم ہوا کہ دشمنوں نے ان ذوات مقدسہ کو بدنام کرنے کے لئے دورخ سے مہم چلائی...... کبھی مدح سرائی میں جھوٹے قصے گھڑے اور کبھی مذمت میں کہانیاں بنائیں۔ لہٰذا ہمیں ان سب باتوں کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرنا چاہئے۔ اس بات کو تو بہر حال کسی طور جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ کثرت اولاد عورتوں سے لگاؤ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے جبکہ عباد؛ زہاد؛ اہل تقویٰ اور بالخصوص سیاسی و اجتماعی مناصب کی سزاوار ان ہستیوں کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں؛ لہٰذا ایسی باتیں خواہ دوستوں کی زبان سے ہی کیوں نہ ادا ہوئی ہوں؛ ان پر غور و خوض ہونا چاہئے۔

ان لوگوں نے صرف امام حسنؑ مجتبٰے کو متہم کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس اسلحہ کے ذریعہ قیام مقدس امام حسینؑ کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ امام حسینؑ کا قیام خود آپ کے فرامین کی روشنی میں؛ احیائے سنت پیغمبرؐ و سیرت علیؑ؛ نابودی بدعات بنی اُمیہ اور رواج امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے تھا۔ لیکن ان سازشی عناصر نے ہی نہیں بلکہ دوستوں نے بھی غیر شعوری طور پر اس قیام کے بنیادی اساس کو رشتۂ ازدواج سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ قصہ ارینب بنت اسحٰق اور قصہ ھند بنت عبداللہ بن عامر کریز اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان لوگوں نے امام حسینؑ اور یزید کے درمیان اختلافات کی اصل بنیاد انہی دو عورتوں

سے عقد ازدواج کے قضیہ کو قرار دیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم ان فرضی قصوں کی رد میں تفصیل کے ساتھ مدلل بحث کر چکے ہیں۔

۲۔ عرب ثقافت میں قدیم زمانے سے ہی کسی شخص کے تعارف کے دو طریقے رائج ہیں۔ ایک اسکا وہ اصل نام یا اسم کہ جو ولادت کے موقع پر رکھا جاتا ہے اور دوسرے اس کی کنیت' عام طور پر کنیت اس شخص کے بیٹے یا بیٹی کے نام سے منسوب ہوا کرتی تھی' جیسے اُم ولد یا ابو فلاں وغیرہ۔ کبھی کنیت زیادہ معروف ہو جاتی تھی اور کبھی نام' جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مرور ایام کے ساتھ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ دو الگ ہستیاں ہیں۔ چنانچہ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ خود امیر المومنینؑ کی بیٹیوں کی تعداد کے بارے میں اسی وجہ سے اشتباہ پیدا ہوا ہے مثلاً زینب صغریٰ اور زینب کبریٰ' اُم کلثوم صغریٰ اور اُم کلثوم کبریٰ کے نام ملتے ہیں۔ حقیقت میں یہ دو بہنوں کے اسمائے گرامی ہیں جبکہ بعض لوگوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ یہ الگ الگ چار بیٹیوں کے نام ہیں۔ یوں ان ذوات کی پہچان میں متعدد پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس طرح سے اگر ہر شخص کے دو دو' تین تین' نام لیئے جائیں تو یقیناً تعدد کا احتمال رہے گا۔

امام حسن العسکریؑ کی صرف ایک ہی زوجہ تھیں جنکا اسم گرامی نرجس خاتون تھا۔ بنی عباس کی جانب سے خطرے کے پیش نظر امام مہدیؑ کی ولادت تک آپکی والدہ کو پوشیدہ رکھنا مقصود تھا۔ دوسری طرف شیعیان اور معتقدین کیلئے ان کا تعارف ہونا بھی ضروری تھا لہٰذا ایک ہی خاتون کو مختلف ناموں سے پکارا گیا' تا کہ دونوں مقاصد حاصل ہو جائیں۔

۳۔ فلسفہ کثرت ازدواج کی حکمت خواہ جنسی خواہشات کا پورا کرنا ہو تولید نسل ہو یا سکون و اطمینان کا حصول' یہ چیزیں جتنی مرد کیلئے ضروری ہیں اتنی ہی عورت کیلئے بھی اہم بلکہ مرد سے کئی گنا زیادہ ضروری ہیں۔ مرد ہمیشہ ایک ہی کنبہ میں زندگی گزارتا ہے' جبکہ عورت کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے والدین کے گھر میں ہی رہ سکے' خواہ وہاں کتنی ہی عیش و عشرت کی زندگی میسر ہو۔ لہٰذا جو لوگ تعدد ازدواج کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عورت کے ساتھ ظلم ہے' کیا انہوں نے اس سلسلے میں کبھی ان خواتین سے پوچھنے کی

زحمت گوارا کی ہے جو کسی کی حبالہ زوجیت میں نہیں ہیں' کہ اُن پر ایسی صورت میں کیا گزرتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ یہ خواتین کسی کی زوجیت میں نہ رہنے کے بجائے' شرکتی زوجیت کو قبول کر لیتی ہیں پیغمبر اسلامؐ کے بعد جنگ ردّہ' جنگ جمل' جنگ صفین اور جنگ نہروان میں بہت سے افراد قتل یا شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ معاویہ بن ابی سفیان کے سفاک جرنیلوں ضحاک بن قیس' سفیان غامدی' مسلم بن عقبہ اور حجاج بن یوسف کے ہاتھوں بہت سے بے گناہ لوگ مارے گئے۔ ایران' روم اور قادسیہ کی جنگوں میں بہت سے مسلمان مجاہدین شہید ہوئے۔ ان جنگوں اور قتل و غارت گری کے نتیجہ میں بہت سی خواتین بیوہ ہوئیں جبکہ بہت سی دوسری خواتین اسلامی لشکر کے ہاتھوں اسیر ہو کر آئیں۔ جہاں ان تمام خواتین کی ضروریات مسکن' لباس اور غذا کا بندوبست کرنا حکومت اسلامی کی ذمہ داری تھی' وہاں اُن کی فطری خواہشات کی تکمیل کا خیال رکھنا بھی حکومت اسلامی کے فرائض میں شامل تھا۔ چنانچہ ان حالات میں بہت سی خواتین مسلمانوں کی زوجیت میں آئیں۔ اسکی ایک مثال پیغمبر اسلامؐ کی زوجات کی ہے کہ ان میں سے اکثر انہی حالات کے تحت آپکی زوجیت میں آئی تھیں۔

۴۔ بعض حقیقت کے متلاشی انسانوں کے دلوں اور آنکھوں پر مادّی و دنیوی پردے پڑے ہوتے ہیں۔ انہیں دنیوی عیش و عشرت اور لذت بھی باعث افتخار و اعزاز نظر آتا ہے۔ چنانچہ آج کل بہت سے لوگ بغیر کسی تردد اور شرم و حیا کے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اگر مال و دولت ہے تو دین بھی ہے اور آخرت بھی اور اگر مال و دولت دنیا نہیں تو آخرت بھی نہیں۔ یہی لوگ ائمہ اطہار کو بھی اس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان مقدس ذوات کو بدنام کرنے کیلئے گھڑی گئی احادیث کو بھی' ان کی شان میں مدح و منقبت سمجھ کر اپنے زبان و قلم سے بیان کرتے ہیں۔

۵۔ بعض ائمہ کی زوجات کے شمار میں کثرت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جملہ زوجات ایک ہی وقت میں نہ رہی ہوں بلکہ بعض کے وفات پانے پر دوسری زوجات کا انتخاب کیا ہو۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ انسانی زندگی میں شریک حیات کا ہونا ایک ناگزیر مسلمہ ہے۔ چنانچہ حضرت زہرا = نے اپنی وفات کے

موقع پر امیر المومنینؑ سے وصیت فرمائی کہ مردوں کیلئے شریک حیات کا ہونا بہر حال ضروری ہے' لہٰذا میرے بعد آپ میری بہن کی بیٹی امامہ کو اپنے عقد میں لے آیئے گا۔امام حسینؑ کی زوجات کے بیان میں لکھا ہے کہ جناب شہربانو اپنے فرزند امام زین العابدینؑ کی ولادت کے موقع پر ہی وفات پا چکی تھیں۔اسی طرح بہت سے علماء نے کربلا میں جناب لیلیٰ کے موجود نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد جناب رُباب کے علاوہ امام حسینؑ کی کسی بھی زوجہ کا امامؑ کے غم میں بیٹھنے کا ذکر نہیں ملتا۔لہٰذا ائمہ اطہارؑ کی زوجات کی تعداد کی تفسیر اس حوالے سے بھی ممکن ہے کہ ایک کی وفات کے بعد دوسری کو عقد میں لائے ہوں۔

(٦) بعض ائمہ اطہار کی اولاد کا تذکرہ ان کی مادران گرامی کے ذکر کے بغیر کیا گیا ہے۔اس سے بھی ہمارے اس مدعا کی تائید ہوتی ہے کہ ائمہ کی زوجات کی تعداد میں غلو کیا گیا ہے۔بطور مثال ہم امام موسیٰ بن جعفرؑ کی ذات گرامی کو لیتے ہیں۔آپ ۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳ھ میں بغداد میں شہید ہوئے۔آپ کی اولاد میں سترہ (۱۷) ذکور اور اُنیس (۱۹) اناث کا ذکر ملتا ہے جن کی مجموعی تعداد چھتیس (۳٦) بن جاتی ہے جبکہ آپکی زوجات میں صرف تکتم یا طاہرہ اور اُم المومنین کا ذکر ہے جو کہ امام رضاؑ کی مادر گرامی ہیں۔انکے علاوہ کسی زوجہ کے بارے میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔دوسری بات یہ ہے کہ امام موسیٰ ابن جعفرؑ کی شادی زیادہ سے زیادہ پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں ہوئی ہوگی کیونکہ شریعت میں حد بلوغت کا سن یہی معین ہے۔بالغ ہونے سے پہلے شادی کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔امام موسیٰؑ چودہ سال قید میں رہے۔آپؑ نے کل پچپن سال کی عمر پائی چودہ سال قید کے اور سولہ سال ابتدائی زندگی کے ملا کر تیس سال بنتے ہیں جنھیں کل عمر میں سے منہا کرنے کے بعد پچیس سال رہ جاتے ہیں۔اس قلیل عرصے میں آپ کی چھتیس (۳٦) اولاد کا ذکر کرنا اور کسی اور زوجہ کا ذکر نہ آنا غور طلب مسئلہ ہے۔

اسی طرح حضرت سجادؑ کی اولاد ذکور و اناث ملا کر پندرہ کا ذکر ملتا ہے جبکہ زوجات میں صرف امام محمد باقرؑ کی مادر گرامی فاطمہ بنت الحسن کا ذکر آتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ بھی تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

کتب تاریخ و سیر میں ہمارے اکثر ائمہ کی مادران گرامی کو اُم ولد بتایا گیا ہے۔چنانچہ ازواج ائمہ میں کثیر تعداد میں اُم ولد کا ذکر ملتا ہے۔جبکہ سیرت آئمہ یہ رہی ہے کہ کسی کنیز کو زوجیت میں لانے سے پہلے، یہ حضرات اسے آزاد کیا کرتے تھے اور اس کے بعد عقد بجا لاتے تھے۔آزاد عورت سے پیدا ہونے والی اولاد کے ناموں کا ذکر آنا اور خود اس عورت کا نام نہ آنا' مسئلہ کو مورد اشکال بنا دیتا ہے۔

۷۔بعض اولاد ائمہ کے متعلق صرف ایک کتاب میں ذکر ملتا ہے جبکہ بہت سی دوسری کتابوں میں ان کا ذکر سرے سے نہیں ہے۔

۸۔جہاں ائمہ اطہار سے پھیلنے والی نسلوں کا ذکر آتا ہے وہاں اس سلسلے میں صرف تین یا چار اولاد کا نام ملتا ہے جبکہ اس کے برخلاف سوانح حیات کے بیان میں عام طور پر کثیر اولاد کا ذکر کیا جاتا ہے۔اسی وجہ سے بھی کثرت ازدواج کے مسئلہ میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں۔

۹۔اولاد ائمہ کی کثرت کی ایک وجہ مختلف جگہوں پر ان کے نام سے قائم ہونے والی بارگاہیں بھی ہیں۔

جب ان ضریحوں سے متعلق پوچھا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر خواب اور معجزات و کرامات کو ان بارگاہوں کی سند میں پیش کیا جاتا ہے۔یہ رواج ہمارے ملک میں بھی عام ہے۔ہمارے ہاں بھی بہت سی بارگاہیں ایسے ہی معجزات و کرامات کے نام سے معمور و آباد ہیں لیکن کسی بھی حوالے سے ان کی کوئی تاریخی سند نہیں ہے۔ہم یہاں دو مثالیں بطور وضاحت پیش کرتے ہیں۔

(۱) جناب زینب = کا اصل مدفن کہاں ہے؟ اختلاف ہے۔بعض کہتے ہیں کہ دمشق میں ہے جبکہ بعض کے نزدیک مدینہ میں ہے۔لیکن دونوں مدعین میں سے کسی نے بھی اپنے دعویٰ کیلئے دلائل پیش نہیں کئے ہیں تاہم ان دونوں میں سے ایک کا صحیح ہونا معقول ہے۔لیکن ان دو کے بالمقابل ایک اور روضہ شہر اصفہان میں بہت وسیع جگہ پر بنا ہوا ہے جس کیلئے کسی بھی کتاب سے سند نہیں ملتی ہے۔

(۲) اس سے بھی زیادہ واضح شاید یہ ہے کہ شام میں ایک جگہ مزار سکینہ بنت علیؑ کے نام سے قائم ہے۔اس مزار کی تعمیر نو کا اہتمام ایک عالم فرمارہے تھے۔حال ہی میں جب اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے

کہا کہ یہ سکینہ بنت علی خود زہرائے مرضیہ کی دختر تھیں۔ جبکہ کسی بھی تاریخ میں زہراؑ کی بیٹیوں میں سوائے زینب واُم کلثوم کے کسی کا ذکر نہیں ملتا۔

غرض دوست و دشمن دونوں ایک دوسرے کی ضد میں دین و مذہب کے اقدار سے کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اس مذہب کا امام پردۂ غیب میں ہے۔ اب اگر مخلص اور سمجھدار مذہب کے محافظ اپنے علم و فکر اور قلم سے اس کی پاسداری نہیں کرینگے تو یقیناً دشمن اپنے مفادات کی خاطر اس مذہب کا مذاق اڑاتا ہی رہے گا۔

ہمارا مدعا یہ ہے کہ اس سلسلے میں بحث و تحقیق کی ضرورت ہے لیکن بد قسمتی سے ائمہ کی زندگی کا یہ شعبہ بالکل متروک ہے۔ دردتو اس بات کا ہے کہ وہ افراد بھی کہ جو یا دو نام امام حسینؑ سے اپنا گزارا کرتے ہیں دُنیوی خوشنودی کا حائل پردہ اپنے سامنے سے ہٹا کر تحقیق کی عینک پہن کر جانچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہماری اس کتاب کا موضوع چونکہ امام حسینؑ ہے لہٰذا ہم نے امام حسینؑ کی حد تک مقدور بھر قلم اُٹھانے کی کوشش کی ہے اس ضمن میں دیگر ائمہ کے متعلق بھی تحقیق کرنے اور تحقیق کے نتائج کو ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت ہے۔

found.

آلِ مُرادی

تمام قبائل عرب دو مشہور قبیلوں پر منتہی ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک قبیلہ عدنان ہے اور دوسرا قحطانیہ۔ یہ دونوں قبیلے آخر میں جا کے حضرت اسماعیلؑ سے ملتے ہیں جنہیں جدِ عرب بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ کتاب "**سبائك الذهب فى معرفة قبائل العرب**" میں صفحہ ۴۵ پر اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

سلسلۂ قحطانیہ سے ایک قبیلہ نکلا جسے بنی مراد کہتے ہیں۔ اس قبیلہ کی ایک برجستہ شخصیت کہ جس نے شرف و افتخار، آزادی اور مردانگی کی تاریخ رقم کی ہے، کا نام "ہانی بن عروہ مرادی" ہے۔ تمام کتب انساب عرب میں انکا نسب مختصر فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ کتاب "**جمهرة انساب العرب**" کے صفحہ ۴۰۶ اور کتاب "**نهاية الارب**" صفحہ ۳۶۳ پر ان کا سلسلہ نسب اس طرح سے لکھا ہے:

﴿هانى بن عروه بن نمران بن عمرو بن قعاس بن عبدیغوث بن مخلش بن عصم بن مالك بن عوف بن منبه بن غطيف بن عبدالله بن ناجيه ـ﴾ [1]

بنو مراد بنو کہلان سے ہیں اور کہلان قحطانیہ سے ہیں۔ بنو مراد بن مالک بن ادد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان ہے۔ [2]

ھانی اور ان کے والد اصحاب رسول اکرمؐ میں شمار ہوتے تھے۔ بالخصوص ھانی مولا علیؑ بن ابیطالبؑ کے انتہائی مخلص اور پائیدار و مدافع دوستدار تھے۔ آپ جنگ جمل، صفین اور نہروان میں امیرالمومنین کے رکاب میں برابر شریک تھے۔

---

[1] [جمہرۃ انساب العرب ص ۴۰۶]　[2] [نہایۃ الارب صفحہ ۳۶۳]

ھانی اپنے قبیلہ میں انتہائی شرف ومقام رکھتے تھے۔وہ جب کسی سے جنگ کرنے نکلتے تو ان کے اپنے قبیلے سے چار ہزار مسلح جوان اور آٹھ ہزار پیادہ فوج ساتھ نکلتی تھی۔ان کا قبیلہ' کندہ اور دیگر قبائل سے بھی معاہدہ تھا جب ان تمام قبائل کو جمع کرتے تھے تو تقریباً تیس ہزار کا لشکر بن جاتا تھا جو آپ کی رکاب میں ہوتا تھا۔آپ شجاعت' شہامت اور جرأت کے مالک تھے۔

کسی سزایافتہ شخص کو آزاد کرانے کے جرم میں' معاویہ نے آپ کے خون کو ھدر قرار دیا تھا اور وہ آپ کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ایک دفعہ آپ شام گئے اور معاویہ کی مجلس میں پہنچے۔دوسرے لوگوں کے چلے جانے کے بعد آپ نے خود انتہائی جرأتمندی کے ساتھ معاویہ سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں ھانی بن عروہ ہوں۔

آپ امانت ودیانت داری اور انسانی جرأت وغیرت میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔جب کوفہ والوں نے قیادت ورہبری کیلئے امام حسینؑ کو دعوت دی تو امامؑ کے بھائی مسلم بن عقیلؑ آپؑ کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ پہنچے۔جناب مسلم نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں دو مہینے سے زائد عرصہ قیام کیا۔اس دوران ہانی بن عروہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔جب اہل کوفہ کی نفسیات سے واقف اور ان کی غدر وستی سے آشنا' عبید اللہ بن زیاد' حاکم بن کر کوفہ پہنچا تو مسلم نے خود کو اور اپنے مشن کو مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں غیر محفوظ جانا۔ لہٰذا آپ بروقت ھانی بن عروہ کے گھر پہنچے' دق الباب کیا اور ان سے پناہ طلب کی۔

یہاں تاریخی نقول میں اختلاف ہے۔بعض نے لکھا ہے کہ ھانی نے آپ کو دیکھتے ہی آپ کا استقبال اور خوش آمدید کہا اور اپنے گھر سے زیادہ چہرے اور سینے میں ان کیلئے کشادگی دکھائی۔دوسری نقل کے تحت ھانی نے کہا کہ "آپ نے میرے گھر کو اپنے لئے مرکز انتخاب کرکے میرے وجود کو اور میرے گھر کو خطرے میں ڈالا ہے۔کاش! آپ تشریف نہ لاتے۔اب جبکہ آپ تشریف لا چکے ہیں تو میں اپنی تمام تر توانائی اور دینی تقاضوں کے تحت آپ کی محافظت کروں گا"۔یہ کہہ کر وہ حضرت مسلم کو گھر کے اندر لے گئے۔

ان دونوں نقول میں کوئی نقص یا قابل اعتراض بات نہیں ہے ھانی جیسی شخصیت کو فقط پناہ دینا تو ممکن ہے آسان ہو مگر ان کی نگہداری وپاسداری کرنا اور حقوق کی ادائیگی آسان کام نہ تھا۔لیکن پھر بھی ھانی نے عملی

میدان میں کبھی کسی کراہت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ھانی نے مسلم کے ساتھ ان کے مشن کو بھی اپنے گھر میں پوری جرأت کے ساتھ جاری وساری رہنے دیا۔ چنانچہ کتنے ہی نقول ملتے ہیں کہ امام حسینؑ کی آمد سے متعلق تمام سرگرمیاں اور صلاح ومشورے جناب ھانی ہی کے گھر میں ہوا کرتے تھے۔یہاں تک کہ مسلم کے بصرہ سے آئے ہوئے دوست' شریک بن اعور (دوستدار علیؑ) کے ساتھ مل کر عبید اللہ ابن زیاد کے وجود کو ختم کرنے کے منصوبے بھی اسی گھر میں بنائے گئے لیکن آپ نے اس سلسلے میں کسی قسم کی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ھانی کی شخصیت کو ایک ہی زاویے سے سمجھنا یا ایک ہی نقطہ نظر سے اس پر بحث کرنا' دراصل ناانصافی ہے۔ ان کی شخصیت کا مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

شخصیت نمائی' ریاکاری اور دوسری بے مقصد چیزیں آپ سے دور تھیں۔

ھانی نے اپنے آپ کو کوفہ والوں کی جنونی اور ناپائیدار سرگرمیوں سے دور رکھا تھا۔جب تک حضرت مسلم آپکے گھر تشریف نہیں لائے تھے آپ عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں جایا کرتے تھے تاکہ اس کی نظروں میں آپ کی شخصیت مشکوک ومشتبہ قرار نہ پائے۔لیکن جب جناب مسلم آپ کے گھر میں تشریف لائے تو آپ نے جناب ابراہیم خلیل اللہ کی طرح اپنے آپ کو بیمار وعلیل ظاہر کرکے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تاکہ کسی صورت بھی اسرار محمدؐ فاش نہ ہونے پائیں۔یہ آپ کی شخصیت کے فہم وفراست اور تدبر کا زاویہ ہے۔

عبید اللہ بن زیاد نے شیطانی مکروفریب کے پروگرام کے تحت معقل کو مسلم بن عقیل کی تلاش میں بھیجا۔معقل اس میں کامیاب ہوا اور اس نے ھانی کے گھر میں مسلم کے حضور پہنچنے کے بعد عبید اللہ بن زیاد پر تمام اسرار کو فاش کردیا۔یوں وہ اپنی مکاری میں کامیاب تو ہوگیا لیکن اس کے باوجود مسلم بن عقیل اور ان کے گرد حسینی مجاہدین کو محاصرے میں لے کر ختم کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔یہ اس بات کی واضح وروشن دلیل ہے کہ ھانی کی شخصیت معمولی نہیں تھی۔عبید اللہ ابن زیاد جیسا طاقتور شخص ھانی کی شخصیت سے خوفزدہ تھا۔اسے محاصرہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔وہ طویل سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ھانی کے ساتھ مقابلہ طاقت کے ذریعہ

سے صحیح نہیں ہے بلکہ مکروفریب' چاپلوسی اور دھوکے کے ذریعے ھانی کو قابو کرنا چاہئے ۔ چنانچہ وہ اپنی اس شوم سازش پر عمل پیرا ہوا۔

پہلے مرحلے میں اس نے یہ سوچا کہ ھانی کو مکروفریب سے دربار میں بلا کر اپنی نگرانی میں لے، پھر مسلم پر ہاتھ ڈالے ۔ اس کی نظر میں ہانی کو چھوڑ کر مسلم کو چھیڑنا صحیح نہیں تھا ۔ چنانچہ اس کام کیلئے اس نے ایک مرحلہ وار طریقہ اپنایا اور ھانی کے قریب ترین افراد اسحاق بہ خارجہ' محمد بن اشعث اور عمر بن حجاج زبیری سے کہ جو ھانی کے سالے تھے' ھانی کے بارے میں شکایتیں کیں کہ وہ کیوں ہمارے پاس نہیں آتے ۔ ابن زیاد نے ان سے کہا کہ "ھانی کے نہ آنے سے ہمارے لئے مسائل درپیش ہیں' لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں" ان لوگوں نے جواب دیا کہ "ان دنوں ھانی بیمار ہیں' اس لیئے وہ دربار میں حاضری دینے سے معذور ہیں"۔ اس پر عبیداللہ نے کہا: "نہیں' ایسا نہیں ہے ۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ وہ بیمار نہیں بلکہ اپنے گھر کے استقبالیہ میں بیٹھ کر لوگوں سے ملتے بھی ہیں ۔ انھیں ہمارے پاس آنا چاہئے' ہمارے دل میں ان کیلئے عزت و احترام ہے" ۔ یہ باتیں سن کر وہ تینوں ھانی کے پاس گئے اور ھانی کو قانع کر کے دارالامارہ لے آئے ۔

جب ھانی دارالامارہ پہنچے تو عبیداللہ بن زیاد نے پہلے مرحلہ میں ان کا استقبال کیا' جس پر حاضرین متعجب ہوئے ۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اس کا رویہ تبدیل ہو گیا اور نہایت تحقیر آمیز لہجہ میں ہانی سے مخاطب ہوا: "تمہارے گھر میں امیرالمومنین کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں' تم نے مسلم کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے' تم ہمارے خلاف لشکرکشی کیلئے اسلحہ سازی میں مصروف ہو ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں؟ تم خائن ہو اور آج خود اپنے پاؤں سے چل کے ہمارے پاس آئے ہو ۔" عبیداللہ بن زیاد اسی دوران اس ملعون معقل کو سامنے لے آیا ۔ معقل کو دیکھ کر ھانی کی ہمت ٹوٹ گئی ۔ اپنی شہادت اور مسلم کی مظلومیت نظروں کے سامنے آ گئی ۔ لیکن انہوں نے اس حال میں بھی مسلم کے تحفظ و پاسداری کا خیال رکھا اور انتہائی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے عبیداللہ زیاد سے کہا "ٹھیک ہے' ہم سے غلطی ہو گئی' اب ہم سے جو ضمانت لینا چاہتے ہو' لے لو ۔ میں مسلم کو بلا کر نہیں لایا تھا' وہ خود میرے پاس آئے تو میں نے ان کو پناہ دی ۔ اب میں ان سے کہہ

دوں گا کہ میرے گھر سے نکل جائیں تا کہ مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ رہے ۔" عبیداللہ بن زیاد نے کہا: "نہیں' ایسا ممکن نہیں ۔ جب تک مسلم کو ہمارے سپرد نہ کرو گے' تمہاری رہائی ممکن نہیں ہے ۔"

انسان کی جوانمردی' دینی اور خاندانی شرف و غیرت کا اندازہ ایسے ہی موقعوں پر کیا جا سکتا ہے ۔ ھانی نے کہا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے مہمان کو تمہارے سپرد کر دوں تا کہ تم اس کو قتل کر دو ۔ یہ مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا ۔ میں اپنے لئے عار و ذلت کبھی برداشت نہیں کروں گا ۔ جب تک میں زندہ ہوں' میں ایسا ہونے نہیں دوں گا ۔ میں اس کی حیات کی خاطر خود کو موت کے حوالے کر دوں گا ۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میرے ذمہ اگر رسولؐ کا کوئی بچہ بھی ہو تو میں اس پر سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا ۔"

پھر ھانی نے ابن زیاد سے نصیحت کے طور پر کہا کہ: "تمہارے باپ زیاد پر میرا احسان ہے ۔ آج میں اس احسان کا صلہ تم سے چاہوں گا ۔" اس نے کہا: "کیا صلہ لینا ہے"؟ ھانی نے کہا: "میری نصیحت یہ ہے کہ تم اپنے اہل و عیال کو لیکر شام چلے جاؤ کیونکہ اس منصب کے لئے تم سے زیادہ سزاوار اور لائق اس شہر میں آ چکا ہے"۔ اب عبیداللہ بن زیاد کو طیش آ گیا ۔ غصے میں کہنے لگا: "تم کیا کہتے ہو؟ فوراً مسلم کو میرے حوالے کر دو' میں اسکی گردن اُڑا دوں گا ۔" ہانی نے کہا: "اگر تم نے ایسا کیا تو اس قصر کے گرد تم تلواروں کی گرج و چمک دیکھو گے ۔" اس پر عبیداللہ بن زیاد غصے سے آگ بگولہ ہو کر بولا: "مجھے دھمکی دیتے ہو ۔" ابن زیاد کے حواریوں نے ہانی کو گرفتار کر لیا اور ان کے چہرے پر مارا جس سے خون جاری ہو گیا ۔ ستانوے (۹۷) سال کے بوڑھے ھانی نے اپنے آقا سے پہلے اپنی پیشانی کے خون سے اپنے محاسن کو خضاب کیا اور زندان میں ڈال دیے گئے ۔

جب ہانی کے قبیلہ والوں نے اُن پر گزرنے والی مصیبتوں کو دیکھا اور انہیں موت کے دہانے پر کھڑا پایا تو دارالامارہ کا محاصرہ کر لیا ۔ یہ دیکھ کر عبیداللہ نے قاضی شریح کو حکم دیا کہ ہانی کو دیکھ کر فتویٰ جاری کرے ۔ جب قاضی شریح فتویٰ بلیسی دینے کیلئے زندان میں گیا تو ہانی نے شریح سے درخواست کی کہ وہ انہیں ان ظالمین سے نجات دلائے ۔ لیکن اس نے بے اعتنائی برتی اور چھت پر جا کر ہانی کی رہائی چاہنے والوں کو مخاطب کر کے بولا: تم لوگ امن کو خراب نہ کرو' تمہارا رئیس زندہ ہے ۔" یہ کہہ کر اس نے لوگوں کو منتشر کر دیا ۔

جب حضرت مسلم کو شہید کرنے کے بعد عبیداللہ بن زیاد نے اپنے رقیبوں اور حریفوں کے بارے میں اطمینان محسوس کیا تو اپنے جلادوں کو حکم دیا کہ ہانی کو نکالو اور بازار میں لے جا کر قتل کردو اور اسکے سر کو میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ ہانی کو غلو و زنجیر میں جکڑ کر اس بازار میں لے جایا گیا جہاں گوسفند فروخت ہوتے تھے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ہانی سے کہا کہ: ''ہمیں حکم ملا ہے کہ تمہیں تمہارے صاحب (مسلم بن عقیل) سے ملا دیں۔'' یہ سن کر ہانی نے اپنے قبیلہ والوں کو آواز دی لیکن ان کی فریاد رسی کیلئے کوئی نہیں آیا۔ جب ہانی نے دیکھا کہ کوئی مدد کو نہیں آ رہا ہے تو اپنے ہاتھوں سے رسیوں اور زنجیروں کو توڑ ڈالا اور دائیں بائیں رخ کر کے بولے: ہے ''کوئی جو مجھے ایک چھری دے دے؟ ہے کوئی جو مجھے ایک عصا پکڑا دے؟ ہے کوئی جو مجھے ایک پتھر دے دے تا کہ میں ایک مسلمان اپنے نفس کی حفاظت کر سکوں۔'' وہ آل مراد کو بھی آواز دیتے تھے لیکن کوئی ہانی کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ جب جلادوں نے ہانی سے کہا کہ اپنا سر آگے کرو تو ہانی نے جواب دیا کہ میں ''اتنا سخی نہیں ہوں کہ تمہاری مدد کروں۔'' عبیداللہ کا ترکی غلام جس کا نام رشید تھا' آگے بڑھا تو ہانی کی آواز بلند ہوئی: **''الی اللہ معاد.........اللھم الی رحمتک ورضوانک''**

اس کے بعد ہانی کا سر مقدس تن سے جدا ہو کر گرا۔ مسلم اور ہانی دونوں کے سرہائے مقدس اسی طرح یزید کیلئے بطور تحفہ بھیجے گئے' جس طرح جناب یحییٰ کا سر بطور تحفہ ایک زانی کو بھیجا گیا تھا۔ دونوں شہیدوں کے پائے اطہر کو رسیوں سے باندھ کر بازاروں میں پھرایا گیا تا کہ ان کے حامیوں کے غیظ و غضب سرد پڑ جائیں۔ اس منظر کو فرزدق نے اشعار میں یوں پیش کیا ہے۔

اذا کنت لاتدرین ماالموت فانظری
الی ھانی فی السوق وابن عقیل

الی بطل قدھشم السیف وجھہ
وآخر یھوی من طمار قتیل

''اگر مرگ و موت کو نہیں جانتے ہو تو بازار میں ھانی اور ابن عقیل کے جسم کی طرف دیکھو۔ اس قہرمان

کی طرف دیکھو جس کے چہرے کے گوشت کو تلوار نے چیر دیا اور ہڈیوں کو توڑ دیا اور اس دوسرے قہرمان کی طرف دیکھو جو اونچائی سے گرا دئے گئے اور شہید ہوئے۔''

قارئین! ذرا غور کیجئے اس برجستہ شخصیت' اسکی مطہر اور پاکیزہ زندگی اور اسکی وفا و شہامت میں کتنے دروس اور کتنی عبرتیں موجود ہیں۔ کاش عزاداران حسینؑ ان کو درک کرتے۔ وہ شخصیت کہ جس کے ایثار و قربانی اور وفا شعاری کا ذکر تمام تاریخوں میں ملتا ہے' اس کے مصائب کا بیان مجالس عزا میں برائے نام اور سرسری انداز سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بعض گمنام و بے اساس شہید یا ایسے افراد جن کا کربلا میں کوئی کردار نہیں' انکے من گھڑت مصائب کا ذکر پوری آب و تاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ عزاداری امام حسین -کے ساتھ یہ کیسا انصاف ہے؟

وہ قاضی شریح کہ جس نے عبیداللہ بن زیاد کی مرضی کو مقدم رکھتے ہوئے غیظ و غضب الٰہی کو خرید لیا اور ہانی کا خون بہانے میں اسکی مدد کی' ہمارے بعض خطباء و ذاکرین اس بزدل انسان کو طفلانِ مسلم کا محافظ گردانتے ہیں۔ ذرا غور تو فرمایئے کہ عزاداری امام حسینؑ کن مصائب سے گزر رہی ہے؟ عزاداران امامؑ مظلوم کیوں ان باتوں پر توجہ نہیں دیتے؟ کیا یہ عزاداری کے ساتھ ظلم نہیں ہے؟

not found.

آلِ اسد

سرزمین عرب پر چند قبائل جو منتشر انداز میں بسے ہوئے تھے اور تمام عرب میں پھیلے ہوئے تھے' بنی اسد کے نام سے مشہور رہیں۔ معاجم اور کتب انساب عرب میں پانچ قبائل بنواسد کے نام سے ملتے ہیں جن میں سے تین کے نام یہ ہیں:

۱۔ قبیلہ اسد ابن خزیمہ بن مدرکہ۔

۲۔ قبیلہ اسد بن ربیعہ بن نزار۔

۳۔ قبیلہ اسد بن قصی بن کلاب۔

ان تینوں کا نسب عدنانیہ پر منتہی ہوتا ہے۔

انکے علاوہ جو دو اور قبائلِ بنواسد ہیں' ان میں سے ایک قبیلہ' بنی اسد بن قضاعیہ ہے۔ جس کا نسب یہ ہے: اسد بن وبرۃ بن ثعلب بن حلوان بن عمران بن حافی بن قضاعیہ۔ قضاعیہ حمیر سے ملتا ہے اور حمیر کا سلسلہ نسب قحطانیہ پر منتہی ہوتا ہے۔

دوسرا قبیلہ' بنی اسد' اسد بن عائذ بن مالک بن عمرو ابن مالک بن فہم بن غنم بن دوس بن عدنان بن عبداللہ بن زہران بن کعب بن حارث بن کعب بن حارث بن عبداللہ بن مالک بن نصر ہے۔ یہ بھی قحطانیہ سے ملتا ہے۔ خود سلسلہ قحطانیہ میں دو قسم ہیں۔ ان میں سے ایک قحطانیہ یعرب کا باپ ہے جو نسل اسماعیلؑ سے تھے۔ یہی سب سے پہلے عربی زبان بولنے والے تھے اور اسی لئے یعرب کے نام سے مشہور رہوئے۔

قیام مقدس امام حسینؑ کا ایک محرک دعوتِ اہل کوفہ تھا۔ ان دعوت کرنے والوں میں مختلف قبائل عرب کے رؤساء شامل تھے ان میں سے ایک قبیلہ' بنی اسد بھی تھا۔

قبیلہ' بنو اسد کے بہت سے لوگوں نے عرب اخلاق واقدار کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور اپنے قبیلہ کو بے وفائی' غدر اور دھوکا بازی کی سیاہی سے داغدار کیا تھا۔ لیکن اس قبیلہ کی بعض شخصیات ایسی بھی ہیں جنہوں نے اسکا نام روشن کیا ہے۔ جب تک اسلام باقی ہے اور جب تک آسمان حسینیت پر آفتاب طلوع ہوتا رہے گا' قبیلہ' بنو اسد کے یہ درخشاں ستارے اس آسمان پر چمکتے رہیں گے۔ اسلام و اہلبیت - کے چاہنے والے' عاشقان و فریفتگانِ فضیلت و شرافت ان ہستیوں کو نہیں بھولیں گے۔ یہ ہستیاں قیام مقدس امامؑ میں رگِ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے بے مثل کردار اور کمالِ وفاداری نے قبیلہ میں ان کی انفرادی واجتماعی حیثیت کو ضرب المثل بنا دیا ہے۔ اس قبیلہ سے جن ہستیوں نے اسلام و امامت کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں' یہاں ان کا نام لینا درحقیقت ان پر احسان نہیں' بلکہ قیام مقدس امام حسینؑ کی عظمت و بزرگی کا سبب اور ہمارے لئے نمونہ کامل اور اسوۂ درخشان ہے۔ ان ہستیوں کے نام گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ انس بن کاہل۔ صحابیٔ بزرگ رسولؐ اللہ

جنگ صفین میں معاویہ کے مقابلہ میں امیرالمومنینؑ کے برحق ہونے کی ایک نشانی یہ تھی کہ تمام اصحاب رسولؐ علیؑ کی رکاب میں تھے۔ چنانچہ اس جنگ میں اسی (۸۰) سے زائد اصحاب رسولؐ شہید ہوئے۔ جبکہ معاویہ کے ساتھ صرف دو نام نہاد صحابی تھے۔

امام حسینؑ کی رکاب میں بھی چند ایسے اصحاب رسولؐ موجود تھے جنہوں نے اپنے کانوں سے رسول اکرمؐ کی زبانی عظمت و بزرگی حسینؑ کو سنا تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ نے اپنے آخری خطبے میں اصحاب رسولؐ کو اہل کوفہ پر اپنی حقانیت واضح کرنے کی دعوت دی۔ ان صحابیوں میں سے ایک انس بن حارث بن نبیہ بن کاہل بن عمرو ابن صعب بن اسد بن خزیمہ تھے۔

یہ صحابی برجستہ رسولؐ تھے۔ بدر وحنین میں پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے پیغمبر ﷺ سے نقل فرمایا کہ "میرا بیٹا حسینؑ کربلا میں شہید ہوگا' تم میں سے جو بھی وہ وقت دیکھے میرے بیٹے حسینؑ کی مدد کرے" [1]

[1] [نقل از حیات امام حسینؑ جلد سوم ص ۲۳۴]

فرمانِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے یہ صحابیؓ برجستہ مکہ مکرمہ سے ہی حسینؑ کی رکاب میں تھے۔ آپ بہت عمر رسیدہ تھے۔ آپ نے جب امام حسینؑ سے میدان میں جانے کی اجازت لی تو پہلے اپنے عمامہ کو کمر پر باندھا پھر پیشانی پر ایک کپڑا باندھا۔ امام حسین - نے جب شوق شہادت کا یہ منظر دیکھا تو نظروں کو نیچے کر کے رونے لگے اور فرمایا: ''خدا آپ کے اس عمل کو قبول فرمائے اور جزائے خیر عطا کرے:'' اس صحابی نے بڑھاپے کے عالم میں خدا کی راہ میں جہاد کیا اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔ آپ کی روح پرواز کر کے انبیاءوصدیقین اور شہداء کی صف میں شامل ہو گئی۔

۲۔ حبیب ابن مظاہر ÷ حبیبِ حسینؑ

آپ کا پورا نام حبیب بن مظہر بن رئاب بن اشتر بن جخواں بن فقعسن بن عریف بن عمرو بن قیس بن حرث بن ثعلبہ بن دودان بن اسد ہے۔ معاجمِ یادرشناسی اور کتب رجال میں علماءوفقہاء نے سرورِ شہیداں حسینؑ بن علیؑ کے یارانِ باوفا میں سرفہرست جس دوست کا ذکر کیا ہے، وہ حبیب ابن مظاہر کی ذات گرامی ہے۔

آپ قبیلہ بنی اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض کتب رجال میں آپ کو اصحاب رسولؐ میں گردانا گیا ہے۔ لیکن آیت اللہ خوئی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اور بعض دیگر محققین علوم رجال نے آپ کو حضرت امیرالمومنینؑ اور حضرات امام حسنؑ و امام حسینؑ کے اصحاب میں شمار کیا ہے۔ علمائے کرام نے اپنی کتب میں حبیب کا تذکرہ کرتے ہوئے آپکو قوی الایمان، صاحب بصیرت اور علیؑ کے دورِ خلافت کے انتظامی ڈھانچے میں شرطۃ الخمیس (پولیس کی انتظامیہ کے اہم رکن) قرار دیا ہے۔

امام حسینؑ مجتبیٰ کے معاویہ کے ساتھ صلح پر مجبور ہونے کے بعد، آفتاب قسط وعدالت افقِ اہل بیت سے زوال پذیر ہو کر جہالت کی تاریکی یعنی خاندانِ اموی میں غروب ہو گیا۔

جناب حبیب قیام قسط وعدالت کی صبح صادق کے انتظار میں گھنٹوں نہیں مہینوں نہیں بلکہ سالہا سال سے شہر کوفہ میں زندگی گزار رہے تھے۔ حبیب اور انکے ساتھی اپنے حلقۂ احباب میں ملاقات کے دوران ایک ایسی ہی صبح صادق کے طلوع ہونے کے بارے میں ایک دوسرے کو رمزیہ انداز میں بشارت دیتے رہتے تھے، بلکہ کبھی

کبھی تو غیب کی باتیں کرنے لگتے تھے۔

کانفرنس خلع خلیفہ

سنہ ۶۰ ہجری ماہ مبارک شعبان کے آخری یا رمضان المبارک کے ابتدائی ایام تھے۔ شہر کوفہ میں سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر میں خلیفہ ظلم وظالم سے نجات حاصل کرنے کیلئے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ کوفہ میں موجود اہل بیتؑ کو چاہنے والی برجستہ شخصیات نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ اس میں معاویہ کی ہلاکت کے بعد منصب خلافت اسلامیہ پر اسکے نصب کردہ ولی عہد کو کرسی خلافت اسلامی سے اتارنے اور خلافت وامامت کے اصل وارث، محبوبِ مسلمین حسینؑ بن علیؑ کو نامزد کرنے کے مسئلہ پر گفت وشنید ہوئی۔ اس کانفرنس کے شرکاء میں اہم ترین اور سب سے برجستہ شخصیات جناب حبیب ابن مظاہر کی تھی۔ آپ تا دم آخر اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔ شہر کوفہ کی چاروں طرف سے ناکہ بندی ہو چکی تھی لیکن نصرت امام کا جو عہد آپ نے کیا تھا، اسکے ایفاء کی خاطر خاردار اور خطرناک ترین راستوں سے گزر کر اپنے آپ کو خدمت امامؑ میں پہنچایا۔ آپ کیسے اور کس طرح کوفہ سے نکلے، اسکے بارے میں کوئی سند نہیں ملتی ہے۔ مگر اتنا ضرور ملتا ہے کہ آپ اپنے دوست مسلم بن عوسجہ کے ساتھ نکلے تھے۔

اس کانفرنس میں شریک مہمان ومیزبان دونوں عاشقان و دوست داران اہل بیت تھے۔ انکے درمیان اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ اس دنیوی زندگی سے کون کس حد تک وابستہ ہے۔ اسی بنیاد پر کانفرنس کے شرکاء تقسیم ہو گئے۔ ان شرکاء کے ایک گروہ کو دنیا کی وابستگی نے وقتی طور پر پیچھے کھینچ لیا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ امام عادل کی نصرت کو بروقت نہ پہنچ سکے۔ حالانکہ شہادت امام حسینؑ کے بعد جیسے ہی انکو اپنی غلطی کا احساس ہوا، یہ لوگ خون حسینؑ کا انتقام لینے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور سب کے سب اس راہ میں مارے گئے۔ بروقت اقدام نہ کرنے اور صالح قیادت کی رکاب میں باطل سے لڑنے میں تاخیر کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدنظمی کا شکار ہو گئے۔ قائد ورہبر کے بغیر حسرت وندامت کی سانسوں کے ساتھ، دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تاریخ میں یہ جانباز ''توابین'' کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن اپنی قیمتی

جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے باوجود یہ بے چارے وہ مقام ومنزلت حاصل نہ کر سکے جو بروقت اقدام کرنے والے گروہ کو نصیب ہوا یعنی وہ خوش نصیب جنھوں نے دنیا سے وابستگی کو اسی وقت پیچھے چھوڑا اور خود کو رکابِ حسینؑ میں پہنچایا۔ حبیب ابن مظاہر کا نام انہی خوش نصیبوں میں سرِفہرست آتا ہے۔ آپ ان تین عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جنکو پرچم دارِ حسینی ہونے کا شرف وافتخار حاصل ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وقتِ آخر امامؑ آپ کے سرہانے پہنچے اور اس عظیم قربانی کے صلہ میں درگاہِ خداوندی میں آپ کے درجات ومراتب میں بلندی کیلئے دعا کی۔

جس طرح زندگی میں حبیب ایک ممتاز مقام کے حامل تھے، شہادت کے بعد بھی آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ کی قبر مبارک تمام شہدائے کربلا سے ہٹ کر ایک ایسی جگہ واقع ہے، جہاں سے ہو کر قبرِ حسینؑ پر جانا پڑتا ہے۔ اہل بیت، بالخصوص حضرت امام حسینؑ کی نظر میں آپ کس مقام ومنزلت پر فائز تھے، اس کے بیان کی ان صفحات میں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہاں ہم یہ کوشش ضرور کرینگے کہ کس حد تک آپکی وہ اصل شخصیت نکھر کر سامنے آجائے جسے ہمارے یہاں لوگوں کی جہالت، نادانی اور سطحی فکر نے ایک افسانوی شکل دے دی ہے۔ اس طرح کی افسانوی باتیں، نہ تو اہل بیت کے شایانِ شان ہیں اور نہ ہی انکے ماننے والوں کیلئے کسی فضیلت کا باعث ہیں۔

عزاداریٔ امام حسینؑ کو ہدفِ حسینی سے دور کرنے کیلئے شروع ہی سے منظم کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے افسانے تراشے گئے ہیں۔ ان افسانوں اور کہانیوں میں سے بعض آپ کی ذاتِ گرامی سے بھی منسوب کئے گئے ہیں۔ ایسے افسانوں کا پردہ چاک کرنا ہمارے ان صفحات کا خاص موضوع ہے۔

آپ کی شخصیت سے منسوب درج ذیل چند کہانیاں زیادہ مشہور ہیں:

۱۔ امام حسینؑ کی طرف سے آپ کے نام دعوت ونصرت کیلئے بھیجے گئے خط اور اس سے مربوط قصہ۔

۲۔ امام حسینؑ کا کربلا جاتے وقت جنگی پرچموں کو تقسیم کرنا، ایک پرچم کا آپ کے آنے تک محفوظ رکھنا اور یارانِ حسینی میں پرچم کو حاصل کرنے کی خواہش کا قصہ۔

۳۔ آپ کی آمد کے موقع پر جنابِ زینب کبریٰ کی طرف سے آپ کو سلام بھیجنا اور اس کرب واضطراب کے عالم میں آپ کی آمد پر خوشی کا اظہار۔

حبیب کی شخصیت پر افسانہ سازی

کتاب "اسرار الشہادۃ" صفحہ ۱۸۹۸ اور "لوامع الانوار" میں لکھا ہے کہ ایک دن حبیب بازارِ کوفہ میں ایک عطر فروش کے پاس اپنے لئے خضاب خریدنے کی غرض سے بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں مسلم بن عوسجہ وہاں پہنچے۔ دورانِ گفتگو حبیب نے مسلم سے پوچھا: بھائی مسلم کیا بات ہے، کوفہ میں بہت ہنگامہ نظر آتا ہے؟ لوگ گھوڑے اور اسلحہ خریدنے میں مصروف نظر آتے ہیں، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ سن کر مسلم بہت روئے اور کہنے لگے حبیب! آپ کو پتہ نہیں، اہل کوفہ فرزندِ رسول کو شہید کرنے پر متفق ہوئے ہیں۔ یہ خبر سن کر حبیب بھی رونے لگے۔ انہوں نے خضاب پھینک دیا اور کہنے لگے خدا کی قسم! میں یہ خضاب نہیں لگاؤں گا۔ اب تو اپنے خون سے خضاب کروں گا۔

امام حسینؑ کا قافلہ کوفہ کی جانب رواں دواں تھا کہ اثنائے سفر میں آپ کو پتہ چلا کہ جنابِ مسلم کو شہید کر دیا گیا ہے اور اہل کوفہ نے ان سے بے وفائی کی ہے۔ اس وقت امام کے پاس بارہ (۱۲) پرچم تھے جنھیں آپ نے مختلف لوگوں میں تقسیم کیا۔ جب ان لوگوں نے امامؑ سے روانہ ہونے کیلئے درخواست کی تو آپ نے فرمایا: انتظار کرو! اس آخری پرچم دار کو آنے دو۔ اصحاب میں سے کسی نے اس پرچم کو طلب کیا تو حضرتؑ نے اسکے حق میں دعا کی اور فرمایا: اس کا مالک بعد میں آئے گا۔ اسکے بعد آپ نے ایک خط لکھا جسکا مضمون کچھ یوں تھا:

> "حسین بن علی کی طرف سے مردِ فقیہ حبیب ابن مظاہر کے نام۔ رسول اللہ ﷺ سے ہمارا کیا رشتہ ہے، اس بارے میں تم دوسروں سے بہتر جانتے ہو۔ تم اخلاقِ کریمہ کے مالک ہو، صاحبِ غیرت ہو۔ اس وقت اپنی جان کو ہمارے اوپر قربان کرنے میں بخل نہ کرنا۔ اس کی جزا تمہیں ہمارے جدِ بزرگوار دیں گے"۔

جس وقت قاصد یہ خط لے کر حبیب کے گھر پہنچا تو وہ اپنی زوجہ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ کھانے کے دوران حبیب کی زوجہ کے حلق میں لقمہ پھنس گیا تو وہ مومنہ بے ساختہ بولیں "اللہ اکبر"۔ اس کے بعد اپنے شوہر سے کہنے لگیں: حبیب! ایسا لگتا ہے ہماری طرف حسینؑ کا پیغام آنے والا ہے"۔ زن و شوہر میں ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے دق الباب کیا۔ حبیب نے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا: "میں قاصد حسینؑ ہوں" حبیب نے صدائے تکبیر بلند کی اور بولے: میری زوجہ نے سچ کہا تھا۔" قاصد سے خط کو لیا اور خفیہ طریقہ سے اسکو پڑھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قبیلہ والوں کو اس بارے میں کچھ پتہ چلے لیکن اتنے میں ان کی بنی عم آ گئے۔ انہوں نے سلام کیا اور کہا: "حبیب! ہم نے سنا ہے کہ تم امام حسینؑ کی نصرت کیلئے جانا چاہتے ہو لیکن ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دینگے۔ یہ حکومتوں کا معاملہ ہے بھلا بادشاہوں کے معاملات سے ہمارا کیا واسطہ۔ اپنے آپ کو چھپا کر رکھو" یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔ حبیب کی زوجہ نے انکی باتیں سن لی تھیں۔ اس نے حبیب سے پوچھا "کیا تم امام کی نصرت سے بخل کرتے ہو۔" حبیب نے چاہا تھا کہ معاملہ کو اس سے بھی مخفی رکھیں لیکن وہ سب کچھ جان چکی تھیں لہٰذا رونے لگیں اور روتے ہوئے بولیں کہ "سر پر مقنعہ رکھو میں نصرت حسینؑ کو جاؤں گی افسوس تم نے حسینؑ اور ان کے بھائی کے بارے میں رسول اللہؐ کا فرمان فراموش کر دیا۔ کیا تمہیں یاد نہیں آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ حسنؑ و حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔ کیا اگر رسول اللہ تم سے مدد کی درخواست کرتے تو تم قبول نہ کرتے"؟ جب حبیب نے دیکھا کہ زوجہ کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے تو بولے: "مجھے ڈر ہے کہ تم بیوہ ہو جاؤ گی" زوجہ نے جواب دیا: "میری فکر چھوڑ و نصرت حسینؑ سے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔" اپنی زوجہ کے اس جذبہ کو دیکھ کر حبیب نے بارگاہ خداوندی میں اس کے حق میں جزائے خیر کی دعا کی۔

رخصت سے قبل حبیب کی زوجہ نے حبیب سے ایک حاجت طلب کی۔ حبیب نے پوچھا بتاؤ کیا حاجت ہے کہنے لگیں: "جب تم وہاں پہنچو تو میرے مولا کو میری طرف سے سلام کہنا اور میری جانب سے حسینؑ کے ہاتھوں کو بوسہ دینا۔ حبیب نے انشاء اللہ کہا اور زوجہ سے رخصت ہوئے۔

حبیب ابن مظاہر اسدی نے اپنے غلام سے کہا کہ "گھوڑے کو فلاں جگہ لے جاؤ لیکن خیال رکھنا کسی کو پتہ نہ

چلے۔ وہاں پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔" غلام گھوڑے کو لے کر چلا گیا اور مقررہ جگہ پر پہنچ کر اپنے آقا کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر حبیب گھر والوں کو وداع کر کے اپنے باغ کی طرف چل پڑے تاکہ کسی کو انکے اصل ارادے کے بارے میں شک نہ ہو۔

جب غلام نے دیکھا کہ آقا نے آنے میں دیر کر دی ہے تو وہ گھوڑے کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "اے گھوڑے! اگر آقا نہیں آیا تو کوئی بات نہیں، میں تیرے اوپر سوار ہو کر فرزند رسولؐ کی نصرت کیلئے جاؤں گا۔" غلام کی یہ بات سن کر گھوڑا رونے لگا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ابھی غلام گھوڑے سے یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ حبیب وہاں پہنچ گئے۔ حبیب نے غلام کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا: "میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں، غلام جب اس طرح تمنا کرے تو میں کیوں نہ تجھے آزاد کروں۔ جا آج سے تو آزاد ہے۔" غلام نے عرض کی "آقا" میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا تاکہ حسین ‑ کی نصرت میں شہادت پیش کروں۔"

جب یہ دونوں کربلا پہنچے تو امامؑ کو ان کی آمد کی خبر ملی۔ دور سے غبار اٹھتے ہوئے دیکھا تو آپؑ نے فرمایا اس پرچم کا مالک آ گیا۔" حبیب قریب پہنچے، گھوڑے سے نیچے اترے، کربلا کی زمین کو بوسہ دیا، روئے اور امام اور اصحاب امام کو سلام کیا۔ جب یہ خبر حضرت زینبؑ کو ملی تو پوچھا کہ کون آیا ہے؟ کسی نے کہا "حبیب ابن مظاہر"۔ جناب زینبؑ نے حبیب کو سلام بھیجا۔ حبیب نے سنا تو اپنے چہرے پر طمانچے مارے، سر پر خاک ڈالی اور بولے: "میں کون ہوں کہ بنت علیؑ مجھے سلام کرے"۔ یہ قصہ میں "**اسرار الشہادۃ**" سے نقل کیا گیا ہے۔

یہ تمام قصہ سرے سے ہی غلط ہے ایک من گھڑت کہانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس قصہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل اشکالات سامنے آتے ہیں:

۱۔ امام حسینؑ کے لشکر میں صرف تین پرچموں کا ذکر ملتا ہے۔ دائیں طرف کی قیادت اور پرچم زہیر ابن القین کے ہاتھ میں تھا، بائیں جانب کا پرچم ابن مظاہر کے ہاتھ میں، جبکہ قلب لشکر میں پرچم حضرت عباس علمدارؑ کے پاس تھا۔ اسکے برعکس اس قصہ میں بارہ پرچموں کا ذکر ہے، جو سراسر جھوٹ ہے۔

۲۔ امام حسینؑ حالت سفر میں تھے اور آپکا کوفہ ہی کی جانب رخ تھا۔ حبیب کو خط لکھ کر ان کا کوفہ سے وہاں پہنچنے

تک انتظار کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔

۳۔ اس قصہ میں ہے کہ امام حسینؑ نے حبیب کو لکھا کہ "یہ بات تو تم سے مخفی نہیں ہے کہ میرے اور میرے بھائی کی شان میں ہمارے جد بزرگوار نے کیا فرمایا ہے۔" حبیب کی شخصیت ایسی تو نہ تھی کہ جنہیں اس حدیث سے متعلق یاددہانی کرنے کی ضرورت ہو۔

۴۔ اس قصہ میں ہے کہ حبیب اس بات سے بے خبر تھے کہ اہل کوفہ نے امام کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ حبیب اسی کوفہ میں رہتے تھے' امامؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دینے والے گروہ کے سرگرم ترین کارکن تھے۔ حبیب کی شہر کوفہ کے حالات سے بے خبری بالکل بے معنی سی بات ہے۔

۵۔ کوفہ میں جنگی سازوسامان کی خرید وفروخت اور گرما گرمی کے حالات سے حبیب کیونکر ناآشنا تھے اور مسلم بن عوسجہ اس سے کیونکر باخبر تھے جبکہ دونوں بزرگ اسی شہر کے رہنے والے تھے۔

۶۔ حبیب ابن مظاہر ان شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے سب سے پہلے امام علیہ السلام کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ اس بات کا کیا جواز ہے کہ ایسے شخص کو دوبارہ امام دعوت نصرت دیں؟

۷۔ حکومت وقت نے کوفہ میں انتہائی سخت گیری کا رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ ان حالات میں حبیب جیسی شخصیت اس وقت تک کیسے آزادی سے گھوم پھر رہی تھی؟

۸۔ اگر اس مفروضہ کو صحیح مان لیا جائے کہ حلق میں لقمہ پھنسنا' اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ کوئی پیغام آنے والا ہے' تب بھی حبیب کی زوجہ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ امام حسینؑ ہی کا پیغام آنے والا ہے؟

۹۔ حبیب نصرت حسینؑ کے لئے نکلنے والے ہیں' اس بات کا انکے قبیلہ والوں کو اتنی جلدی کیسے پتہ چل گیا؟

۱۰۔ کسی مقتل میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ حبیب کے ساتھ انکا غلام بھی کربلا میں شریک تھا۔

۱۱۔ ایک ایسی زوجہ جو پہلے سے اس حد تک امام حسینؑ کی فدائی ہو' اس سے اس مسئلہ کو چھپانے کی کوشش کیوں؟

۱۲۔ حبیب نے کربلا پہنچ کر گھوڑے سے اترنے کے بعد زمین کو بوسہ کیوں دیا؟ کوئی اسلامی ثقافت تو نہیں ہے' نہ ہی تشیع کے آداب میں ایسی کوئی روایت ہے بلکہ ایسی حرکتوں کا تعلق تو بادشاہوں کے دربار سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ تاریخ میں صرف دو سفیروں کا ذکر ملتا ہے جو امام علیہ السلام کا خط لیکر گئے تھے اور جنہیں گرفتار کر کے شہید کردیا گیا۔ جو قاصد حبیب ابن مظاہر کی طرف گیا وہ کون تھا' اس کا انجام کیا ہوا؟ تاریخ میں اسکا کوئی ذکر نہیں۔

اس تجزیہ کے بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ قصہ شروع سے لیکر آخر تک ایک فرضی کہانی ہے اور اسے افسانہ سازی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

قاسم بن حبیب کی کوفہ میں جنگ

جب اسیران آل محمدؐ کا قافلہ کوفہ میں داخل ہوا تو انکے ساتھ شہداء کے سر بھی نیزوں پر بلند تھے۔ ان سروں میں حبیب کا سر بھی تھا۔ اس موقعہ پر ایک اور کہانی یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حبیب کے بیٹے قاسم نے باپ کا سر دیکھا تو اس منظر کو برداشت نہ کرسکا۔ تلوار نیام سے نکالی اور اس شخص پر جھپٹ پڑا جو اس کے باپ کا سر لے کر چل رہا تھا۔

یہ بھی افسانہ سازی ہے۔ ایک چھوٹے سے واقعہ کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کر کیا گیا ہے۔

اصل واقعہ جیسا کہ کتاب "**مقاتل**" اور "**قاموس الرجال**" وغیرہ میں لکھا ہے' یہ ہے کہ جب سرہائے شہدائے کربلا با دارالامارہ کی طرف لے جائے جارہے تھے تو فرزند حبیب اپنے باپ کے سر کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جس شخص کے ہاتھ میں حبیب کا سر تھا اس نے پوچھا: "تم پیچھے کیوں آتے ہو؟ اس نے جواب دیا: یہ میرے بابا کا سر ہے' اسے مجھے دے دو' میں اسکو دفناؤں گا" لیکن اس نے انکار کردیا۔ کہنے لگا: "میں نہیں دوں گا' میں اسے عبیداللہ ابن زیاد کو پیش کر کے اس سے انعام وصول کروں گا۔" فرزند حبیب نے کہا: "تمہیں اس سے انعام نہیں ملے گا بلکہ خدا تمہیں بُرا اجر دے گا کیونکہ تم نے اپنے سے بہتر انسان کو قتل کیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ روئے کیونکہ انکے پاس اس وقت اس سے زیادہ قدرت نہیں تھی۔ لیکن حبیب کے اس بیٹے نے باپ کے قاتل کا پیچھا نہیں چھوڑا' یہاں تک کہ دور مصعب بن زبیر میں اس کے لشکر میں شامل ہو کر اسے قتل کیا۔

یہ کہنا کہ کوفہ کے بازار میں حبیب کے بیٹے نے تلوار اٹھائی' خلاف حقیقت ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل

نکات قابل غور ہیں:

۱۔ عبیداللہ ابن زیاد نے کوفہ میں اسلحہ لیکر چلنے پر سختی سے پابندی عائد کی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اسلحہ لیکر کھلے عام چلے کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ وہ شیعہ جو کربلا نہیں گئے ہیں' کہیں گڑبڑ نہ کر بیٹھیں۔

۲۔ کثیر تعداد میں مسلح افراد کو بازاروں اور چوراہوں پر متعین کیا گیا تھا تا کہ کسی بھی مزاحمت و مخالفت کی صورت میں معاملات کو قابو میں رکھا جا سکے۔

۳۔ حبیب کا بیٹا اس وقت کم عمر اور چھوٹا تھا لہٰذا اصل واقعہ کو جس طرح توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے' وہ صرف اسی کوشش کی ایک کڑی ہے کہ عزاداران امام حسینؑ کی نظروں کو حقائق سے ہٹا کر افسانوں کی طرف لگا دیا جائے۔

تقسیم پرچم

مجالس کی آرائش و زیبائش کی خاطر بعض نادان ذاکرین و خطباء قصہ کہانیاں گھڑتے ہیں اور پھر انہیں خوب بنا سجا کر سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انہی قصوں میں سے ایک قصہ تقسیم پرچم ہے جسے معرکہ حق و باطل میں لشکر حسینی کے پرچم دار' حبیب ابن مظاہرؓ کی ذات والا صفات سے منسوب کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ امام حسینؑ نے کربلا جاتے ہوئے ایک منزل پر لوگوں میں پرچم تقسیم کئے لیکن ایک پرچم کو محفوظ کر لیا اور اسے کسی کو نہیں دیا۔ بعض اصحاب و یاران امام حسینؑ کے دل میں اس پرچم کو حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان لوگوں نے اپنی خواہش کو سوال کی شکل میں امام کے سامنے پیش کرتے ہوئے عرض کیا: ''مولا یہ پرچم کس کے لئے رکھ چھوڑا ہے؟ اسے بھی کسی کو دے دیجئے۔'' امام نے فرمایا: ''اس کا پرچم دار ابھی نہیں پہنچا ہے لیکن آنے ہی والا ہے۔ اس کے آنے تک اس پرچم کو محفوظ رکھنا ہے۔''

یہ قصہ بھی کئی اعتبار سے جعلی ہے:

۱۔ جن کتب میں امام حسینؑ کے مدینے سے کربلا تک کے سفر کے واقعات درج ہیں' ان میں کہیں بھی پرچم کی تقسیم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۲۔ جس شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے لشکر کے چیندہ جانبازوں میں پرچم تقسیم کئے' اس نے بھی اس منزل کا ذکر نہیں کیا ہے کہ جہاں یہ عمل انجام دیا گیا۔

۳۔ خود حبیب کس منزل پر امام حسینؑ سے آ کر ملے' اس کا ذکر بھی کہیں نہیں ملتا ہے۔

۴۔ امام حسینؑ کے ساتھ آنے والوں میں سے بعض راستے ہی میں امام کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اسکے بعد جو باقی بچے تھے' وہ تو وہ جان نثار تھے جو شہادت تک حسینؑ کے ساتھ رہے۔ وہ امام حسینؑ کی اطاعت میں رہنے ہی کو شرافت و فضیلت سمجھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی قسم کی طمع و لالچ نہیں رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض پیغمبر ﷺ کے ساتھ مختلف جنگوں میں شریک رہ چکے تھے۔ یہ لوگ ان بعض افراد کی مانند بھی نہیں تھے جو اپنے دلوں میں حصول پرچم کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ تو صرف اپنے آپ کو حسینؑ پر قربان کرنے ہی کو سب سے افضل جانتے تھے اور اسی کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ پرچم اٹھانا انکی نظر میں کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

۵۔ حامل پرچم ہونے کی خواہش وہاں ہوتی ہے جہاں فتح و نصرت اور کامیابی کے ساتھ واپسی کی امید ہوتی ہے تا کہ یہ بات دوسروں کے سامنے باعث افتخار بنے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اسکے برعکس ہے۔ نہ صرف یہ کہ واپسی کی کوئی امید نہیں بلکہ یہاں موجود ہر شخص تمام تر شعور و آگاہی کے ساتھ اپنے آپ کو راہ حق میں فدا کرنے کی خاطر تیار کھڑا ہے۔ ایسا شخص کسی بھی دنیوی افتخار و اعزاز کو خاطر میں نہیں لاتا۔

۶۔ اگر کوئی بہت بڑا لشکر ہو' جس میں قبائل کی تعداد زیادہ ہو' وہاں پرچموں کے تقسیم کی نوبت آتی ہے۔ جبکہ امام حسینؑ کا لشکر قلیل تعداد میں تھا۔ جنگ کے بعد زندہ بچ رہنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ان حالات میں تقسیم پرچم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کربلا کے میدان میں حسینی لشکر میں صرف تین پرچموں کا ذکر ملتا ہے وہ بھی صبح عاشورا تقسیم ہوئے۔ ایک پرچم حضرت عباسؑ کے پاس تھا دوسرا زہیر ابن قین کے پاس اور تیسرا حبیب کے پاس تھا۔

جناب زینب سلام = کا حبیب کو سلام بھیجنا

لکھنے والے نے لکھا ہے کہ جب حبیب کربلا پہنچے تو امام حسین نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ جاؤ حبیب کا استقبال کرو۔ یہ دھوم دھام دیکھ کر زینب کبریٰ نے اسکی علت پوچھی تو کسی نے کہا کہ حبیب ابن مظاہر آپ کے بھائی کی نصرت کیلئے پہنچے ہیں۔ یہ سن کر جناب زینب نے خوش ہو کر کسی کے ذریعہ ان کو سلام بھیجا۔ جب حبیب کو سلام پہنچا تو ان پر اسقدر گراں گزرا کہ عمامہ کو نیچے گرا دیا' اپنا سر پیٹا اور سر پر خاک ڈالنے لگے۔

یہ قصہ بھی من گھڑت ہے جس کی دلیل خود اسکے اندر موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) حیات امام حسینؑ میں جناب زینب کے اس حد تک مضطرب' بے ساختہ اور بے قابو ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی' نہ کربلا پہنچنے سے پہلے اور نہ اسکے بعد سوائے شب عاشور اور وقت وداع امام حسینؑ کے' بس یہ دو مواقع ایسے تھے کہ جب آپ نے بے ساختہ رنج و ملال کا اظہار فرمایا۔

(۲) زینب =کو کسی بھی ناصر و یاور سے اتنی توقع نہیں تھی کہ اس کے آ جانے سے امام حسینؑ کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔

(۳) نہ تو زمانۂ حیات پیغمبر ﷺ میں' نہ کسی جنگ کے دوران اور نہ ہی امیر المومنین -کے دورِ مظلومیت میں' آپ سے منسوب ایک جملہ بھی ایسا ملتا ہے کہ آپ نے بے ساختگی میں کسی کو سلام بھیجا ہو۔

(۴) لکھتے ہیں کہ جب حبیب نے جناب زینبؑ کا سلام سنا تو سر سے عمامہ گرا دیا' اپنے سر کو پیٹا اور اس پر خاک ڈالی۔ آیا سر سے عمامہ گرانا اور سر پر خاک ڈالنا اصحاب حسینؑ کی ثقافت تھی یا یہ ہماری علاقائی اور خاندانی ثقافت ہے؟

(۵) کیا حبیب کو امام حسینؑ کی مظلومیت اور بے بسی کا اس وقت پتہ چلا جب ان کو سلام بھیجا گیا؟ کیا وہ اچانک اور اتفاقی طور پر وہاں پہنچے تھے یا وہ اہل بیت کی مظلومیت کو سمجھتے ہوئے' ایک طویل عرصہ تک جدو جہد کرنے کے بعد خطرناک ترین اور ہولناک ترین راستوں سے ہوتے ہوئے' اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر نصرت حسینؑ کی خاطر وہاں پہنچے تھے؟

۳۔ مسلم بن عوسجہ۔ عمارِ حسینؑ

جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی رکاب میں شہادت سے سرفراز ہونے والوں میں ایک برجستہ شخصیت' صحابیٔ بزرگ حضرت عمار یاسر ÷ کی تھی۔ آپ کے ماں باپ اسلام کے صف اول کے شہداء تھے پیغمبر اکرمؐ نے عمار یاسرؓ کے لئے فرمایا تھا کہ ان کا وجود ایمان سے پُر ہے اور انہیں باغیوں کا ایک گروہ قتل کرے گا۔ چنانچہ جب عمار یاسر ÷ کی شہادت کے بعد لشکر معاویہ کے باطل ہونے اور علیؑ کے حق ہونے سے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوئے تو عمار یاسر ÷ کے علیؑ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے علیؑ کی حقانیت کا رجحان زیادہ ہی پایا جاتا تھا۔ اسی طرح میدانِ کربلا میں بھی ایک ایسی شخصیت موجود تھی جن کی شہادت دشمن کیلئے کلنک کا ٹیکا ثابت ہوئی اور وہ اپنے اس عمل سے پشیمان ہو کر انگشت بدنداں ہو گئے۔ یہ برجستہ شخصیت جناب مسلم بن عوسجہ ÷ کی تھی۔

جب مسلم بن عوسجہ ÷ کی شہادت کی خبر لشکر عمر سعد کے پیادہ فوج کے سربراہ شبث بن ربعی کو دی گئی تو اس نے کہا "تمہاری مائیں تمہاری مصیبت میں روئیں' تم لوگوں نے اپنے ہاتھوں خود اپنا قتل کیا ہے۔ مسلم بن عوسجہ کو شہید کر کے تم لوگ خوشی مناتے ہو؟ مسلم ÷ بلند کردار کے حامل تھے اور اسلامی جنگوں میں پیش پیش ہوتے تھے۔"

مسلم بن عوسجہ بن سعد بن ثعلبیہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ' ان شخصیاتِ برجستہ میں سے ہیں جو ظلم و جور کے خلاف ابتداء ہی سے نبرد آزما تھے اور اس کے خاتمہ کیلئے بے چین و بیقرار رہتے تھے۔ عدل و انصاف اور حکومت حق' نیز قیام حق کے خواہاں تھے۔ جب معاویہ مرا تو آپ نے فرمایا کہ ظلم کا ستون گر گیا۔ معاویہ کے بعد امام حسینؑ کو امامت و رہبری کیلئے دعوت دینے والوں میں آپ ÷ کا نام بہت معروف ہے۔

حضرت مسلم بن عقیلؓ کے کوفہ آنے کے بعد آپ ÷ ان کی رکاب میں رہے۔ بڑھاپے کے باوجود بہت سی ذمہ داریوں کو اپنے نازک کندھوں پر اٹھایا۔ قیام علیہ باطل کیلئے خمس و حقوق کو لوگوں سے جمع کرنا اور اس سے اسلحہ خریدنا اور مختلف لوگوں کو حسینؑ کے نمائندے مسلم تک پہنچا کر ان کے ہاتھوں بیعت کروانا' آپ کی ذمہ داریوں میں سے تھے۔

اعلائے کلمۂ حق کیلئے دشمنوں کے خطرے کی پروا کئے بغیر' امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچنے والی شخصیات میں سے

ایک آپ ہیں۔ مسلم کی شہادت کے بعد ابن زیاد نے حسینؑ کو بلانے والوں اور بنوامیہ کے خلاف قیام کرنے والوں کے خون کو ہدر قرار دے دیا تھا۔تمام سرحدوں کی سخت نگرانی شروع ہوگئی تھی۔لیکن ان تمام سختیوں کے باوجود بعض مقاتل کے تحت آپ کوفہ سے اپنے اہل وعیال کو لیکر امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شبِ عاشور جب امام حسینؑ نے تمام اصحاب ویاران کو جمع کر کے فرمایا: ''تم سب مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ''۔ تو مسلم بن عوسجہ نے کہا: ''ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر جائیں گے تو خدا کے حضور کیا عذر پیش کریں گے مولا! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں اپنا نیزہ دشمنوں کے سینوں پر ماروں گا' جب تک میرا بازو سالم ہے اپنی تلوار سے جنگ کروں گا' اگر تلوار نہ ملی تو پتھر سے جنگ کروں گا لیکن آپ سے جدا نہیں ہونگا''۔

جناب مسلم بن عوسجہ ÷ نے امام حسینؑ کی رکاب میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ آپ ÷ کی شہادت پر خیمہ سے ایک خاتون ''وامسلماہ'' کہتی ہوئی نکلیں جو آپ کی زوجہ تھیں۔امام حسینؑ جب آپ کے سرہانے پر پہنچے تو آپ سکراتِ موت کے تلخ لمحات سے گزر رہے تھے۔امامؑ نے فرمایا: ''خدا تم پر رحم کرے'' اور اس کے بعد آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿فمنهم من قضىٰ نحبه و منهم من ينتظر و ما بدلوا تبديلا﴾ ''(مومنینؑ) میں سے بعض اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں......''[1]

اس وقت امامؑ کے ساتھ آپ کے دوست حبیب بن مظاہر بھی تھے۔حبیب نے مسلم بن عوسجہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے مسلم! میرے لئے تمہاری شہادت بہت گراں گزری' تمہیں جنت کی بشارت ہو''۔ مسلم بن عوسجہ نے نحیف آواز میں جواب دیا ''یہ بشارت آپ کو بھی ملے گی''۔ حبیبؓ نے مسلم بن عوسجہؓ سے فرمایا: ''میں اگر یہ نہ جانتا ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد تم سے ملنے والا ہوں' تمہارے پیچھے آنے والا ہوں تو میرا دل چاہتا کہ میں تم سے کچھ وصیت سنوں اور اس پر عمل کروں۔اس پر مسلم بن عوسجہ نے اشاروں میں فرمایا کہ ''امام حسینؑ کی معیت میں آپ بھی شہید ہو جایئے' یہی میری وصیت ہے''۔

---

[1] [احزاب/۲۳]

۴۔ قیس بن مسہر صیداوی۔ فرشتۂ بین امام وامت

جس طرح خداوند متعال نے خلائق تک اپنا پیغام پہنچانے کیلئے خاص بندوبست فرمایا اور ایک مخلوق پیدا کی جنہیں ملائکہ کہا جاتا ہے' اسی طرح قائدین اور امت کے درمیان رابطہ رکھنے کیلئے بھی ایک پیغام رساں کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن ہر کوئی اس منصب کا لائق اور سزاوار نہیں ہوتا۔مسئلہ کی نوعیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔خصوصاً اگر حاکم مقتدر نے ایسے حالات پیدا کئے ہوئے ہوں جس میں اس کے خلاف پیغام رسانی مشکل ہو جاتی ہو' تو پھر تو یہ کام ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی ہے۔

اُدھر حکومت عدل وامامت کے پیاسے اہل کوفہ بھی اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کی شکایت اور عدالت کی درخواست اپنے امام وقت' نواسۂ رسولؐ حسینؑ بن علیؑ تک پہنچانا چاہتے تھے۔اس سلسلے میں جن شخصیات کو منتخب کیا گیا ان سب کا بیان تو ہمارے لئے ممکن نہیں لیکن جس شخصیت نے سب سے زیادہ اس سلسلے میں کردار ادا کیا' اس کا تعلق بھی قبیلۂ بنواسد سے تھا۔وہ شخصیت قیس بن مسہر بن خالد بن جندب بن منقذ بن عمرو ابن قعین بن حرث بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ اسدی صیداوی ہیں۔

قیس ÷ وہ جوان تھا جو عشق وولائے امامت سے سرشار تھا۔ایسا جوان جس پر جنون عشق امامت طاری تھا' جو محبت حسینؑ میں ہمہ وقت محو رہتا تھا۔

قیس بن مسہر صیداویؓ پہلے اہل کوفہ بالخصوص مسلم ابن عوسجہ اور حبیب ابن مظاہر جیسے باوفا صحابیوں کی طرف سے دعوت نامہ لیکر ماہ مبارک رمضان کے ابتدائی دنوں میں سرزمین مکہ پہنچے اور امام حسینؑ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔پھر مکہ سے اپنے امامؑ کی اطاعت میں عراق وحجاز کے دشت وبیابان کو طے کر کے پندرہ رمضان کو نمائندۂ امام' جناب مسلم کی خدمت میں کوفہ پہنچے۔اسکے بعد کوفہ سے مسلم بن عقیلؑ کا' اہل کوفہ کے بارے میں تائیدی خط لیکر دوبارہ امامؑ کی خدمت میں مکہ آئے۔وہاں سے اپنے امام کی معیت میں کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔جب قافلہ مقام حاجر پر پہنچا تو یہ جواں عزم فرشتہ مسلم کے نام امام حسینؑ کا ایک خط اور دوستداران اہل بیتؑ کے نام امام کی آمد کی خوشخبری لیکر دوبارہ کوفہ روانہ ہوگیا۔راستے میں پیش آنے والے خطرات اور

حکومتِ وقت کے وحشی پالتو درندوں کی پرا کئے بغیر، قیسؓ کوفہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب عزم و وفا کا یہ پیکر قادسیہ پہنچا تو وہاں عبیداللہ بن زیاد کے درندوں نے اس حسینی فرشتہ کو اپنے شکاری جال میں پھنسا لیا۔ جال میں پھنستے ہی قیس نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا تا کہ لشکر کو پتہ نہ چلے۔ آپ کو عبیداللہ بن زیاد کے پاس بھیجا گیا۔ عبیداللہ بن زیاد نے پوچھا "تم کون ہو؟" قیس نے یہاں جھوٹ نہیں بولا اور نہ تقیہ کیا بلکہ پلٹ کر کہا "میں امیر المومنین حسینؑ ابن علیؑ کا شیعہ ہوں"۔ آپ اندازہ کیجئے کہ یہ بات عبیداللہ پر کتنی گراں گزری ہوگی اس کے بعد اس ملعون نے پوچھا کہ "خط کو کیوں پھاڑا؟" قیس نے جواب دیا تا کہ اسکے مندرجات کا تم کو پتہ نہ چلے۔" پھر عبیداللہ نے پوچھا "خط کس کی طرف سے اور کس کے نام تھا؟ جواب دیا حسینؑ کی طرف سے اہل کوفہ کے نام تھا۔" جھنجلا کے پھر پوچھا "کن کے نام تھا؟" فرمایا "یہ میں نہیں جانتا" ابن زیاد کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ کہنے لگا "خط جن کے نام تھا ان کے نام بتاؤ، ورنہ تمہیں قتل کردوں گا۔" جواب دیا: "میں ان کے نام نہیں جانتا۔" عبیداللہ بولا "اگر نام نہیں جانتے تو منبر پر جاؤ اور حسینؑ بن علیؑ پر سبّ کرو۔" عبیداللہ سمجھ رہا تھا کہ یہ شخص کوفی ہے، کوفہ والوں کیلئے رنگ و نیت بدلنا کوئی مسئلہ نہیں، وہ موت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اس کوفی کے رگ و پے میں عشق و ولائے امام رچی بسی ہوئی ہے۔

قیس ؓ منبر پر گئے اور حمد و ثنائے خدا بجا لائے، پیغمبرِ اسلام اور آلِ پیغمبرؐ پر درود بھیجا، علیؑ و حسینؑ کے حق میں دعا کی، بنو امیہ پر لعنت بھیجی اور اس کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر بولے: "میں حسینؑ کا پیغام لایا ہوں، میں حسینؑ کو حاجر پر چھوڑ کر آیا ہوں۔ تم ان سے ملو گے؟" یہ کہنا تھا کہ عبیداللہ کے جلادوں نے آپؓ کو پکڑ لیا اور پھر دارالامارہ کی چھت سے نیچے گرا کر شہید کر دیا۔ آپ کا جسد قطعہ قطعہ ہو گیا۔ جب امام حسینؑ کو یہ خبر ملی تو آپؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپؑ فرمایا: "خدا ہمارے شیعوں کی منزلت بلند کرے اور جنت میں جگہ عنایت فرمائے"۔

۵۔ عمرو بن خالد صیداوی

کتاب "فرسان الہیجاء" رجال نمبر ۱۴۵ میں اور عسقلانی نے اپنی کتاب "الاصابہ فی تمیز الصحابہ" میں لکھا ہے

کہ عمرو ابن خالد بن حکیم بن حزام صیداوی کی نسل اسد بن خزیمہ عدنانیہ پر منتہی ہوتی ہے۔

مامقانی نے "ابو مخنف" سے نقل کیا ہے کہ عمرو ابن خالد ایک شریف النفس انسان تھے۔ اہل بیتؑ سے ولایت رکھتے تھے۔ جب مسلم کوفہ تشریف لائے تو انہوں نے جناب مسلم کا ساتھ دیا۔ جب مسلم شہید ہوئے تو عمرو بن خالد نے اپنے آپ کو چھپا کر رکھا۔ جب فرشتہ حسینؑ قیس بن مسہر صیداویؓ نے دارالامارہ کے منبر سے پیغام حسینی کو پہنچایا اور بتلایا کہ وہ امام حسینؑ کو منزل حاجر پر چھوڑ کر آئے ہیں تو یہ نصرتِ امام کیلئے کوفہ سے نکلے۔ یہ آلِ اسد کے پانچویں شخص ہیں جنہوں نے امامؑ کی نصرت کی۔

امامؑ کا استقبال

اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو کثیر خطوط اور نمائندوں کے ذریعے قیادت و رہبری کیلئے بلایا۔ آپؑ نے ان سب کے جواب میں حضرت مسلمؑ کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا۔ جناب مسلمؑ کی طرف سے تائیدنامہ موصول ہونے کے بعد امام حسینؑ کوفہ کی طرف نکلے۔ منزل حاجر پر پہنچ کر آپ نے قیس بن مسہر صیداوی کو ایک پیغام دے کر کوفہ روانہ کیا۔ اس خط میں آپ نے کوفہ والوں کو اپنی آمد کی خبر دی تھی۔ ساتھ ہی یہ تاکید کی تھی کہ آپ کے پہنچنے تک اس معاملہ کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ لیکن یہ فرشتہ حسینؑ کوفہ کے نزدیک قادسیہ کے مقام پر دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ دشمن نے ان سے کہا کہ منبر پر جا کے امامؑ پر سب کرو۔ لیکن آپ نے سبّ کرنے کے بجائے اہل بیت علیہم السلام پر درود و سلام بھیجا اور اپنی جان کی قیمت پر یہ پیغام پہنچا دیا کہ لوگو حسینؑ تمہاری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔“

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ خبر سننے کے بعد تمام اہل کوفہ اپنے امام کا استقبال کرنے کے لئے کوفہ سے باہر نکل آتے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ معاملہ بالکل اسکے برعکس ہوا۔ وہ لوگ جو آپ کی آمد کے منتظر تھے‘ اپنے ہاتھوں میں تیر‘ تلوار اور نیزے لیکر امامؑ کے مقابلے میں نکل کھڑے ہوئے۔ بے وفائی کے اس عالم میں بھی کوفہ اہل وفا اور مردان حق سے بالکل خالی نہیں تھا۔ انہی مردان باصفا میں ایک نام عمرو ابن خالد صیداوی کا ہے‘ جو اپنے آزاد کردہ غلاموں مجمع بن عبداللہ عائذی‘ جنادۃ بن حرث سلمانی اور نافع بن ہلال بجلی کو ساتھ لیکر امام وقت کے استقبال کیلئے نکل پڑے۔ راستے کی رہنمائی کیلئے آپ نے طرماح بن عدی کو ساتھ لیا۔

امام حسینؑ کا راستہ روکنے اور آپ کے دوستداروں کو گرفتار کرنے پر مامور سپاہیوں کی نظروں سے بچتے بچاتے اور ظلم و ستم کی تاریک راتوں سے گزر کر یہ استقبال کمیٹی مقام اذیب الہجانات پر امام حسینؑ کے استقبال

کیلئے پہنچ گئی۔ امام حسینؑ اس وقت حُر کے محاصرے میں تھے۔ جب حُر نے استقبال کیلئے ان آنے والوں کو دیکھا تو انہیں روکنے کی کوشش کی۔ امام حسینؑ نے حُر سے فرمایا: ”اگر تم نے ان کو روکنے کی کوشش کی‘ تو میں ان کا دفاع اپنے نفس کی طرح کروں گا۔ یہ میرے انصار و اعوان ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ معاہدہ ہے کہ جب تک عبیداللہ زیاد کی طرف سے نیا حکم نہیں آتا ہم ایک دوسرے سے تعرض نہیں کرینگے۔“ اس گفتگو کے بعد حُر نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور یہ استقبال کنندگان کاروان حسینی میں شامل ہو گئے۔

امام حسینؑ نے جب ان سے اہل کوفہ کے متعلق دریافت فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ ”رؤسائے شہر کو بڑی بڑی رشوتیں دے کر ان کی مرضی کو خرید لیا گیا ہے۔ یہ سب آپ کے خلاف جمع ہو گئے ہیں۔ دراصل انہوں نے کبھی بھی آپ کو خلوص دل سے دعوت نہیں دی تھی بلکہ اپنی دنیا بنانے کیلئے آپ کو بلایا تھا۔ جہاں تک مستضعفین کا تعلق ہے ان کے دل ابھی تک آپ کے ساتھ ہیں لیکن وقت پڑنے پر یہ لوگ بھی انہی سے جا ملیں گے۔ حکومت نے لوگوں کے ضمیر خرید کر حالات کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اس طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔“

جب امام حسینؑ نے قیس بن مسہر صیداوی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ حکومتی عمال نے انہیں گرفتار کر کے آپ پر اور آپؑ کے بابا پر سبّ کرنے کے لئے کہا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہل بیتؑ پر درود و سلام بھیجا اور آپؑ کی آمد کی خبر دی۔ اس حق گوئی کی پاداش میں دشمن نے انہیں دارالامارہ کی چھت سے نیچے گرا کر شہید کر دیا۔ یہ سن کر امامؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپؑ نے قیس کے حق میں دعا فرمائی۔

طرماح بن عدی نے امام حسینؑ کو مشورہ دیا کہ ”فی الحال آپ ہمارے ساتھ اس پہاڑ کے پیچھے چلیں‘ کیونکہ اس وقت ہر جگہ پر بنوامیہ کا قبضہ ہے۔ ہم وہاں آپ کو محفوظ جگہ پر رکھیں گے اور اسی دوران بنو طے سے بیس ہزار کا لشکر آپؑ کیلئے تیار کریں گے۔“ لیکن امامؑ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے فرمایا: ”میرے اور اس قوم (اہل کوفہ) کے درمیان عہد و پیمان ہوا ہے۔ مجھے اپنا وعدہ وفا کرنا ہے۔“

جریر طبری نے لکھا ہے کہ عمرو ابن خالد صیداوی روز عاشورا کربلا میں شہید ہوئے۔

اصحابِ عوائل

اصحابِ عوائل سے ہماری مراد وہ ناصران اور جانثاران وجانفشانِ آقا ابا عبداللہ الحسینؑ ہیں جو تمام مشکلات اور خطرات کی طرف سے بے پرواہو کر، تنہا نہیں بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے کر نصرتِ امام کیلئے نکلے۔

آیات قرآنی اور عقل کے تحت جہاں انسان وسعت وقدرت نہ رکھتا ہو وہاں تکلیف ساقط ہوتی ہے۔ خداوند عالم سورۃ الانعام آیت ۱۵۲ میں فرماتا ہے:

﴿لانکلف نفساً الا وسعھا﴾ "ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے، مگر اسکی طاقت کے مطابق۔"

اسکے علاوہ سورۃ اعراف آیت ۴۲، سورۃ مومنون آیت ۶۲، سورۃ بقرہ آیات ۲۳۳، ۲۸۶ میں بھی کسی فرد میں وسعت نہ ہونے کی صورت میں تکلیف ساقط ہونے کا ذکر آیا ہے۔ جہاں قدرت ہو لیکن وسعت اور گنجائش نہ ہو وہاں بھی شریعت نے انسانوں کو تکلیف سے معذور رکھا ہے۔ چنانچہ جنگ تبوک کے لئے ایک طویل مسافت طے کرکے جانا تھا۔ مسلمانوں میں سے بہت سے لوگوں کے پاس نہ سواری تھی اور نہ کرایہ پر سواری حاصل کرنے کیلئے مال لہٰذا بہت سے مسلمان اس جہاد میں شرکت نہ کرسکے اور چشم گریاں کے ساتھ، افسردگی کے عالم میں مجاہدین کو رخصت کرکے واپس آگئے۔ خداوند عالم نے آیت نازل کی اور سورۃ توبہ آیت ۹۸ میں ان کیلئے اپنے گھروں میں رہنے کو مباح قرار دیا۔ اسی سفر میں جب ابوذر غفاریؓ کی سواری نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا تو وہ پیغمبر اسلامؐ سے پیچھے رہ گئے۔ لوگوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ ابوذر بھی نہیں آئے تو آپؐ نے فرمایا:

ان کو چھوڑو اگر ان میں کوئی خیر ہے تو وہ خود آئیں گے، ورنہ نہیں!"

ابوذر نے کوشش کی کہ جلد از جلد لشکریوں سے جاملیں لیکن سواری نے ساتھ نہیں دیا۔ اس وقت ابوذر کے

پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ واپس آکر باقی لوگوں کے ساتھ مدینہ میں رہیں لیکن ابوذر اس راستہ کے انتخاب کو اپنے لئے موت سے زیادہ گراں سمجھتے تھے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ کسی طرح پیغمبر اکرمؐ سے جاملیں۔ آخر آپ نے فیصلہ کیا کہ پیغمبر کے پاس ہی جانا ہے۔ سواری سے سامان کو اتارا اور اپنی پشت پر لاد کر، بھوکے پیاسے پیغمبر اسلامؐ کے پیچھے پیدل چلنا شروع کردیا۔ راستہ میں ایک جگہ پر رک گئے۔ وہاں پر ایک پتھر پر پانی دیکھا۔ پیاسے تھے، پانی کے پاس گئے، دیکھا میٹھا پانی ہے۔ لیکن خیال آیا کہ شاید آقا نبی اکرمؐ پیاسے گزرے ہوں گے، اس لئے پانی نہیں پیا۔ تبوک پہنچنے سے پہلے پیغمبر گرامیؐ ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے تھے۔ وہاں پر لوگوں نے دیکھا کہ دور سے ایک آدمی آرہا ہے۔ انہوں نے پیغمبر گرامیؐ قدر سے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! یہ آدمی تنہا سفر کررہا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "شاید یہ ابوذر ہیں جو اپنے پیغمبر کی محبت میں تنہا آرہے ہیں۔[1]

ابوذر سواری نہ ہونے کے سبب معذور تھے، اگر نہ جاتے تو ان کے لئے کوئی عتاب نہیں تھا۔

امام حسینؑ نے بھی اپنے قیام کے دوران بعض شخصیات کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ بعض کے پاس سواری تھی لیکن اس کے باوجود مختلف بہانوں کے ذریعہ ساتھ چلنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ بعض کو جب امام نے دعوت دی تو انہوں نے اپنے اہل وعیال کے لئے خطرات لاحق ہونے کی وجہ سے معذرت خواہی کی۔ ابن زیاد نے کوفہ کی سرحدوں پر سخت ناکہ بندی کا اہتمام کیا ہوا تھا، جس کے بعد کوفہ میں داخل ہونا اور وہاں سے باہر نکلنا سخت مشکل کام تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس بات کو جواز بنا کر امام حسینؑ کی نصرت کرنے میں کوتاہی کی، امام حسینؑ اور آپ کے اہل بیت کو بنوامیہ کے درندوں کے شکار کے لئے تنہا چھوڑ دیا اور خود کو اور اپنے اہل بیت کو بچالیا۔

اس کے برخلاف بعض لوگ ایسے تھے جو اپنے اہل وعیال کو مشیت الٰہی کے رحم وکرم پر چھوڑ کر، تنہا امام کی نصرت کے لئے نکلے۔ لیکن کچھ ایسی ہستیاں بھی موجود تھیں جنہوں نے تنہا خود کو امام حسینؑ کی نصرت کے لئے آمادہ نہیں کیا بلکہ ان کے اہل بیت نے بھی اپنے مردوں کے سامنے جذبہ قربانی اور رجز اتمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولا کی خدمت میں ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایسی شخصیات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

---

[1] [نقل از کتاب ابوذر غفاری تالیف عبدالحمید حسن حارثی ص۸۳]

ا۔ مسلم ابن عوسجہ اسدی:

جب آپ کربلا کی زمین پر گرے تو خیمہ سے آپ کی زوجہ ''واسیداہ'' ''وامصیبتاہ'' کہتی ہوئی پہنچیں۔ مسلم بن عوسجہ کے حالات ہم نے آل اسدی میں ذکر کیے ہیں۔

۲۔ عبداللہ بن عمیر کلبی:

جس وقت عبداللہ نے کہا کہ میں حسینؑ کی نصرت کے لئے جا رہا ہوں تو ان کی زوجہ نے کہا: ''بہت اچھا فیصلہ کیا ہے خدا تم پر رحمت کرے مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلو۔'' چنانچہ عبداللہ رات کی تاریکی میں اپنی زوجہ ام وہب اور ماں کے ساتھ نکلے۔

۳۔ جنادہ بن حارث انصاری

یہ بھی اپنی زوجہ اور ایک نابالغ فرزند کو جس کا نام عمرو تھا' ساتھ لے کر نکلے تھے۔

ولایتی نسب کا خاندانی نسب پر مقدم رکھنا۔

کسی بھی اجتماع میں شناخت کیلئے نسب ضروری ہے تا کہ دوسروں سے تمیز کی جا سکے۔ سورہ حجرات کی آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہچوانے کی حد تک نسب کے ذریعہ تعارف کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خصوصاً جہاں فضائل نسب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں' وہاں نسب کا ذکر کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ خاندانی نسب سے زیادہ معنوی نسب کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ امام جعفر الصادقؑ نے فرمایا:

''مجھے اپنے جد بزرگوار علیؑ سے خاندانی انتساب سے زیادہ ولایتی انتساب پر فخر حاصل ہے''۔

میدان جنگ میں اپنے آپ کو پہچوانے کیلئے انتساب ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کربلا کے میدان میں بھی ہر ایک نے میدان میں جا کر دشمن کے سامنے اپنے سلسلہ نسب کو شعر کی صورت میں بیان کیا' جسے عربی میں ''رجز'' کہتے ہیں۔ اصحاب مقاتل لکھتے ہیں کہ کربلا کے میدان میں گیارہ سال کی عمر کا ایک بچہ تھا جس کا نام عمرو تھا۔ وہ اپنے باپ جنادۃ بن کعب بن حارث انصاری اور اپنی ماں کے ساتھ کربلا آیا تھا۔ جنادۃ کے میدان

جنگ میں شہید ہو جانے کے بعد ان کی زوجہ مؤمنہ نے جو غالباً عمر رسیدہ خاتون تھیں' اپنے بیٹے عمرو کو لباس پہنا کر اور ہاتھ میں تلوار دے کر امام مظلوم کی خدمت میں بھیجا۔ امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

''معلوم ہوتا ہے۔ بچہ میدان جنگ میں جانا چاہتا ہے جبکہ اس کا باپ شہید ہو چکا ہے۔ اسے روکو کیونکہ اس کی ماں بیک وقت بیٹے اور شوہر کے مصیبت برداشت نہیں کر سکے گی۔''

عمرو نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا:

''میری ماں نے ہی مجھے آپؑ کی خدمت میں بھیجا ہے' میں انہی کے حکم سے آیا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس کمسن مجاہد نے امامؑ سے اجازت لی اور میدان جنگ میں کود پڑا۔

میدان میں جا کر اس نے دوسرے تمام انصار و یاران اور جوانان بنو ہاشم سے مختلف رجز پڑھا۔ دوسرے تمام اصحاب سب سے پہلے اپنا تعارف' اپنے باپ کے حوالے سے کراتے تھے لیکن اس ننھے مجاہد نے رجز میں کہا کہ:

''میرے مولا حسینؑ ہیں۔ دیکھو میرے مولا کتنے بزرگ اور عظیم ہیں۔ آیا دنیا میں میرے مولا کی کوئی نظیر ملے گی؟ اگر تمہیں میرے مولا کا نسب معلوم نہیں تو سنو' وہ فرزند علیؑ و فاطمہؑ ہیں جن کی مثال دنیا میں کوئی اور نہیں۔''

یہ کہہ کر یہ ننھا مجاہد اپنی کم عمری کا خیال کیے بغیر لشکر اشقیاء پر حملہ آور ہوا۔

جب زین اسپ سے نیچے گرا تو اس نوعمری میں اس کی شجاعت و شہامت دیکھ کر دشمن آگ بگولا ہوئے اور اس بچے کا سر تن سے جدا کر کے اس کی ماں کی طرف پھینکا۔ کیا دنیا میں ایسی کوئی ماں ملے گی جو ایسے موقعہ پر ہاتھ میں تلوار لے کر آتی ہے اور بیٹے کے سر کو دوبارہ دشمن کی طرف پھینک کر کہتی ہے:

''دیکھو اگرچہ میں عاجز و ناتواں ہوں' لیکن اس وقت میرے آقا و مولا اس سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔ میں اپنی پوری طاقت و توانائی کے ساتھ تم سے جنگ کروں گی اور فرزند فاطمہؑ کا دفاع کروں گی۔''

اصحابِ اہل بصرہ

امام حسینؑ نے چالیس سال ظلم وستم اور شریعت میں تغیر وتبدل وانحراف کے دلخراش مناظر دیکھے۔ اپنے پدر گرامی امیرالمومنینؑ کے فرمان "فی العین قذیٰ وفی الخلق شجی" (آنکھوں میں سنگریزہ اور گلے میں ہڈی) کے مطابق زمان ومکان کی تشخیص کی خاطر تحمل کی گھڑیاں گزاریں۔ معاویہ کے مرنے کے بعد وسائل وانصار کی قلت کے باوجود ندائے الٰہی کو لبیک کہتے ہوئے امامؑ نے خود کو خانۂ خدا تک پہنچادیا۔ قیام حسینی کی خبر ملنے کے بعد کوفہ کے عاشقانِ اہل بیتؑ اور تشنگانِ عدالت نے امام حسینؑ کو اپنی طرف آنے کی دعوت دی۔ مسلم بن عقیل کی طرف سے کوفہ کے حالات کے سازگار ہونے کی خبر ملنے کے بعد امامؑ نے کوفہ کا قصد کیا۔ بعض نے اس کو بیوقوفی قرار دیا بعض نے اسے خلاف مصلحت اقدام گردانا' جبکہ بعض نے حسن نیت سے کام لیا اور اقدام کو صحیح جانتے ہوئے تیاری میں مصروف ہوگئے۔

امام حسینؑ نے مختلف سیاسی ومذہبی شخصیتوں کو اپنے اس قیام میں ساتھ دینے کی دعوت دی۔ اپنے سفیروں کو دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے محبّان اہل بیتؑ کے پاس بھیجا۔ سلیمان بن زرّین کہ جنہیں امامؑ نے بصرہ روانہ کیا تھا' عبیداللہ بن زیاد کے آدمیوں نے انہیں راستہ میں گرفتار کر کے شہید کردیا اور پھر فی الفور بصرہ کی ناکہ بندی کردی۔ بصرہ میں داخل ہونے اور خارج ہونے والوں پر سخت نگرانی کی جانے لگی۔ اس صورتحال میں بعض محبّان اہل بیتؑ سرحد سے گزرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

بصرہ میں بعض دوستدارِ اہل بیتؑ ایسے بھی تھے کہ جنہیں امام حسینؑ نے دعوت بھی نہ دی تھی لیکن امامؑ کے قیام کی اطلاع ملتے ہی یہ لوگ ایک دوستدار اہل بیتؑ ماریہ بنت منقذ نامی خاتون کے گھر پر جمع ہوئے۔ اس گروہ کے سربراہ یزید بن نبیط عبدی نے اہل بیت اطہارؑ سے اپنے اخلاص اور محبت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "میں کسی کا انتظار نہیں کروں گا' کیونکہ میں نکلنے کے لئے آمادہ ہوچکا ہوں۔ میں نکل رہا ہوں' جو بھی نکلنا چاہتا

ہے وہ میرے ساتھ آجائے۔" ان کے اس بیان پر بہت سے لوگوں نے حالات کا تجزیہ وتحلیل کرنے کے بعد' اسے ناسازگار قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن اُن لوگوں کی کوئی بھی بات ان عاشقانِ حسینؑ کو منحرف نہ کرسکی۔ گویا وہ اپنے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ ان اصحاب امامؑ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ یزید بن نبیط عبدی

۲۔ عامر بن مسلم عبدی

۳۔ مولی عامر

۴۔ سیر بن مالک عبدی

۵۔ أدھم بن عبیدہ عبدی

۶۔ یزید بن نبیط عبدی کے دو بچے

ان لوگوں نے حکومت کے کسی بھی خطرے کی کوئی پروا نہ کی اور بہ شوق دیدار امامؑ میں جذبہ شہادت کے گیت گاتے ہوئے اور آیات قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے منزل ابطح پر قافلہ حسینی سے جاملے۔ امامؑ کی خدمت میں عرض سلام کی اور بالآخر روزِ عاشورا میدانِ کربلا میں امام حسینؑ کے رکاب میں شہادت حاصل کر کے اپنی دیرینہ آرزو پالی۔ زیارت ناحیہ اور زیارتِ رجبیہ میں ان ذوات پاک کے ناموں سلام کا ذکر ہے۔

not found.

آلِ ریاحی

روزِ عاشورا رکاب امام حسینؑ میں شہادت کے درجہ پر فائز ہونے والے شہدائے کرام میں سے ایک شہید کا تعلق قبیلہ بنو تمیم کے خاندان ریاح سے تھا۔ وہ عظیم ہستی جناب حر بن یزید بن ناجیہ بن عتاب بن مرمی بن ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک کی تھی۔

قبیلہ یربوع میں اسلام سے پہلے اور اسلام کے آنے کے بعد دونوں ادوار میں برجستہ شخصیت کے حامل افراد گزرے ہیں۔ خود مولا امیر المومنین حضرت علیؑ عبداللہ ابن عباس کے نام اپنے ایک خط میں قبیلہ بنو تمیم کی تعریف کرتے ہیں۔ اس قبیلہ میں جناب حر ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔

عبیداللہ بن زیاد نے امام حسینؑ کے مکہ سے کوفہ کی طرف سفر کی خبر سننے کے بعد حر بن یزید ریاحی کو ایک ہزار لشکر کی قیادت میں بھیجا اور انہیں مندرجہ ذیل ہدایات دیں:

۱۔ ممکنہ صورت میں انہیں گرفتار کیا جائے۔

۲۔ اگر گرفتار نہ کرسکو تو حجاز واپس جانے سے روک دیا جائے۔

۳۔ ان کے ساتھ ٹھہر کر ان کی نگرانی کرتے رہو یہاں تک کہ ہماری دوسری ہدایت پہنچ جائے۔

خود حر کے کہنے کے مطابق انہیں امام حسینؑ سے جنگ کرنے سے منع کیا گیا تھا یا جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ حر ایک ہزار کی فوج لے کر امام حسینؑ کی تلاش میں کوفہ سے نکلے۔ سرزمین عراق کی تپتی ہوئی ریگ زار کو طے کرنے کے بعد کوفہ سے دو منزل کے فاصلہ پر انتہائی خستہ حالی اور بے تابی کے عالم میں ذو حسم کے مقام پر حر کی فوج کا امامؑ کے لشکر سے سامنا ہوا۔

اِس میدانِ کربلا میں حُر کی شخصیت نے چند روز میں کتنے رنگ بدلے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف حر

عبیداللہ ابن زیاد بن مرجانہ جیسے مجرم وسفاک و خونخوار انسان کے حکم کا تابعدار ہے اور اسکے حکم کے مطابق نواسۂ رسول کو کربلا کے دشت و بیابان میں روک کر رکھتے ہیں۔ دوسری طرف امام حسینؑ کے ساتھ وہ خاضعانہ سلوک روا رکھتے ہیں جس کی امید کبھی دشمن سے نہیں کی جا سکتی مثلاً امامؑ کی اقتداء میں آپ کا نماز پڑھنا، امامؑ کے ساتھ بے ادبی سے گریز کرنا وغیرہ۔ تیسری طرف مزاحمت کی صورت میں آپ امام حسینؑ کو قتل کی دھمکی دیتے ہیں اور کوفہ والوں کے امام حسینؑ کے نام لکھے گئے دعوت ناموں اور خطوط کے بارے میں لاتعلقی اور لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب حر دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو پس پشت ڈال کر رکاب حسینی میں خون میں نہانے کے عزم و ارادہ کے ساتھ کانپتے اور لرزتے ہوئے، اپنے ہاتھوں کو سر پر رکھ کر، حسینؑ کے حضور میں شرفیاب ہوتے ہیں اور بالآخر شہادت کے درجۂ عظمیٰ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کو فکر اور سوچ پر استوار رکھنے والوں کے لئے، حر کی زندگی کے ان آخر لمحات میں درس و عبرت کے لئے غور طلب نکات موجود ہیں۔

مستند اور معتبر کتب مقاتل میں امام حسینؑ سے منزل ذو حسم پر ملاقات سے لے کر وقت شہادت تک حر سے متعلق صفحات میں کہیں بھی حر کے کسی فرزند یا غلام کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ جو ذکر ہے، وہ قرۃ بن قیس اور مہاجر بن اوس کا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کا ذکر اور کسی سے گفتگو ہونے کا تذکرہ کہیں نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود کتاب ''حر بن یزید ریاحی'' کے مؤلف حائر خراسانی نے آپ کے ہمراہ شہید ہونے والوں میں علی بن حر، بکیر بن حر، بجیر بن حر، آپ کے بھائی مصعب بن یزید ریاحی، علی بن حر ثانی اور غلام حر، قرۃ کا ذکر کیا ہے۔ شہدائے کربلا کے ناموں کی فہرست زیارات رجبیہ اور ناحیہ میں محفوظ ہیں، ان میں کہیں ان لوگوں کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ ارباب مقاتل کہ جنہوں نے زیادہ سے زیادہ شہدائے کربلا کے ناموں کی فہرستیں مرتب کی ہیں، ان فہرستوں میں بھی کہیں حُر کے بیٹوں یا بھائی یا غلام کا ذکر نہیں ہے۔

جس طرح مصائب گھڑنے کے لئے حر کے فرزندوں کا قصہ نقل کیا گیا ہے، اسی طرح حر کے رکاب امام حسینؑ میں شامل ہونے کے منظر کو بھی حبیب ابن مظاہر کی آمد کے موقعہ سے مشابہ بنایا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں

خطباء وذاکرین بڑے جوش وخروش کے ساتھ مصائب میں بیان کرتے ہیں۔چونکہ ان باتوں کی کوئی سند نہیں ہے لہٰذا ہم نے دلائل وشواہد کے ساتھ حبیب سے متعلق بیان میں انہیں مسترد کیا ہے۔اسی طرح سے حر سے متعلق یہ قصے بھی جھوٹ ہیں اور انہیں بھی ہم مسترد کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے غلط روایات کا ذکر اپنا وطیرہ بنایا ہے ان کی نظر میں عزاداری کا انعقاد حسینؑ کے لئے نہیں بلکہ خود امام حسینؑ عزاداری کے لئے ہیں۔جب ایسا ہے تو پھر ظاہر کہ ان کے نزدیک حسینؑ خواہر حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی اہانت یا ان کی شان میں جسارت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔اگر ان کی تقریر سے کسی آنکھ سے آنسو جاری ہوجائیں تو منہ میں جو آئے کہنے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔

not found.

آلِ ازد

عبداللہ بن عفیف ازدی

عبداللہ بن عفیف قبیلہ ازد سے تھے اور مولا امیر المومنینؑ کے باوفا اور برجستہ صحابی تھے۔

کتاب ''مثیر الاحزان'' میں ابن نما حلی نے اور ''لہوف'' میں ابن طاؤس نے نقل کیا ہے کہ جنگ جمل میں آپ کی داہنی آنکھ تیر لگنے سے زخمی ہوگئی اور بینائی جاتی رہی جبکہ جنگ صفین میں آپ بائیں آنکھ سے بھی محروم ہوگئے تھے۔دونوں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہونے کے بعد آپ زینت مسجد بن کر شب وروز عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

جب امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اہل بیت اطہار اسیر ہوکر دارالامارہ پہنچے تو کوفہ کا مجرم وسفاک والی اہل بیت اطہارؑ کے زخموں پر نمک چھڑکنے، اپنی اندرونی بد طینت اور جنایت کو ظاہر کرنے، اہل کوفہ کو اپنے ظلم وستم سے مزید خوفزدہ کرنے نیز سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے قتل امام حسینؑ کا شرعی جواز پیش کرنے کیلئے مسجد کوفہ کے منبر پر گیا۔منبر پر بیٹھ کر جب ابن زیاد نے امیر المومنین جناب علی ابن ابیطالبؑ اور سردار جوانان اہل جنت کے حق میں جسارت کرنا چاہی اور جب یزید کے گن گانے کے بعد وہ اپنی وہمی وجنونی فتح کا اعلان کرنے کیلئے آمادہ ہوا تو اس نے (جیسا کہ ''مقتل الحسین'' تالیف عبدالرزاق مقرم، صفحہ ۴۲۶ اور ''تاریخ طبری'' جلد ۶ صفحہ ۲۶۶ پر نقل ہے) کہا:

''حمد ہے اس ذات کیلئے جس نے حق کو ظاہر کیا، اہل حق کی مدد کی، امیر المومنین یزید اور ان کی حزب کو فاتح بنایا، جھوٹے اور جھوٹے کے فرزند حسینؑ بن علیؑ اور ان کے شیعوں کو قتل کیا۔''

جبین تاریخ پر جرم کی سیاہ لکیر کھینچنے والے مجرم کے جرم وجنایت کو شریعت کا لبادہ پہنانے اور اس کو جائز قرار

دینے پر محمول کلمات سننے کے بعد بھی اس مجمع میں کسی مسلمان کی غیرت کو طیش نہ آیا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے کہ جنہوں نے نواسۂ رسول کو اس شہر میں آنے کی دعوت دی تھی' لیکن کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ ابن زیادہ کے اس جملہ کا جواب دے سکے۔ گویا پورے اجتماع پر ضلالت وگمراہی اور مفاد پرستی کے بادل چھائے ہوئے تھے اب ان کی نظروں میں حفظ جان کے علاوہ کسی بھی قدر وارزش کا پاس ولحاظ نہیں تھا۔

اس جم غفیر میں جلیل القدر صحابی مولا امیر المومنینؑ عبداللہ بن عفیف بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں کی بے غیرتی اور سفاک مجرم کی جنایتیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے کیونکہ دونوں آنکھوں سے نابینا تھے' لیکن حق وباطل کی صدا کو ضرور سکتے تھے' ان دونوں میں تمیز کرنے کا وجدان اس مردِ حق میں باقی تھا۔ شوق شہادت ان کے دل میں موجزن تھا' جنگ جمل وصفین میں جس شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا' وہ جرأت وشہامت اس وقت بھی باقی تھی۔ انہوں نے مسجد کے ایک کونے سے آواز بلند کی اور ابن زیاد کے طیش وجنون کی پروا کئے بغیر' اس کے کبرو نخوت کی ساری شیخی نکال دی۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے فرزند مرجانہ! تو جھوٹا اور تیرا باپ جھوٹا ہے اور جس نے تجھے اس منصب پر بٹھایا ہے وہ اور اس کا باپ جھوٹا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی تو نے فرزندان انبیاء کو قتل کر ڈالا۔ اب اسی منبر پر بیٹھ کر انبیؑ کی شان میں جسارت کرتا ہے۔ تجھے شرم وحیات سے ڈوب مرنا چاہئے۔''

یہ باتیں سن کر عبیداللہ بن زیاد کے غیض وغضب کی انتہا نہ رہی۔ اس نے پوچھا یہ متکلم کون ہے؟ عبداللہ بن عفیف نے کہا:

''اے دشمن خدا! متکلم میں عبداللہ بن عفیف ہوں۔ آیا ذریت رسولؐ طاہر ومطہر ہستیوں کو' جن کی شان میں آیہ تطہیر نازل ہوئی' شہید بھی کرتا ہے اور خود ان کے نانا کے دین پر ہونے کا اعلان بھی کرتا ہے؟ عفیف نے فریاد کی' کہاں ہیں وہ مہاجر وانصار؟ یہاں ظالم وسرکش سے انتقام لینے والا کوئی نہیں؟ اے لعین کے بیٹے! قولِ رسولؐ کے تحت تو ملعون ہے''۔

فاتح امیر کے ہزاروں حامیوں کے اجتماع میں' اتنی جرأت وشہامت کے ساتھ اور اس طرح بے پروا ہو کر'

تحقیر آمیز باتوں کے سنانے پر ابن زیاد اپنے غیض وغضب کے شعلوں پر قابو نہ پا سکا۔ اس نے اسی وقت اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ عفیف نے شعار بلند کیا: ''اے مبرور اقبیلہ بنی ازد کہاں ہو''۔ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ قبیلہ بنو ازد کے لوگ عبداللہ بن عفیف کے گرد جمع ہو گئے اور انہیں سپاہیوں سے چھڑا کر ان کے اپنے گھر لے آئے۔

اس جرم کی پاداش میں ابن زیاد نے قبیلۂ بنو ازد کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا' جن میں عبداللہ بن مخنف بھی شامل تھے۔ رات کے وقت عبیداللہ بن زیاد نے ایک لشکر ترتیب دے کر عبداللہ بن عفیف کو گرفتار کرنے کے لئے ان کے گھر روانہ کر دیا۔ قبیلہ بنو ازد کے لوگ یہ سن کر عبداللہ کے گھر کے گرد جمع ہو گئے۔ عبیداللہ بن زیاد کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے محمد بن اشعث کو ایک اور لشکر کے ساتھ بھیجا۔

عبداللہ بن عفیف ایک عرصہ سے شہادت کی تمنا کر رہے تھے۔ آج ان کا اپنا گھر مقتل بن گیا۔ جب محمد بن اشعث کا لشکر عفیف کے گھر میں داخل ہوا تو بیٹی نے ان کو اس کی خبر دی۔ انہوں نے کہا ''کوئی پروا نہیں' تم مجھے تلوار دے دو' میں خود اپنا دفاع کروں گا''۔ وہ ایک شعر پڑھتے ہوئے نکلے۔ بیٹی انہیں بتاتی جاتی تھی کہ دشمن آپ کے سامنے ہے' پیچھے ہے' دائیں' بائیں ہے۔ بیٹی اشارہ کرتی رہی اور عفیف اپنا دفاع کرتے رہے۔ بیٹی کہتی تھی: ''کاش! میں مرد ہوتی تو دشمنوں کو اپنے بابا سے دور کرتی''۔ جب سب نے مل کر ان کا محاصرہ کر لیا اور کوئی مددگار نہیں رہا تو عبداللہ بن عفیف گرفتار ہوئے اور آپ کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابن زیاد نے کہا: ''اس خدا کا شکر ہے جس نے تم کو شرمندہ کیا''۔ عفیف نے جواباً کہا: ''کس چیز نے مجھے شرمندہ کیا؟ اگر میری آنکھیں سلامت ہوتیں تو تم دیکھتے کہ میں کیا کرتا''۔

ابن زیاد نے عبداللہ عفیف سے پوچھا کہ عثمان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے عثمانؓ پر سب کی اور کہا ''تیرا عثمان سے کیا رشتہ ہے؟ عثمان صحیح ہوں یا غلط' تجھ کو کیا ربط ہے؟ خداوند عالم ان کے اور ان کے مخالف کے درمیان فیصلہ حق کرے گا۔ تُو مجھ سے اپنے بارے میں اپنے باپ کے بارے میں اور اپنے امیر یزید اور اس کے باپ معاویہ سے متعلق پوچھ''۔ ابن زیاد نے کہا ''میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ تم موت کا مزہ چکھو

گئے۔ عبداللہ بن عفیف نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: ”حمد اس رب العالمین کیلئے ہے‘ تیرے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے میں یہ دعا کرتا تھا کہ اے ذات باری تعالیٰ! مجھے اپنی مخلوقات میں سے بدترین مخلوق کے ہاتھوں شہادت نصیب کر۔ جب میں آنکھوں سے نابینا ہوا تو شہادت سے مایوس ہوگیا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ خدا نے میری دعا قبول کرلی تھی۔“ اس وقت عبیداللہ بن زیاد نے حکم دیا کہ اس مرد نابینا کو قتل کردو۔

عبداللہ عفیف ظاہری طور پر نابینا ضرور تھے لیکن دل و وجدان سے ایک بابصیرت انسان تھے۔ کوفہ کے وہ ظاہری بصارت رکھنے والے لوگ کہ جنہوں نے فریادِ حسینؑ کو سننے کے بعد بھی آنکھیں نہیں کھولیں‘ ان سب کو اس مرد نابینا نے شرمندہ کردیا۔ دشمنوں نے آپ کو شہید کرنے کے بعد آپ کی نعش کو مقام صفہ پر سُولی پر لٹکایا۔

جندب بن عبداللہ ازدی

اس کے بعد ابن زیاد نے جندب بن عبداللہ ازدی کو گرفتار کیا‘ وہ بھی بوڑھے تھے۔ ابن زیاد ان کو مخاطب کر کے بولا: ”اے دشمن خدا! کیا تو بھی جنگ صفین میں ابی تراب کے اصحاب میں شامل تھا۔“ انہوں نے کہا: ”مجھے ان کا دوست ہونے اور ان کے اصحاب میں سے ہونے پر فخر ہے‘ میں تجھے اور تیرے باپ کو دشمن رکھتا ہوں‘ خصوصاً جب سے تو نے اصحاب و اولادِ رسولؐ کو شہید کیا ہے۔ تجھے غضب الٰہی کا خوف نہیں ہے؟“ اس پر ابن زیاد نے کہا: ”میرے خیال میں تم تو اس نابینا سے بھی زیادہ بے شرم ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا خون بہا کر قربِ خدا حاصل کروں گا۔“ جندب نے کہا: ”نہیں ہرگز نہیں‘ ایسا کریگا تو تجھے ہرگز خدا سے قرب حاصل نہیں ہوگا“۔ ابن زیاد نے جندب کو قتل کرنے میں خوف محسوس کیا‘ وہ قبیلۂ بنو ازد سے ڈر گیا اور انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اس کی تو عقل ہی کھوچکی ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد سب سے پہلا مجاہد جس نے راہ خدا میں قربانی پیش کی وہ گرامی نام نامی‘ دین و دنیا دونوں میں عبداللہ بن عفیف ازدی ہے۔ مسجد کوفہ میں عبداللہ بن عفیف کے اس جرأت مندانہ عمل کا ذکر تمام مقاتل میں موجود ہے اور تمام کتب سیر و تاریخ میں اسے بیان کیا گیا ہے۔

لیکن صد افسوس! مصائب امام حسینؑ پڑھنے والے ہر سال نت نئی جعلی شخصیات کے مصائب تو پڑھتے ہیں‘

مگر انہیں اس مردِ شجاع اور جان نثار حسینؑ کی فداکاری و قربانی نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ عفیف نابینا نہیں تھے بلکہ اُس دور کے نابینا تو کوفہ کے وہ لوگ تھے جنہوں نے امام حسینؑ کو بلایا لیکن جان کی قربانی دینے میں بخل سے کام لیکر خاموشی اختیار کی۔ اور موجودہ دور کے نابینا وہ لوگ ہیں‘ جو صحیح اور مستند و معتبر مصائب کو فروغ دینے کے بجائے‘ اس پر جھوٹے مصائب کو ترجیح دیتے ہیں اور یوں مصیبتِ امام حسینؑ کی حقیقی تصویر عامۃ الناس کی نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے۔

آئمہؑ ہماری عزاداری کے خدمت گزار ہیں

آئمہ طاہرینؑ کی عزاداری کے بارے میں سفارش اور اس کے برپا کرنے میں اجر و ثواب کی نوید کا مقصد یہ ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے اہداف مقدسہ کو زندہ باقی رکھا جائے' کیونکہ امام امام حسینؑ اور آپ کے فلسفۂ شہادت سے تمام انبیاء کے اہداف و مقاصد کو دوام ملا ہے:

عزاداریٔ امام حسینؑ سے بقائے اسلام و سربلندیٔ کلمۂ توحید ہے۔ لہٰذا بعض بزرگان فرماتے ہیں کہ اسلام' حسینؑ سے زندہ ہے۔

لیکن بعض عزاداروں نے عزاداری ہی کو اپنا مقصود و مطلوب بنالیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک عزادارانِ حسینؑ کی بلندیٔ درجات کے بارے میں پیغمبرؐ و ائمہ طاہرینؑ نے جو اجر و ثواب بیان کیا ہے' وہ کم ہے۔ جنت کی بشارت اور رضائیت خداوندی ان کی نظر میں حقیر شے ہے' کیونکہ یہ سب معنویات ہیں اور ان کا تعلق سعادتِ دارین سے ہے جبکہ ان لوگوں کو سعادتِ دنیا چاہیے' لہٰذا عزاداری کی قدر و قیمت کو اپنے مرضی کے مطابق پیش کرنے کی خاطر ان نام نہاد عزاداروں کو بھی غیر معقول احادیث جعل کرنے کی ضرورت پڑی تاکہ گزشتہ زمانے کے جعل سازوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اہل بیتؑ کے نام سے اہل بیت کی تحقیر کرنے کی ایک مثال قارئین کے پیش خدمت ہے' جس کی سند بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے' کیونکہ یہ باتیں کتابوں میں تو ہیں ہی نہیں۔ شاید یہ کیسٹوں سے نقل شدہ کلمات ہیں۔

بعض افراد کہتے ہیں کہ جب کوئی عزاداری مجلس عزا برپا کرتا ہے تو اس عزاداری کا اہتمام کرنے، فرش عزا کی صفائی کیلئے یا کم از کم مجلس عزاء میں شرکت کے لئے جنابؑ زہراءؑ ضرور تشریف لاتی ہیں۔ نعوذباللہ یہاں تک جسارت کرتے ہیں کہ عزاداروں کی چپلیں اور جوتیاں سیدھی کرنے کیلئے امام سجادؑ بھی تشریف لاتے ہیں۔ اسی طرح شام میں قصر یزید میں جناب زہراءؑ کے تشریف لانے کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ گویا عزاداروں کی اتنی

قدر و منزلت ہے کہ جناب زہراءؑ اور امام سجادؑ ان کی خدمت کیلئے بہ نفس نفیس تشریف لاتے ہیں۔ اسی سے عزاداری کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

یہ قصے بالکل بے بنیاد' بے اساس اور حقائق سے متصادم ہیں' جنھیں کوئی ذی ہوش قبول نہیں کرتا۔

۱۔ دنیا کے گوشہ و کنار میں خصوصاً ایام عزا کے دوران جتنی مجالس ہوتی ہیں' اگر ان کا تخمینہ لگایا جائے تو ایک گھنٹہ میں بیک وقت ہزاروں کی تعداد میں مجالس برپا ہوتی ہیں۔ ان تمام مجالس میں جناب زہراءؑ اور امام سجادؑ کا حاضر ہونا محال ہے۔ اس سلسلہ میں لوگ امیر المومنینؑ کی مہمانی کی مثال پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ قصہ خود موجب سوال و استفسار ہے۔ اس قصہ کو مبنی بر حقیقت ثابت کرنے کیلئے لوگ ٹیلی ویژن سے تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ یہ ایک دھوکا ہے۔ مہمان ایک ہی وقت میں میزبان کے گھر کھانا کھاتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن پر صرف تصویر نظر آتی ہے' خود وہ شخص موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ جس وقت تصویر ٹیلی ویژن پر نظر آرہی ہوتی ہے ممکن ہے وہ شخص خود اپنے گھر میں سویا ہوا ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جس کی تصویر ہم ٹیلی ویژن پر دیکھ رہے ہیں' وہ کافی عرصہ پہلے مرچکا ہو۔

لہٰذا سائنس و ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی کہانیوں اور کہاوتوں سے مذہب کو فرسودہ بنانے کا مقصد' لوگوں کو مذہب سے دور کرنے اور بیزار رکھنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا۔

۲۔ دنیا کی زندگی ایک حقیر زندگی ہے۔ عالم برزخ دنیاوی زندگی سے اعلیٰ اور آخرت کی زندگی سے کمتر ہے اسی لئے اس زندگی کو حیات وسطیٰ کہتے ہیں' حیاتِ اخروی اس سے اعلیٰ ہے۔

سیر صعودی (نیچے سے اوپر کی جانب جانا) سیر کمال ہے جبکہ عالم برزخ سے دنیا کی طرف آنے کو سیر رجعی کہتے ہیں' یعنی پیچھے کی طرف پلٹ آنا۔ یہ کمال نہیں ہے' اس میں نقص ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نوجوان چھوٹا بچہ بن جائے۔ اس میں تعریف کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے خدا قادرِ مطلق ہے اپنے انبیاء و ائمہ کے مقام و منصب کو ثابت کرنے کیلئے' خدا ایسے غیر عادی افعال ان کے ہاتھوں سے انجام دلاتا رہا ہے۔ مثلاً کوہ طور پر قوم بنی اسرائیل کے منتخب افراد کا مرنے کے بعد دوبارہ

زندہ ہوجانا،حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا یا حضرت عزیر کا دوبارہ زندہ ہونا ۔ یہ تمام واقعات صرف معجزہ دکھانے کی خاطر وقوع پذیر ہوئے تھے،ورنہ ایک مرتبہ مرجانے کے بعد کسی کا دوبارہ زندہ ہونا عادی اعتبار سے ممکن نہیں ہے ۔عالم برزخ اور دنیا کے درمیان موجود پردے کو چاک کر کے دیکھنے والوں کیلئے تو شاید یہ ممکن ہو،لیکن آئمہ کی سیرت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی دوبارہ زندہ ہو کرآیا ہو۔خود پیغمبر اسلامؐ یا حضرت علیؑ کے دوبارہ پلٹ کرآنے کی کوئی مثال موجود نہیں ہے ۔

۳۔ اگر اس بات سے عزاداری کے مقام ومنزلت میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ بات صرف جناب زہراءؑ اور امام سجادؑ سے منسوب کیوں ہے ۔کیا دیگر اہل بیتؑ تشریف نہیں لاتے ؟ کیا کسی نے رسولؐ اللہ کو آتے ہوئے دیکھا ہے ؟ علیؑ کو دیکھا ہے؟ کیا امام زمانؑ کو جو اس وقت موجود ہیں، کسی مجلس عزا میں آتے دیکھا گیا ہے؟لہٰذا تمام تر تجزیہ و تحلیل ،ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ یہ قصہ عقل ومنطق اور نقل مسلمہ سے دور اور مضحکہ خیز ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی شام غریباں سے منسوب یہ قصہ ہے ۔کہتے ہیں کہ شام غریباں میں حضرت زینبؑ واُم کلثوم خیموں کے گرد پہرہ دے رہی تھیں ۔ایسے میں نجف کی طرف سے ایک سوار کو آتے ہوئے دیکھا۔جب وہ سوار قریب پہنچا تو حضرت زینبؑ نے فرمایا:" اے شخص!ہمارے خیموں میں یا تو مستورات بیٹھی ہیں یا سہمے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔مال واسباب تو کجا، ہمارے سروں پر چادریں بھی نہیں ہیں ۔ جہاں ہو،وہیں سے واپس چلے جاؤ۔ہماری طرف نہ آؤ۔"اس کے باوجود بھی جب وہ سوار آگے بڑھتا رہا تو جناب زینبؑ و اُم کلثوم نے قسمیں دے کر اس سے واپس جانے کی درخواست کی ۔لیکن اس نے انکی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی، یہاں تک کہ قریب آکر اپنے چہرے سے نقاب کو اُلٹ دیا۔اب جو دیکھا تو کوئی اور نہ تھا بلکہ خود حضرت علیؑ تھے۔آپؑ نے جناب زینبؑ واُم کلثوم سے فرمایا "بیٹی تم نے اپنے بابا کو نہ پہچانا۔"

یہ قصہ بھی کئی لحاظ سے غیر منطقی ہے:

۱۔ اگر یہ منظر عالم کشف واکتشاف میں جناب زینبؑ کے سامنے آیا تھا تو صرف بی بی زینبؑ کو نظر آنا چاہیے

تھا جبکہ بیان کے انداز سے لگتا ہے کہ دوسروں نے بھی دیکھا۔اگر یہ کہیں کہ جناب زینبؑ کو کلام کرتے ہوئے سنا ہوگا تو حضرت علیؑ کی باتیں کیسے سن لیں؟

۲۔ میدان میں چاروں طرف دشمن کے سپاہی پھیلے ہوئے تھے،جو ہر آنے جانے والے کی نگرانی کر رہے تھے ایسے میں کسی کیلئے آنا ممکن نہ تھا۔

۳۔ ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ فاتح اپنے اسیروں کی نگرانی کرتے ہیں اور اسیر محبوس ہوتے ہیں، نہ یہ کہ وہ خود اپنی حفاظت کیلئے پہرہ دیں ۔

ان غیر عقلی،غیر مسلّمہ اور غیر مستند،نقلی مصائب بیان کرنے سے نہ تو اہل بیتؑ کے مقام ومنزلت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے دین کی سربلندی ممکن ہے ۔دین کی سربلندی جھوٹی کہانیوں سے نہیں ہوتی لہٰذا مجالس عزا میں اس قسم کی جھوٹی باتوں سے گریز کرنا چاہیے ۔

عزاداری میں قیامِ کربلائی

قیام وتحریک امام حسینؑ کو زمانہ کے حوالے سے "قیام عاشورا" اور مکان (مقام) کے حوالے سے "قیام کربلا" کہا جاتا ہے۔ درحقیقت زمان ومکان فی نفسہ کوئی کردار نہیں رکھتے بلکہ صالح اور بابصیرت مصلحین اور تجربہ کار قائدین اپنے قیام کیلئے خود مناسب زمان ومکان کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ ان کا انتخاب ہی ہے جس کی بنیاد پر زمان اور مکان کو اہمیت اور مقام حاصل ہوتا ہے اور اس میں درحقیقت اصل کردار بانیٔ قیام کا ہوتا ہے۔

عزاداری میں قیام کربلائی سے ہماری مراد یہ ہے کہ پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کے خلاف قیام کربلا عمل میں آیا۔ عزاداری چونکہ قیام حسینیؑ کی یاد منانے اور اسے دلوں اور ذہنوں میں زندہ وتازہ رکھنے کا نام ہے اسلئے اسے بھی قیام کربلا ہی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ عزاداریٔ امام حسینؑ میں قیام کربلائی کیا ہے:

۱۔ تحریف وترمیف کے خلاف قیام

تحریف، باطل کو حقیقت کے لباس میں پیش کرنے اور حقیقت کو کنارے لگا دینے کا نام ہے۔

بنوامیہ نے اپنے بیس سالہ دورِ حکومت میں دین وشریعت کو ہر لحاظ سے تحریف وترمیف کا نشانہ بنایا، حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دیا۔ قیام امام حسینؑ ایک حوالہ سے دین میں اسی تحریف وترمیف کے خلاف قیام تھا۔ امام حسینؑ اور دیگر آئمہ نے ہمیں بھی دین میں تحریف وترمیف کے خلاف قیام کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے عزاداریٔ ابوعبداللہ کو وسیلہ قرار دیتے ہوئے ائمہ طاہرینؑ نے اسے قائم ودائم رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ عزاداری کا مقصد ہی تحریف وترمیف دین کے خلاف قیام ہے، اگر کوئی دیکھے کہ خدانخواستہ خود عزاداری ہی تحریف وترمیف کا شکار ہو رہی ہے تو کیا اس تحریف کے خلاف قیام ناگزیر نہ ہوگا؟ کیا عزاداری، آئمہ معصومینؑ کی طرف سے ودیعت

کردہ ایک امانت نہیں ہے؟

اس وقت تک عزاداری میں بڑے پیمانے پر غلط اور باطل رسومات داخل ہو چکے ہیں اور اس بارے میں کسی کو شک نہیں ہے۔ بیشتر مؤلف اور مقرر حضرات اپنے تحریر وبیان میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ فلاں بات ثابت شدہ نہیں یا فلاں روایت معتبر نہیں۔ پھر خود ہی کہتے ہیں لیکن کیا کریں، رونے رلانے کیلئے بیان کرنا پڑتا ہے اور اس میں ہرج بھی کیا ہے؟ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی ہے کہ روایات وواقعات میں جعل وتحریف ایک معمول بن گیا ہے۔ ایسے ایسے قصے اور ایسی ایسی کہانیاں گھڑی جا چکی ہیں جن کا ذکر ضعیف سے ضعیف ترین کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔ یہ جعلی قصے کہانیاں زبان درزبان اور کیسٹ درکیسٹ نقل ہورہے ہیں۔ اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ان جعلیات کے بغیر عزاداری نامکمل تصور کی جاتی ہے۔

وہ طاقتیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ ہدف قیام امام حسینؑ سے انکے مفادات کو دھچکا لگ سکتا ہے، انکی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ لوگ اس واقعہ سے درسِ عبرت لینے نہ پائیں۔ اپنے گھناؤنے عزائم کی تکمیل کی خاطر ان لوگوں نے اس واقعہ کی تفسیر میں کبھی مسئلہ جبر درافعال کو اور کبھی مسئلہ فدائے مسیحؑ کو پیش کیا اور کبھی اس قیام کو ہوس اقتدار کا پیش خیمہ ثابت کر کے اسے مسخ کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں اور عیارانہ چالوں سے ان خرافات کو کچھ ایسا رنگ دیا کہ بیچارے بھولے بھالے عوام انکے دام میں کچھ ایسے پھنس گئے کہ انہی باتوں کو اصل عزاداری سمجھ بیٹھے۔

جس طرح امام حسینؑ نے تمام تر غربت وتنہائی کے باوجود اپنے زمانے میں دین میں تحریفات کے خلاف قیام فرمایا، آج عزاداریٔ امام حسینؑ پر ہونے والی ناانصافیوں اور اس میں شامل کی گئی خرافات کے خلاف بھی کسی قیام کرنے والے کی ضرورت ہے۔ آج پھر حُرّ ابن یزید ریاحی اور زہیر ابن قین جیسے سورماؤں کی ضرورت ہے۔ اگر آج پھر اس تحریک میں کسی طفل معصوم کا ہی خون شامل ہوجائے تو شاید عزاداریٔ امام حسینؑ کو جز وقتی راہِ راست مل جائے۔

۲۔ باطل تفسیروں کے خلاف قیام

مجالس عزاء کا بنیادی مقصد امام حسینؑ کے قیام و نہضت کے متن و سند پر گفتگو کرنا' ان کی تفسیر و تشریح کرنا اور اس قیام پر وارد شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا ہے لیکن عرصہ دراز سے ہو یہ رہا ہے کہ ان مجالس میں غیر مربوط موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے ۔ یہ طرزِ عمل بجائے خود عزاداری میں تحریف کی ایک روشن اور واضح مثال ہے ۔ جعلیات تو کجا، ہم تو کہتے ہیں عزاداری میں واقعہ کربلا اور قیام حسینؑ سے منسلک موضوعات کے علاوہ کسی اور بات کو شامل ہی نہیں کرنا چاہئے' اگر چہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں لوگ اتنی سی بات برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ ان کی مسجد کے پیش نماز کو ہٹا کر کسی دوسرے کو امام جماعت متعین کر دیا جائے ۔ لوگوں کی سماعت اس بات پر آمادہ نہیں ہوتی کہ مستقل طور پر خطاب کرنے والے کسی ذاکر کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو سنا جائے ۔ اداروں اور دفتروں میں کوئی افسر یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس کے عہدے پر کسی اور کو ترقی دیدی جائے ۔ لیکن افسوس! ہم تمام تر ناروا سلوک امام حسینؑ کے ساتھ اور انکی عزاداری کے ساتھ ہوتا دیکھتے ہیں' لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے ۔

امام حسینؑ کے نام پر برپا ہونے والی مجالس میں دنیا بھر کے موضوعات' حتیٰ بین الاقوامی سیاست اور سائنسی تحقیقات وغیرہ پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ لیکن خود اصل موضوع یعنی قیام امام حسینؑ پر شاذونادر کوئی بات ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے بعض مجالس میں مغرب کی مدح سرائی کی جانے لگی ہے۔ مختلف زاویوں سے مغرب کی تعریف ہوتی ہے تا کہ سامعین کے دلوں میں مغربی طرز فکر کے لئے جگہ بنے' ان کیلئے نرم گوشہ پیدا ہو۔ لوگ اسلامی آداب وثقافت کو فرسودہ قرار دیں اور مغربی ثقافت کو اقدار سمجھنے لگیں۔ یہ سب درحقیقت قیام امام حسینؑ کو کنارے پر لگانے کی ایک منظم سازش ہے۔ ہماری عزاداری خاموشی کے ساتھ اس سازش کا شکار ہوتی جارہی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہے ۔ عزاداروں کو چاہیے کہ اس طرز فکر وعمل کے خلاف آواز بلند کریں ۔ ان مجالس کے برپا کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عزاداری اور

۱؎ [قیام مقدس امام حسینؑ کی ان تفاسیر کیلئے دیکھئے ہماری کتاب۔ ”تفسیر عاشورا“]

قیام امام حسینؑ سے متعلق جو شکوک وشبہات درپیش ہیں' ان کو دور کیا جائے ۔ مجالس امام حسینؑ میں اہداف حسینی کا تجزیہ و تحلیل ہونا چاہیے ۔ عزاداری امام حسینؑ کو قیام امام حسین۔ سے مربوط رہنا چاہیے ۔

۳۔ سب وشتم روائی کے خلاف قیام

دورِ قدیم سے لیکر دورِ حاضر تک کی باطل اور جابر قوتیں طاقت وقدرت اور سب وشتم' دونوں کو حق اور اہل حق کو دبانے کے لئے موثر اسلحہ کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں ۔ اس کے برعکس اہل حق نے ہمیشہ منطق' افہام و تفہیم اور گفت وشنید کو اپنا وطیرہ رکھا ہے' انہی چیزوں کو اپنے لئے فخر وامتیاز سمجھا ہے اور حتی الامکان طاقت و قدرت کے استعمال اور سب وشتم کرنے سے منع فرماتا ہے ۔ سورۂ انعام آیت نمبر ۱۰۸:

﴿ولا تسبوا الذین یدعو ن من دون الله فیسبو الله عدواً......﴾ ”اور خبردار تم لوگ انہیں برا بھلا نہ کہو جن کو یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں......“

حدیث شریف میں ”**لا تحسب الدھر**“ کہہ کر زمانے کو سب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے ۔

مولا امیر المومنینؑ نے جب دیکھا کہ آپ کا لشکر' مخالف لشکر کو سب کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا:

[انی اکرہ لکم ان تکونوا سبابین] ”مجھے یہ دیکھ کر کراہت محسوس ہوتی ہے کہ تم سبابین میں سے ہو“۱؎

مکتب تشیع کے عقیدے کے تحت حضرت علیؑ اور آپ کے فرزندان معصومینؑ یکے بعد دیگرے خلیفۂ رسولؐ ہیں اور یہ منصوص من اللہ ہے ۔ ایکے باوجود جب مولا علیؑ کو خلافت سے محروم کیا گیا تو آپؑ نے اپنے حق کا مطالبہ تو کیا لیکن حق نہ ملنے پر مخالفین پر سب وشتم نہیں کیا ۔ اسی طرح حضرات حسنینؑ بالخصوص اباعبداللہ الحسینؑ نے اپنے قیام کے دوران کسی موقع پر بھی خلفاء کو سب وشتم نہیں کیا ۔ ایکے برعکس تلخ ترین اور ناگوارترین حالات میں بھی وحدت امت کا خیال رکھا اور تفرقہ وانتشار سے گریز کرتے ہوئے وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا ۔ چنانچہ اہل بصرہ کے نام خط لکھتے وقت واضح طور پر اس مؤقف کو بیان فرمایا۔

اگر تاریخ میں سب وشتم کے سلسلہ کو تلاش کیا جائے تو نمایاں طور پر اسکی سند معاویہ بن ابی سفیان پر منتہی ہوتی

۱؎ [نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۶ ترجمہ مفتی جعفر حسین]

ہے یعنی تاریخ اسلام میں سبّ وشتم کی ابتداء کرنے والا معاویہ ہے۔ اس سے پہلے کوئی خلیفہ مسلمین اس کریہہ فعل میں ملوث نظر نہیں آتا۔

لیکن افسوس کہ آج منبر علوی وحسینی پر براجمان ہونے والے بعض خطباء وذاکرین حسینؑ اور علیؑ کی سیرت کو نظر انداز کرکے معاویہ بن ابوسفیان کی سنت وسیرت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ عاقبت نااندیش افراد تاریخ کے اس نازک موڑ پر دین ومذہب اور ملت ووطن اسلامی کو اپنی ان نازیبا حرکات کے ذریعہ ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ہم صاحبان عقل سے ملتمس ہیں ذرا غور کریں کہ اس خالص غیر اسلامی بالخصوص سیرت آئمہ سے متصادم حرکت سے نقصان کسے پہنچ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس خطرے کی زد میں سب سے پہلے خود عزاداران امام مظلومؑ آرہے ہیں؟ اگر ان حرکتوں سے نہ روکا گیا تو خطرہ ہے کہ کہیں عزاداری ہی اس باد سموم کی تند وتیز لہروں کی نذر نہ ہو جائے لہٰذا ہر صاحب عقل وخرد اور محبّ اہل بیت پر عزاداری میں قیامِ کربلائی ناگزیر ہو چکی ہے۔

۴۔ فرقہ واریت کے خلاف قیام

فرقہ واریت کا مطلب ہے ایک متحد اجتماع کو ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم کر دینا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ظالم وجابر اور استعماری طاقتوں نے ہمیشہ اسے بطور حربہ اپنایا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرعون کے اس عملی شیوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿وجعل اهلها شيعاً﴾ دورِ جدید کی استعماری طاقتوں نے اسے Divide and rule کا نام دیا ہے یعنی گروہوں میں تقسیم کرو اور حکومت کرو یا لڑاؤ اور حکومت کرو، کیونکہ فرقہ واریت کا لازمی نتیجہ آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔

بنی امیہ کے خلفاء ملت مسلمہ کو عرب وعجم، موالی وغیر موالی، قریشی وغیر قریشی وغیرہ کے ناموں سے گروہ در گروہ تقسیم کرکے تقریباً سو سال تک ان پر مسلط رہے۔ قیام مقدس امام حسینؑ اس حوالے سے فرقہ واریت کے خلاف قیام تھا۔ امام حسینؑ کی کوشش تھی کہ امت اسلامی کو کسی نہ کسی نکتہ پر متحد کر دیا جائے۔ آپؑ ہر طرح کے گروہی ولسانی تصورات کو لوگوں کے اذہان سے محو کر دینا چاہتے تھے چنانچہ مدینہ سے نکلتے وقت اپنے

وصیت نامہ میں فرماتے ہیں "میں اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں لیکن جب امام حسینؑ نے امت کو نادانی میں غرق پایا، کلمۂ سلام پر ان کو یکجا نہ کر پائے تو آپ نے امت کو عرب اقدار اور قومی غیرت وحمیت کے پلیٹ فارم سے دعوت دی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روز عاشورا آپ نے دشمنوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ "اگر تمھارے لئے خدا نہیں، قیامت نہیں تو کم از کم اپنے عربی ہونے کا ہی پاس وخیال رکھو"۔

پس نام حسینؑ شعارِ وحدت ہے اور پرچم حسینؑ پرچم وحدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء سے لیکر آج تک ہر مذہب وملت کے لوگ بلاامتیاز رنگ ونسل اس پرچم کے تلے جمع ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ عزاداریٔ امام مظلوم میں بھی ہمیشہ وحدت کی دعوت اور فرقہ واریت کے خلاف آواز بلند ہونی چاہئے۔ اُن سازشوں کو بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے جو پس پردہ اس مذموم عمل کو فروغ دینے کیلئے ہو رہی ہیں۔

پاکستان دوقومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ جس نے بھی اس تصور کو پیش کیا، وہ لائق تحسین ہے۔ اگر اس نے یہ کام آخرت کیلئے کیا ہے تو خدا اسے اجر عظیم دے گا۔ اگر دنیا کیلئے کیا ہے، تب بھی اس خطے کے مسلمانوں پر اس کا بڑا احسان ہے۔ ہر طرح کے قدرتی وسائل سے مالامال، وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا یہ وطن اسلامی دنیائے کفر واستعمار کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھ رہا ہے لہٰذا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وحدت امت کو پارہ پارہ کرنے کیلئے فرقہ واریت کے مختلف منصوبے یہاں زیر عمل ہیں۔ لسانی، مسلکی اور گروہی فرقہ واریت کو فروغ دیا جا رہا ہے تاکہ ملک وقوم کو اندرونی انتشار میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس کام میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ہمیں متحد ہو کر ان سازشوں کا مقابلہ کرنا چاہئے کہ اسی میں ہم سب کی بقا ہے۔

عزاداری امام حسینؑ فرقہ واریت کے خلاف جہاد کا بہترین میدان بھی ہے اور فرقہ واریت کے خاتمہ کے لئے موثرترین ہتھیار بھی۔ لہٰذا عزاداران امام حسینؑ کا فرض بنتا ہے کہ اس میدان میں، اسی ہتھیار کے ذریعہ فرقہ واریت کے عفریت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں۔

لیکن افسوس کہ کچھ عرصہ سے ایک سازشی ٹولہ عزاداری کے نام پر میدان میں نصب منبر کو فرقہ واریت کو ہوا دینے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا تعجب خیز عمل ہے جو عام زندگی میں ہمارے طرز عمل سے کوئی

مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر ہمیں اپنے محلے میں کسی سے مذہبی یا قومی اختلاف ہو تو ہم کبھی بھی مخالف کو اپنے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر نہیں للکارتے تا کہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔ لیکن اس روش کے برخلاف' عزاداری کے نام سے دوسروں کی دل آزاری کرنے اور ان کے سکون و اطمینان کو پارہ پارہ کرنے میں کسی تامل و تعقل کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ درآنحالیکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ اسلام پسند کرتا ہے اور نہ اہل بیت ؑ کے پسند فرمانے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس فرقہ واریت سے اسلام و امت کو تو کوئی فائدہ پہنچ نہیں سکتا۔ ہاں اگر کسی کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ دنیائے کفر ہے۔

اگر آج ہم عزاداری کے پلیٹ فارم سے حضرت امام حسین ؑ کی تاسی کرتے ہوئے طلب امن و اصلاح کی خاطر آواز بلند کریں' یا سفید پرچم بلند کر کے یہ اعلان کریں کہ کلمہ اسلام کی سربلندی اور کفر و استبداد کی سازشوں کی نابودی کیلئے ہم سب کچھ برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں' آیئے اور ہمیں بتلایئے کہ ہمارا کونسا عمل آپ کیلئے باعث اذیت ہے؟! اگر آج ہم اپنے قول و فعل سے یقین دلائیں کہ ہر وہ عمل جو اسلام و امت کیلئے نقصان دہ ثابت ہو ہم اس سے دستبردار ہونے کیلئے تیار ہیں تو خودبخود معلوم ہو جائیگا کہ کون اسلام کے خیر خواہ ہیں اور کون استعماری طاقتوں کے ایجنٹ۔ الغرض اسلام کا' اس ملک کا' بلکہ ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ ہماری عزاداری کو فرقہ واریت کے خاتمہ کا ذریعہ بننا چاہئے۔

اصلاح عزاداری کی راہ میں حائل رکاوٹیں

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اگر کوئی عزاداری میں موجود خرافات اور برائیوں کی نشاندہی اور اصلاح کیلئے آواز بلند کرے تو اسے یہ کہہ کر متہم کیا جاتا ہے کہ یہ شخص عزاداری کے خلاف ہے بلکہ اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ مصلحین کو اصلاح کی کوشش سے روک کر اپنی من مانی خواہشات کو عزاداری میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ خرافات کو عزاداری میں شامل کرنا ایک مذموم کوشش ہے' جس کی نشاندہی کرنا اور اسکی اصلاح کی کوشش کرنا ہر فرد ذی ہوش کا فرض منصبی ہے لہٰذا اصلاح احوال کی کوشش کرنے والوں کو اتہامات سے قطعاً خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب عزاداری میں تحریفات کی نشاندہی کی جاتی ہے تو ایک جانب سے یہ شور اٹھتا ہے کہ یہ مصلحین مروجہ مراسم عزاداری کو بدعت سمجھ کر مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جان بوجھ کر تحریف کو بدعت کا نام دیتے ہیں کیونکہ بدعت کا لفظ زیادہ تر وہابیوں کے یہاں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح عزاداری میں اصلاح احوال کی کوشش کرنے والوں کو یہ لوگ وہابی گردانتے کی کوشش کرتے ہیں' حالانکہ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہابی تو ہر نئے عمل کو بدعت قرار دیتے ہیں تا کہ مذہب جمود و رکود میں رہے اور ترقی نہ کر پائے۔ ان کے بالمقابل ایک اور گروہ ہے جو مذہب کو نظریہ ضرورت کے تحت اور لبرلزم کے ساتھ چلتا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ گروہ بھی حد سے تجاوز کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ضد وہابیت کی آڑ میں دین میں ہر قسم کی بدعت کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک ہی چشمے سے پانی پیتے ہیں۔ اگر ایک گروہ مذہب کو بہت ہی محدود کرنا چاہتا ہے تو دوسرا اسے بہت ہی آزاد اور لبرل بنانا چاہتا ہے۔ غرض دونوں میں سے کوئی بھی مذہب کو اسکی اصل شکل میں قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نظر نہیں آتا۔

نام کتاب	نام مصنف
ترجمۂ قرآن	علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ
تفہیم القرآن	علامہ مودودی
معجم المفرس القرآن	محمد فواد عبدالباقی
مفردات قرآن	راغب اصفہانی
قاموس قرآن	سید علی اکبر قرشی
تفسیر المیزان	علامہ طباطبائی
تفسیر المنیر	الاستاذ الدکتور وهبۃ الزیلی
نهج البلاغہ	سید کاظم محمدی
معجم نهج البلاغہ	محمد دشتی
شرح نهج البلاغہ	ابن ابی الحدید
میزان الحکمۃ	محمدی ری شهری
اصول کافی	مرحوم کلینی
الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم	جعفر مرتضی عاملی
ارشاد	شیخ مفیدؒ
سبائک الذهب فی معرفۃ قبائل العرب	ابی الفوز محمد امین بغدادی
قاموس الرجال	علامہ تستری
تهذیب المقال	سید محمد علی موحد الابطحی
تهذیب التهذیب	شهاب الدین احمد بن علی عسقلانی
اعیان الشیعہ	حسین امین

نام کتاب	نام مصنف
کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ	علامہ ابی الحسین علی بن عیسی اربلی
معجم قبائل عرب	عمر رضا کحالہ
معجم الرجال الحدیث	آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئی
تهذیب الاسماء واللغات	ابی زکریا محی الدین
جمهرۃ انساب العرب	ابی محمد علی بن احمد اندلسی
نهایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب	ابی العباس احمد بن علی
سیر اعلام نبلا	امام شمس الدین محمد ذهبی
مروج الذهب	یعقوبی
الطبقات الکبری	محمد بن سعد بن منیع هاشمی
کتاب الثقات	امام حافظ بن حیان
امالی	سید مرتضیٰ
صفۃ الصفوۃ	جمال الدین ابی الفرج ابن جوزی
تاریخ طبری	یعقوبی
تاریخ اسلام	شمس الدین محمد ابن احمد
انساب الاشراف	احمد بن یحییٰ بلاذری
اخبار الدول وآثار الاول فی التاریخ	ذاکر احمد حطیط ، ذاکر فهمی سعد
الندوہ	سید محمد حسین فضل اللہ
المنتا	علی محمد علی دخیل
ائمہ اثنا عشر	استاد عادل ادیب

نام کتاب	نام مصنف
سلسلہ ینابیع الفقہ	علی اصغر مروارید
نقش زنان درتاریخ عاشورا	دکتر علی قائمی
اعلام النساء	علی محمدعلی دخیل
تراجم سیدات بیت النبوۃ	دکتر عائشہ عبدالرحمٰن
نساء اہل البیتؑ فی ضوء القرآن والحدیث	احمدخلیل جمعہ
نساء من التاریخ	احمدخلیل جمعہ
ریاحین الشریعہ	ذبیح اللہ محلاتی
زنان نمونہ	علی شیرازی
زنان دانشمند و راوی حدیث	احمدصادقی اردستانی
زنان قہرمان (تین جلدیں)	دکتر احمدبہشتی
بانوان نمونہ	سیدمہدی شمس الدین
نساء اہل بیتؑ	احمد
حقوق زن دراسلام	شہیدمرتضیٰ مطہریؒ
حقوق زن دراسلام وجہان	یحییٰ نوری
المرأۃ فی ظل الاسلام	سیدہ مریم نورالدین فضل اللہ
مشاکل الجنسیہ	احمدمحمد ابراہیم احسائی
المتعہ ومشروعیتہا فی الاسلام	علماء ومفکرین
المتعہ وآثرہا فی الاصلاح الاجتماعی	توفیق فکیکی
الازواج فقط	ابراہیم عاصی

نام کتاب	نام مصنف
ازدواج دراسلام	درراہِ حق
حقوق المرأۃ وشؤونہا الاجتماعیہ	محمدعلی زہیری نجفی
زن دراسلام	عباس علی محمودی
منتہی الآمال	شیخ عباس قمی
نفس المہموم	شیخ عباس قمی
ریاض القدس	میرزا صدرالدین محمد ابن مولی قزوینی
معالی السبطین	شیخ محمدمہدی حائری مازندرانی
فرسان الہیجاء	شیخ ذبیح اللہ محلاتی
از مدینہ تا مدینہ	سیدمحمدجواد زہنی تہرانی
الامام الحسینؑ	عبداللہ العایلی
نگاہی بر زندگانی امام حسینؑ	محمدمحمدی اشتہاردی
زندگانی امام حسنؑ حسینؑ کیست؟	فضل اللہ کمپانی
بررسی کوتاہی درزندگی رہبر آزادگان حسینؑ	محمود حکیمی
حیاۃ الامام الحسینؑ (۲ جلدیں)	باقر شریف قرشی
زندگانی امام حسینؑ	حاج سیدہاشم رسولی محلاتی
تاریخ زندگانی امام حسینؑ (۲ جلدیں)	عمادزادہ
الامام حسینؑ	ابی القاسم علی بن حسن
انصار الحسینؑ	سیدمحمدمہدی شمس الدین
ابصار العین فی انصار الحسینؑ	محمد بن شیخ طاہر سماوی

نامِ کتاب	نامِ مصنف
مقتل الحسینؑ	سیدبحرالعلوم
وسیلۃ الدارین فی انصار الحسینؑ	سیدابراهیم موسوی زنجانی
المفیدفی ذکری السبط الشهیدحسین بن علیؑ	سیدعبدالحسین ابراهیم عاملی
هیجان انگیزترین پدیدۂ تاریخ حسین بن علیؑ	سیدحسن رضوی شادرخ
اضواء علی ثورۃالامام الحسینؑ	آیت اللہ سیدمحمدصدر
مقتل الحسینؑ	عبدالرزاق موسوی مقرم
یوم الطف	هادی نجفی
الحسینؑ فی فکرالمسیحیه	انطون بارا
دروس فی الثورۃالحسینیه	شیخ محمدعلی قبلان عاملی
عاشورا	شیخ محمدمهدی شمس الدین
صحیفۃالحسینؑ	جوادقیومی اصفهانی
عبرات المطفین فی مقتل الحسینؑ	شیخ محمدباقرمحمودی
فلسفۂ شهادت امام حسینؑ	محمدمواصف
مکتب مهر شهیدان حضرت امام حسینؑ	دکتر علی قائمی
عاشورا	آیت اللہ سیدمحمدکاظم قزوینی
مقتل الحسینؑ	خوارزمی
مقتل الحسین بن علیؑ	الامام الطبرانی
الامام الحسینؑ	سلیمان کتانی
الحکم والاخلاقی فی متعلق ثورۃ الحسینه	محمدشعاع فاخر

نامِ کتاب	نامِ مصنف
سیرۃامام حسینؑ	محسن غفاری
الحسین بن علیؑ	شیخ محمدیزدی
حسینؑ احیاگر آدمؑ	ابوالقاسم حسین جانی
شمشیرو سیاست	صالح الوردانی
حسین بن علیؑ اسوۂ ایمان وشجاعت	سیدمحمدعلی محمدی
امام حسینؑ آفتاب تابان ولایت	محمدمحمدی اشتهاردی
سیدالشهداء	احمدتهرانی
فرهنگ سخنان امام حسینؑ	محمددشتی
مردمافوق انسان	سیدعلی قرشی
انقلاب حسینؑ	علامه یحییٰ نوری
ثمرات الاعواد	خطیب سیدعلی بن حسین هاشمی
بطل فخ	محمدهادی الامینی
معجم قبائل العرب	عمررضاکحاله
صفحات من تاریخ کربلا	سیدعلی احمدسیدعاملی
ادب الطف	جوادشبر
خصائص الزینبیه یاویژہ گیهای حضرت زینب =	آیت اللہ سیدنورالدین جزائری
زینب کبریٰ بنت امیرالمومنینؑ	العلامه ادیب شیخ جعفرربعی نقدی
المرأۃالعظیمه	حسن صفار
بانوی عاشورا	رسول سیف

نام کتاب	نام مصنف
بانوی کربلا حضرت زینب =	دکتر عائشہ الشاطی
انقلاب زینب کبریٰ =	علامہ علی حائری
زینبؑ القدوۃ والرمز	سعید الخویلدی
فی رحاب السیدۃ زینبؑ	محمد بحر العلوم
عقیلۃ بنی ہاشم	محمد مہدی بہداروند
حضرت زینب =	آیت اللہ سید محمد تقی مدرسی
زینت دامن زہراؑ حضرت زینب =	مجید سیاحی
زندگانی حضرت زینب =	دکتر علی قائمی
سیمای زینب کبریٰ اسوۂ صبر و پایداری	علی اکبر بابازادہ
داستانہای از حضرت زینب =	شہید احمد میر خلف زادہ قاسم خلف زادہ
۲۰۰ داستان از فضائل و کرامات و مصائب حضرت زینبؑ	عباس عزیزی
مادر مصیبتہا سوگنامہ حضرت زینبؑ	علی رضا رجالی تہرانی
زینب کبریٰؑ فریادی بر اعصار	دکتر اسماعیل منصوری لاریجانی
پژوہشی پیرامون بارگاہ حضرت زینب =	محمد حسین سابقی
زنی بنام زینب =	محمد کمال السید
بطلۃ کربلا زینبؑ بنت زہرا =	دکتر بنت شاطی
زینبؑ حماسہ ای بر فراز تاریخ	حاج سید جوادی، حاج سید حسن
زندگانی حضرت زینب =	آیت اللہ شہید عبدالحسین دستغیبؒ
زندگانی حضرت زینب =	دکتر مصطفیٰ اولیائی

نام کتاب	نام مصنف
تکرار حماسۂ علیؑ در خطبۂ زینب =	آیت اللہ کریمی جہرمی
زینبؑ قہرمان دختر علیؑ	احمد صادقی اردستانی
زندگانی حضرت زینب =	حسین بوستی آملی
امرا قاسمہا زینب =	کمال السید
عقیلہ الطہر والکرم السیدۃ زینب =	موسی محمد علی
مع بطلہ کربلا	محمد جواد مغنیہ
حضرت زینب کبریٰ =	حسین عمادزادہ
قہرمان صبر یا زندگانی زینب کبریٰ	محمد غلامی
زینبؑ اخت حسین -	محمد حسین ادیب
زیباترین شکست	اکبر اسدی، مہدی رضائی
ام کلثوم بنت امام علی -	علی محمد علی دخیل
ام البنین	محمد رضا عبدالامیر انصاری
ام البنین	سید مہدی سویج خطیب
ام البنین	سلمان ہادی طعمہ
العباسؑ ابن امام علی -	عبدالرزاق مقرم موسوی
العباسؑ نصیر الحسین -	آیت اللہ سید محمد تقی مدرسی
کرامات العباسیہ	شیخ علی میر خلف زادہ
قمر بنی ہاشم	علامہ سید ذیشان حیدر جوادیؒ